داستانِ القاعدہ اور طالبان

۹/۱۱ اور بن لادن سے آگے

سید سلیم شہزاد

Inside-conflict.blogspot.com Facebook.com/insideaq

فہرست

باب سوئم

باب 4

تعارف

سید سلیم شہزاد 3 نومبر 1970 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ کالج دور میں آپ جماعت اسلامی کے طلبہ ونگ میں شامل رہے بعد میں نظریاتی شدت کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے۔ آپ نے کراچی یونیورسٹی سے انٹر نیشنل ریلیشنز میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ آپ ایشیا اور یورپ کے مشہور میڈیا اداروں میں کام کرنے والے ایک بین الاقوامی تحقیقی صحافی تھے۔ آپ "ایشیا ٹائمز آن لائن" (ہانگ کانگ) کے پاکستان میں بیورو چیف تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر لکھا جن میں عالمی سیکیورٹی کے مسائل، پاکستانی افواج، اسلامی تحاریک اور عراق و لبنان کی اسلامی مزاحمتی تحاریک شامل ہیں۔ آپ کا سب سے پسندیدہ موضوع "دہشت گردی" تھا۔ آپ نے طالبان، القاعدہ اور دوسری اسلامی مزحمتی تحاریک پر بھرپور تحقیقی کام سر انجام دیا۔ آپ نے اس کے لیے وسطی ایشیا، ایشیا اور یورپ میں طویل اسفار کیے۔ آپ نے سراج الدین حقانی، قاری ضیاء الرحمٰن اور الیاس کشمیری جیسے اہم رہنماؤں کے علاوہ کئی درمیانے اور نچلے درجے کے القاعدہ اراکین سے ملاقاتیں اور انٹرویوز کیے۔

آپ کی معرکۃ الآرا کتاب "Inside Al-Qaeda and the Taliban: Beyond Bin Laden and 9/11" آپ کی شہادت سے چند ماہ قبل شائع ہوئی۔ مئی 2011 میں ایبٹ آباد آپریشن کے بعد جنگجوؤں نے بدلے میں "مہران ائیر بیس" کو نشانہ بنایا اور چند اہم طیاروں کو تباہ کیا۔ سید سلیم شہزاد نے اس حملے کی تفصیلات اپنے ایک کالم میں ظاہر کیں اور القاعدہ کے ملٹری کمانڈر الیاس کشمیری کے جہادی گروہ "313 بریگیڈ" کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دیا، جن کو "پاکستان نیوی" میں موجود چند پاکستانی آفیسرز کی مدد حاصل تھی۔ ان معلومات کے ظاہر کرنے پر 29 مئی 2011 کو آپ کو "آئی ایس آئی" کی جانب سے اسلام آباد سے اس وقت اغواء کیا گیا جب آپ ایک ٹی وی پروگرام میں شرکت کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ دو دن بعد 31 مئی کو آپ کی تشدد زدہ لاش ضلع منڈی بہاؤالدین کی ایک نہر سے ملی۔

سلیم شہزاد شہید کو اپنی شہادت سے پہلے 'آئی ایس آئی' کی جانب سے تین دھمکیاں مل چکی تھیں اس کا ذکر انہوں نے اپنے بہنوئی اور متعدد صحافی دوستوں سے کیا، اسی طرح کئی دفعہ آپ کو "آئی ایس آئی" کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے پہلے اکتوبر 2010 میں سابق طالبان رہنما ملا محمد عمر کے نائب "ملا غنی برادر" کی پاکستانی سیکیورٹی ایجنسیوں کی جانب سے گرفتاری کے بعد اس سے متعلق ایک کالم لکھنے پر بھی آپ کو "آئی ایس آئی" ہیڈ کوٹر میں طلب کیا گیا، جس کے بعد آپ نے "ہیومن رائٹس واچ" کو ایک خط لکھا جس میں "آئی ایس آئی" کے ہاتھوں اپنے ممکنہ اغواء کا خدشہ ظاہر کیا۔ "ہیومن رائٹس واچ" کے دایان علی حسن نے کہا کہ "سلیم شہزاد کو یقین تھا کہ جلد ہی ان کے ساتھ کچھ نا کچھ ضرور ہونے والا ہے"۔ صحافیوں کی جانب سے شدید احتجاج کے بعد سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اس معاملے کی تحقیق کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔

میرا بھی پسندیدہ ترین موضوع "دہشت گردی" ہی رہا ہے۔ میں نے پہلی دفعہ یہ کتاب "Inside Al-Qaeda and the Taliban: Beyond Bin Laden and 9/11" 2012 میں پڑھی، میں کتاب پڑھتا گیا اور سید سلیم شہزاد شہید کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ اس کتاب میں القاعدہ اور طالبان تحاریک کے اہم ترین سالوں یعنی امریکی حملے (2001) سے لے کر 2010 تک کی سرگرمیوں پر نہایت گہرہ اور محققانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ روایتی صحافیوں کی طرح کسی عصبیت کا شکار ہو کر حقائق سے نظریں چرانے کی بجائے ان کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے اور حقائق کو مسخ کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے۔ یہ کتاب درحقیقت انگلش میں ہے، میں نے اس کا اردو ترجمہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر نہ مل سکا اس کے بعد میں نے اپنے پیج (انسائیڈ کنفلکٹ) پر اس کتاب کے ابواب کا سلسلہ وار ترجمہ کر کے پوسٹ کرنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد جبکہ ترجمے کا سلسلہ جاری تھا ایک بھائی نے پیج پر رابطہ کر کے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے اس کتاب کے مکمل ترجمے کا ابتدائی مسودہ بھیج دیا۔ اس بھائی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کتاب کا ترجمہ پبلش ہو چکا ہے اور اب اس اردو کتاب پر پابندی لگ گئی ہے۔ میں نے اس کتاب کے ترجمے کو چیک کیا اور جن مقامات پر مناسب سمجھا اپنے ترجمے سے ردوبدل کر دیا۔ قارئین کی آسانی کے لیے کئی جگہوں پر حاشیہ میں اضافہ کر دیا ہے کوشش کی ہے بنیادی ترجمے میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ ہو اس لیے قارئین کی آسانی کے لیے جس چیز کا اضافہ کرنا ضروری سمجھا اسے مترجم کے حوالے کے ساتھ حاشیہ میں درج کر دیا۔

یہ کتاب درحقیقت القاعدہ، طالبان اور افغانستان و پاکستان میں موجود دوسری جہادی تحاریک کے آپسی تعلقات امریکہ اور اس کے اتحادیوں بشمول پاک افواج سے ان تحاریک کی کشمکش پر ایک لاجواب تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف مرحوم نے القاعدہ کی حکمت عملی کو محور بنایا ہے اور ان کی حکمت عملی کے مختلف مراحل کے بارے میں مفصل آگاہی دی، کہ کس طرح القاعدہ نے اسلامی مقبوضات بشمول فلسطین کی آزادی کے لیے قرب قیامت سے متعلق احادیث نبویہ ﷺ کی پیشین گوئیوں کو بنیاد بنا کر اپنی عالمی تحریک شروع کی اور پھر کس طرح یہ تحریک افغانستان میں طالبان کی مدد سے اپنے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی ایک عالمی جہادی و مزاحمتی تحریک کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح القاعدہ نے اپنی عالمی حکمت عملی کے لیے پہلے افغانستان اور پھر پاکستانی قبائلی علاقے بالخصوص شمالی وزیرستان کو اپنا مرکز بنایا اور اپنی دوست جہادی تنظیموں سے مل کر علاقائی و عالمی اہداف حاصل کیے۔ کس طرح امریکہ کی معاشی و عسکری قوت کو ختم کرنے کے لیے نائن الیون حملوں کے ذریعے افغانستان کو امریکہ اور نیٹو اتحادیوں کے لیے دلدل بنا دیا گیا۔ افغانستان میں ہونے والی طالبان کی کاروائیوں میں القاعدہ نے کس حد تک حصہ لیا اور پوری مزاحمتی تحریک میں القائدہ کا کیا کردار رہا ہے۔ سلیم شہزاد مرحوم نے یہ بھی واضح کیا کہ پاکستان کی جانب سے کیے جانے والے مسلسل آپریشنز سے دفاع کے لیے القاعدہ اور طالبان نے کس طرح مقامی جہادیوں کو "تحریک طالبان پاکستان" کی صورت میں متحد کیا تا کہ یہ خود آسانی سے افغانستان میں امریکہ و نیٹو سے گوریلا جنگ لڑ سکیں۔

اسی طرح یہاں یہ بھی وضاحت ملتی ہے کہ القاعدہ اور طالبان کی جانب سے بنائے جانے والے جہادی گروہوں "حرکت اسلامی ازبکستان"، عراقی القاعدہ اور پاکستانی طالبان[1] کے مختلف مجموعوں میں پنپتی شدت سے خود القاعدہ اور طالبان بھی بے زار تھے، آپ نے جس نظریاتی شدت کو اس کتاب میں واضح کیا اسے ہم آج شدت پسند جماعت داعش کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ کس طرح پاکستانی افواج کے آفیسرز القاعدہ میں شامل ہوئے اور ان آفیسرز کی مدد سے القاعدہ کے ملٹری کمانڈر الیاس کشمیری نے "آئی ایس آئی" اور لشکر طیبہ کی قیادت کی جانب سے بھارت میں معمول کی کاروائی کے منصوبے کو ہائی جیک کیا اور اسے ممبئی حملوں میں بدل دیا۔ مصنف کی جانب سے القاعدہ اور الیاس کشمیری کے غزوہ ہند منصوبے کی بھرپور وضاحت کی گئی ہے۔ جہاں القاعدہ اور طالبان کی حکمت عملی پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے وہیں ان مزاحمتی تحاریک کی جہادی فکر اور نظریاتی بنیادوں پر بھی سیر حاصل معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ الغرض کوئی بھی آدمی جو القاعدہ اور طالبان کی کہانی میں اتار وچڑھاؤ سے بھرپور اس اہم ترین دہائی (2000 سے 2010 تک) سے متعلق حقائق جاننا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کتاب کا کھلے دل سے مطالعہ کرے۔ آخری میں ایک وضاحت لال مسجد اور مولانا عبدالعزیز کے حوالے سے کہ مصنف مرحوم نے اس کتاب میں لال مسجد تحریک کے ایک اور پہلو سے بھی روشناس کرایا ہے، مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ لال مسجد تحریک القاعدہ ہی کی ایماء پر شروع کی گئی بلکہ لال مسجد تحریک کے اپنے مقاصد اور وجوہات ہیں لیکن جہاں باقی چیزیں اثر انداز ہوئیں وہیں مولانا عبدالعزیز کے والد اور بھائی کے اسامہ بن لادن سے ملاقات[2] اور پاکستانی افواج کے قبائلی علاقہ جات میں پے درپے آپریشنز کا بھی کچھ نا کچھ اثر بہر حال ہے۔ مصنف نے "دہشت گردی" سے متعلق جو تحقیقی اور تحریری کام کیا اس کے لیے انہیں اپنی جان کی قربانی بھی دینی پڑی۔ اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان میں اس موضوع پر کوئی بھی صحافی ان سے بڑھ کر کام نہیں کر سکا تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود ہر انسان خطا کا پتلا ہے، اس کتاب میں بھی خطاء کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔ آخر میں ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ مصنف کی تمام لغزشوں کو معاف فرما کر انہیں جنت میں داخل فرمائیں۔ آمین

ارسلان احمد

1۔ تحریک طالبان پاکستان اپنے نظریاتی اور حکمت عملی کے اختلافات کی بنا پر 4 مختلف تنظیموں میں تبدیل ہو چکی ہے، جماعت الاحرار، "ولایہ خراسان" (داعش کی افغان وپاکستان میں بنائی گئی شاخ) کا جھکاؤ شدت پسند تنظیم "داعش" کی طرف جبکہ تحریک طالبان مرکزی اور حلقہ محسود کا جھکاؤ افغان طالبان کی طرف ہے۔

2۔ غازی عبدالرشید نے اپنے والد مولانا عبداللہ سمیت اسامہ بن لادن سے 1998 کی ایک ملاقات کا تذکرہ کیا تھا، یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کے علماء کی اکثریت اسامہ بن لادن اور ملا عمر سے بہت اچھے تعلقات رکھتی تھی اور انہی تعلقات کی وجہ سے کئی علماء کو ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے قتل کیا گیا جن میں سے غازی عبدالرشید کے والد مولانا عبداللہ اور مفتی نظام الدین شامزئی سمیت کئی دوسرے علماء شامل ہیں۔ القاعدہ کی پاکستانی سیکورٹی اداروں سے لڑائی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

پیشِ لفظ

میں نے کبھی بھی بہترین وسائل کے حامل بین الا قوامی خبر رساں ادارے میں کام نہیں کیا۔ نہ ہی میں نے بڑے دھارے کے کسی ملکی میڈیا میں کام کیا ہے۔ میرے تعلقات زیادہ تر دوسری قسم کے میڈیا کے ساتھ رہے؛ اس وجہ سے میرا حلقۂ احباب اور دائرہ کار محدود رہا۔ وہ صحافی جو اکثر و بیشتر سیاسی منظر نامے پر چھائے رہتے ہیں، اپنی تشہیری مہمات، انٹرویوز اور انکشافات کے لیے مرکزی دھارے اطلاعاتی چینلز اور بہترین مالیاتی وسائل کے حامل نیوز اداروں کو اپنا ہدف بناتے ہیں۔ متبادل میڈیا کے صحافیوں کو توجہ حاصل کرنے کے لیے ان مشہور صحافیوں کی نسبت دگنی محنت کرنا پڑتی ہے۔ تاہم متبادل میڈیا میں آزادانہ رپورٹنگ میرے مزاج سے موافق ہے کیونکہ اس سے مجھے روایتی فکر سے ہٹ کر سچائی کو کھوجنے کا موقع ملتا ہے۔ نتیجتاً میں افراد اور حالات کا مطالعہ نسبتاً غیر مصالحانہ حیثیت سے علیحدگی اور تخلیے میں کیا کرتا ہوں۔

مثال کے طور پر میں نے القاعدہ میں معروف شخصیات پر تکراری غور و فکر سے گریز کیا اور اس کے بر عکس انتہائی نچلے درجے پر موجود لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یہ لوگ اپنا دنیوی فہم، اپنی زندگیوں کی داستان اور اپنے اپنے حصے کی خاموش حمایت کے متعلق بتانے کے منتظر ہیں۔ در حقیقت ایسے لوگ ہی تحریکوں کی تقدیر لکھا کرتے ہیں۔ میں جن کم معروف شخصیات سے ملا اور ان کے انٹرویو کیے ان میں کمانڈر محمد الیاس کشمیری، سراج

الدین حقانی اور قاری ضیاء الرحمان شامل ہیں۔ بعد ازاں یہ سب افراد جہادی تحریک کے حقیقی رہنما بن کر ابھرے۔

آج کی دنیا بنیادی طور پر اسامہ بن لادن کو القاعدۃ کے اعلیٰ نمونے کے طور پر پیش کرتی ہے کہ انہوں نے مغربی سامراجیت کے خلاف مزاحمتی تحریک کا آغاز کیا، لیکن القاعدۃ میں بن لادن کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ القاعدۃ کی داستان میں اتنے ہی کردار، شخصیات اور پیچ و خم ہیں جتنے کہ شہرزاد اور شہریار کی داستان الف لیلۃ میں ہیں۔ الف لیلۃ کی ان حکایات میں ہزاروں ایسے غیر معروف کردار ہیں جنہوں نے انسانیت کے جوہر محبت اور وفاداری سے اپنے اپنے وقت کی دنیا بدل کر رکھ دی۔

الف لیلۃ مشرقِ وسطیٰ اور جنوب ایشائی کہانیوں اور لوک داستانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اسلامی ادب کے سنہری دور میں عربی زبان میں جمع کیا گیا۔ اس کے درست زمانے اور مصنف کے متعلق معلومات بہت کم ہیں۔ تاہم داستانوں کے اس مجموعے کی تشکیلی تکنیک کینہ جو بادشاہ شہریار کے گرد گھومتی ہے۔ بادشاہ کی فاسق بیوی نے اس سے بے وفائی کی جس کے بعد بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ عورت ذات سے انتقام لینے کے لیے وہ ہر روز ایک نئی بیوی سے شادی کر کے اسے قتل کر دیا کرے گا۔ باتدبیر شہرزاد نے، جسے ہندوستانی النسل خیال کیا جاتا ہے، اس قبیح رسم کا خاتمہ کیا۔ اس نے شہریار بادشاہ کو ایک ہزار ایک رات کے دورانیے پر مشتمل کہانیوں سے مسحور کیے رکھا۔ ان کہانیوں کا مقصد اپنے قتل سے بچاؤ بھی تھا اور عورت ذات کے خصائص پر بادشاہ کا اعتماد بحال کرنا بھی۔ شہرزاد کی داستان میں ہندوستانی، ایرانی، عراقی، مصری، ترکی اور غالباً یونانی کہانیاں شامل تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ افسانوی مجموعہ ایک مربوط اور جامع کام ہے جو اصلاً زبانی پھیلا تھا اور کئی صدیوں میں مکمل ہوا۔ اس مجموعے کی

ایک طویل اور پیچیدہ تاریخ ہے جس میں پیچیدہ بیانیے کی ساخت جھلکتی ہے اور پڑھنے والے کو مشہور داستانوں کے ایک ایسے بھنور میں کھینچ لیتی ہے کہ جائے فرار نہیں ملتی۔

میں نے القاعدۃ کی الف لیلۃ کے بعد روایتی کرداروں کے تانے بانے بن کر اسی الف لیلوی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہانیاں ہیں ان کرداروں کی جنھوں نے پسِ پردہ کام کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ایسا ماحول پیدا کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا کہ وہ تنظیم جس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ ۲۰۰۱ میں امریکی بمباری سے تورابورا پہاڑوں کے ملبے تلے دفن ہو چکی ہے، شمالی افریقہ سے وسط ایشیا تک اپنے بازو پھیلانے کے قابل ہوئی اور مغربی اجارہ داری کے خلاف ایک حقیقی مزاحمتی تحریک بن کر ابھری۔

میں نے القاعدۃ کی شخصیات سے ملاقات کی خاطر عراق، افغانستان، شمالی وزیرستان اور افغانستان کے دورے کیے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ میری اصل تخلیقی تحریک کا باعث ایک غیر معروف شخص ریٹائرڈ کیپٹن خرم عاشق (جو صوبہ ہلمند میں امریکی دستوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید☆ ہوئے) بنے جو کبھی پاکستان کے سپیشل سروسز گروپ کے کمانڈو رہ چکے تھے۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ پاکستان آرمی سے مستعفی ہو کر افغانستان میں طالبان لشکر کے ساتھ مل چکے تھے۔ خرم عاشق نے القاعدۃ پر بہت گہرا اور دیرپا نقش چھوڑا۔

ان کی شہادت پر ان کے دوست ریٹائرڈ میجر عبدالرحمان اور خرم کے بھائی ریٹائرڈ میجر ہارون مجھ سے ملے اور القاعدۃ کی حکمتِ عملی کے بارے میں میرے خیالات اور ادراک کو وسیع کیا۔ یہ دونوں بعد میں ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ کے بمبئی حملوں کے مرکزی ماہر حرب بنے اور مغربی اتحاد کے خلاف القاعدۃ کی جنگ کا رخ بدل کے رکھ دیا۔ ان سے ملاقات کے بعد میں

☆مصنف نے یہاں شہید ہی لکھا ہے، مصنف نے یہ اصطلاحات جہاں استعمال کیں انہیں ترجمہ بھی اسی طرح رہنے دیا ہے۔ مترجم

نے القاعدۃ کی دنیا کو بالکل ایک نئے تناظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس تناظر میں جس میں نائن الیون کے دن خالصتاً پختہ یقین کی قوت اور انسانی خوش تدبیری سے ابھرنے والی بے انتہا طاقت نے جدید ٹیکنالوجی کی پر تدلیس طاقت سے مدمقابل ہو کر دنیا کی واحد سپر پاور امریکہ کو غضبناک کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ امریکہ سے لڑنے کے لیے اسے ایک ایسے علاقے میں گھسیٹ لایا جائے جہاں لوگ پتھر کے دور میں جیتے ہیں۔ وہ علاقہ جہاں جدید ٹیکنالوجی کوئی معنی نہیں رکھتی اور جہاں بقا کے لیے جس واحد شے کی ضرورت ہے وہ صرف مومنانہ بصیرت ہے۔ پھر یہ کوئی اچنبھے والی بات نہ تھی کہ القاعدۃ نے ابتدائی جنگ میں سیکڑوں جاں نثار کھو دیے اور باقی بچنے والے امریکی فتح کا جشن دیکھنے کے لیے تیزی سے غاروں کی طرف پسپائی اختیار کر گئے۔

جب ابنائے وطن (طالبان) بدیسی حملہ آوروں کے خلاف جنگ لڑنے لگے تو القاعدۃ نے اپنا گہرا مشاہدہ جاری رکھا لیکن لڑائی سے گریز کیا۔ مگر القاعدۃ تمام وقت کسی اور ہی کام میں منہمک رہی جس کی وجہ سے یہ ابنائے وطن ''حقیقی بھائی'' بن گئے اور براہِ راست القاعدۃ کی زیرِ کمان آ گئے۔ القاعدۃ کا پہلا مقصد افغانستان میں مغرب کے خلاف جنگ جیتنا تھا۔ اس کا اگلا ہدف یہ تھا لڑائی کو طول دے کر اسے وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک پھیلا دیا جائے تاکہ سپر پاور کے وسائل ختم ہو جائیں۔ اس کے بعد اسے آخری جنگ کے لیے مشرقِ وسطیٰ کے میدانوں میں لایا جائے تاکہ مسلم سیاست کا خلافت کے طور پر احیا ہو اور مابعد تمام مسلم خطوں کی آزادی میں رہنمائی ملے۔

یہ کتاب اس اہم موقع پر لکھی گئی ہے جب کہ مغربی اتحاد کی پسپائی بالکل عیاں ہے۔ مبصرین نے نیوکلیائی ہتھیاروں سے مسلح القاعدۃ، جسے 'دنیا کے لیے خطرہ مسلم ممالک' کی پشت پناہی حاصل ہے، کی خوفناک تصویر کشی کی ہے۔ لیکن کئی برس کی لڑائی کے

بعد جو چیز بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ القاعدۃ کا اسلحہ خانہ اس کے ہتھیار نہیں بلکہ جدید ٹیکنالوجی سے لیس دشمنوں کو گرانے کے لیے رونما ہوتے ہوئے واقعات سے دانشمندانہ فائدہ اٹھانے کی سادہ سی مہارت ہے۔

مغربی اتحاد اب افغانستان کے میدان جنگ سے راہِ فرار ڈھونڈ رہا ہے۔ تاہم اگر کبھی ایسا ہوا تو بھی القاعدۃ کی مغرب کے خلاف جنگ ختم نہیں ہو گی۔ یہ محض کھیل کے ایک دورانیے کے خاتمے کا اشارہ اور دوسرے دورانیے کے آغاز کا نقارہ ہو گا۔ یہی وہ تناظر ہے جسے میں نے پوری کتاب میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

سید سلیم شہزاد

دیباچہ

۲۰۰۱میں نائن الیون کے حملوں کا مقصد جنوبی ایشیا میں جنگ چھیڑنا تھا۔ ۲۶نومبر ۲۰۰۸ میں ممبئی حملے اس بات کا اشارہ تھے کہ القاعدۃ اپنی جنگ وسط ایشیائی جمہوری ریاستوں سے مشرق، انڈیا اور بنگلہ دیش تک پھیلا رہی ہے اور یہ کہ ایسے مزید واقعات رونما ہوں گے۔ القاعدۃ کے نظریاتی تناظر میں یہ سب زمانۂ آخر کی ان لڑائیوں کی تیاری ہے جن کا ذکر احادیثِ مبارکہ میں کیا گیا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں موجودہ ایران، افغانستان اور پاکستان کے کچھ حصوں اور وسط ایشیا یعنی قدیم خراسان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خراسان ہی وہ میدان جنگ ہوگا جہاں مغرب سے فیصلہ کن جنگ سے پہلے زمانۂ آخر کی جنگوں کی پہلی لڑائی لڑی جائے گی جبکہ آخری جنگ مشرقِ وسطیٰ میں ہوگی جس کے نتیجے میں فلسطین اور تمام مقبوضہ مسلم خطے آزاد ہو جائیں گے۔ اس سارے وقت میں القاعدۃ نے دنیا کی طاقتور ترین ریاستوں کو افغانستان کی دلدل میں گھیرے رکھنے پر توجہ مرکوز کیے رکھی۔ مقصد یہ تھا کہ مغرب کے خلاف جنگ کا دائرہ وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک پھیلنے سے پہلے پہلے ان کی تمام توانائیاں یہیں پر ختم ہو جائیں۔

امریکہ پر گیارہ ستمبر کے حملوں کے کچھ سال بعد اکتوبر ۲۰۰۹ کو القاعدۃ کی عسکری کمیٹی کے چیئرمین کمانڈر محمد الیاس کشمیری، جو ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ کے ممبئی حملوں کے ماسٹر مائنڈ تھے، نے زیرِ حراست امریکی ڈیوڈ ہیڈلے (پاکستانی نژاد امریکی شہری داؤد سید) کے انکشافات کے بعد میرے ساتھ انٹرویو میں اپنی آئندہ حربی حکمتِ عملی کا خاکہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا:

> "ہم نے شیطان اکبر (امریکا) اور اس کے حواریوں کو اس دلدل (افغانستان) میں لانے کے لیے ہی اس جنگ کی منصوبہ بندی کی تھی۔ افغانستان دنیا کی بے مثال جگہوں میں سے ایک ہے جہاں ایک شکار کے لیے

ہر قسم کے پھندے موجود ہیں۔ یہ پھندے صحراؤں، دریاؤں، پہاڑوں حتیٰ کہ شہری مراکز میں بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ہے ہماری سوچ۔ ہم شیطان عظیم کی عالمی سازشوں سے تنگ آچکے ہیں اور دنیا کو امن و انصاف کا گہوارہ بنانے کے لیے اس (امریکہ) کی موت ہمارا ہدف ہے[1]۔ شیطان عظیم امریکہ اپنی برتری کے غرور میں ہے اور افغانوں کو ایسے بیچارے بت سمجھتا ہے جنہیں امریکی جنگی سازوسامان سے چہار اطراف سے بلامزاحمت آسانی سے نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔" (ایشیاٹائمز آن لائن، ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۹)

القاعدۃ کی فکر میں ۲۰۰۱ میں مغرب کے خلاف جنگ کے بیج افغانستان پر روسی قبضے کے خلاف ایک دہائی سے جاری جہاد کے دوران میں بوئے گئے تھے۔ وہ عرب جو افغان مزاحمت میں شامل ہونے کے لیے افغانستان میں داخل ہوئے، یمنی اور مصری کیمپوں میں بٹ گئے۔ وہ مذہبی جوشیلے جو دوسرے ملکوں کے ملاؤں سے متاثر ہو کر افغانستان آئے تھے وہ زیادہ تر یمنی کیمپ میں شامل ہوئے۔ جب یہ دونوں آپس میں متحد ہوئے تو مشترکہ مشقیں کرتے اور جب لڑائی نہ ہو رہی ہوتی تو دن بھر عسکری تیاریوں میں مشغول رہتے۔ یہ لوگ اپنا کھانا خود تیار کرتے اور عشاء کی نماز کے فوراً بعد سو جایا کرتے۔ جب افغان جہاد اسّی کی دہائی کے آخر میں پہنچا تو ان جہادیوں کی اکثریت اپنے اپنے وطن واپس چلی گئی۔ کچھ لوگ افغان آبادیوں میں گھل مل گئے یا پاکستان چلے گئے اور شادیاں کرلیں۔ القاعدۃ کے حلقوں میں اس گروہ کو "آرام طلب" یا درویش کہا جاتا تھا۔ مصری کیمپ میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو

1۔ یہ القاعدہ کی مشہور زمانہ حکمت عملی ہے جسے اسامہ بن لادن کے الفاظ میں "سب سے پہلے امریکہ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، القاعدہ اس نتیجے پر پہنچی کہ تمام مسلم مخالف قوتوں اور ظالم مسلم حکومتوں کا سربراہ اور مددگار امریکہ ہے اس لیے جب تک امریکہ کی معاشی اور عسکری قوت ختم نہیں کی جاتی تب تک اسلامی مقبوضات کی آزادی اور اسلامی خلافت کا احیاء ناممکن ہے۔ مترجم

بہت زیادہ سیاسی اور نظریاتی تھے۔ اگرچہ ان لوگوں میں زیادہ تعداد اخوان المسلمون کے ارکان کی تھی لیکن انقلاب کی بجائے انتخابات اور جمہوریت کے ذریعے معاشرتی تبدیلی لانے کی کوششوں پر اصرار کی وجہ سے یہ لوگ اخوان سے ناخوش تھے۔ افغان جہاد نے ان ہم خیال افراد کو جوڑنے میں ایک طاقتور گوند کا کام کیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ تربیت یافتہ ڈاکٹر اور انجینئر تھے۔ ان میں مصری فوج کے سابقین بھی تھے جو ڈاکٹر ایمن الظواہری کی مصری اسلامی جہاد تحریک سے وابستہ تھے۔

کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ کرنے کی وجہ سے اس گروپ نے ۱۹۸۱ میں انور سادات کو قتل کر دیا اور اس مرکزی عقیدے کے تحت متحد ہو گئے کہ عربوں کے عروج وزوال کی وجہ امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ میں اس کی کٹھ پتلی حکومتیں ہیں۔ مصری کیمپ کی کمان الظواہری کے ہاتھ میں تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد یہ لوگ مل بیٹھ کر عرب دنیا کے حالیہ مسائل پر گفتگو کرتے۔ اس گروپ کے رہنماؤں کے پر اثر پیغامات میں سے ایک یہ تھا کہ مسلم ممالک کی افواج کو نظریاتی طور پر متحرک کرنے کی کوششیں کی جائیں۔ ۱۹۹۰ کے وسط میں جب افغان صدر پروفیسر برہان الدین ربانی اور اس کے طاقت ور وزیر دفاع احمد شاہ مسعود نے بن لادن کو سوڈان سے افغانستان منتقل ہونے کی دعوت دی تو مصری کیمپ نے بہت سے لوگ اکٹھے کیے اور آئندہ لڑائی کی حکمت عملی سکھانے کے لیے معسکر چلانے شروع کر دیے۔ جس وقت طالبان افغانستان میں ایک طاقت بن کر ابھرے تو مصری کیمپ اپنی حکمت عملی وضع کر چکا تھا۔ اس کے اہم ترین نکات یہ تھے:

ا۔ بدعنوان اور استبدادی مسلم حکومتوں کے خلاف آواز بلند کی جائے اور انہیں نشانہ بنایا جائے اور عوام میں ان کا تاثر خراب کیا جائے کیونکہ عوام ریاست، حکمران اور قوم کو ایک ہی چیز خیال کرتے ہیں۔

۲۔ دنیا میں امریکی اثرورسوخ پر توجہ مرکوز کی جائے جو اسرائیل اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی جابر حکومتوں کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ سب پر امریکی کردار عیاں کر دیا جائے۔

روس کے خلاف افغان جہاد کے یہی سال تھے جب مصری کیمپ نے پوری دنیا سے آئے ہوئے مسلم نوجوانوں کی سوچ تبدیل کر دی۔

القاعدۃ بذات خود ایک دوسری تنظیم سے نکلی ہے۔ اس تنظیم کا نام "مکتب الخدمت" تھا جسے عبد اللہ عزام نے ۱۹۸۰ کی دہائی میں مشرق وسطیٰ کے ممالک سے افغانستان میں روس کے خلاف جہاد کے لیے آنے والے عرب نوجوانوں کی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے قائم کیا تھا۔ عبد اللہ عزام ۱۹۸۹ میں شہید کر دیے گئے اور ان کی جگہ ان کے شاگرد رشید اسامہ بن لادن نے سنبھال لی۔ اسامہ بن لادن نے اس تنظیم کو القاعدۃ میں بدل دیا۔ تاہم یہ تبدیلی صرف ساختی نوعیت کی تھی۔ اگر القاعدۃ کو ایمن الظواہری میسر نہ آتے یا اس کا تعارف مصری کیمپ کے نظریات اور طریق کار سے نہ ہوا ہوتا تو آج القاعدۃ کا تاثر اور اثر کچھ اور ہوتا۔ درحقیقت الظواہری ہی وہ شخص ہے جس نے القاعدۃ کو وہ کچھ بنا دیا ہے جسے آج دنیا جانتی ہے۔

القاعدۃ نے اسلامی عقیدے کی بنیاد توحید پر زور دیا جس کے مطابق اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔ القاعدۃ کے مطابق عقیدۂ توحید انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اسلامی روایات کی تشکیل کرتا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کا مطلب محض رسمی نہیں ہے۔ القاعدۃ نے اس تناظر پر زور دیا کہ خدا کا تصور حاکمیت کا مترادف ہے اور توحید کا تقاضا ہے کہ واحد حاکمیت صرف اسلام کی ہو[1]۔ کوئی

1۔ اس اسلامی عقیدے کو توحید حاکمیت بھی کہا جاتا ہے، یعنی نظام حکومت اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ مترجم

بھی نظامِ سیاست یا حاکمیت جو ارادۂ خداوندی کے تابع نہیں ہے عملاً شرک کی ایک صورت ہے۔ لا الٰہ میں "لا" کا لفظ انسان کے بنائے ہوئے تمام نظاموں کے خلاف بغاوت کا استعارہ ہے۔ وہ مسلمان جو اس عقیدے پر یقین رکھتے ہیں خود بخود جمہوریت، سوشلزم یا انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر انحصار کرنے والے کسی بھی نظریے کو بنیاد بنانے والے نظامہائے حکومت کو شرک کہہ کر رد کر دیتے ہیں اور دلائل پیش کرتے ہیں کہ ایسے کسی بھی نظام کے خلاف جدوجہد کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔

اس سے کوئی بھی مسلم اکثریتی ریاست جس نے سیکولر طرزِ حکومت اختیار کیا ہو خود بخود مرتد قرار پاتی ہے، عقیدۂ تکفیر[1] یہیں سے نکلتا ہے۔ مسلم اکثریتی ریاستوں اور غیر مسلم ریاستوں کے مابین ایسا عسکری اتحاد جو مسلمانوں کے خلاف استعمال ہو، وہ بھی تکفیر کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ عقیدہ القاعدۃ کے عسکری لائحہ عمل کی بنیاد ہے جو بسا اوقات مارکسی جدلیات کے قریب نظر آتا ہے۔ مارکس نے اپنی جدلیات معاشی طبقاتی کشمکش پر کھڑی کی جبکہ نَو اسلامی جدلیات عمل اور عقیدے کی بنیاد پر معاشرے کی تقسیم کرتی ہے۔ اس تقسیم کے بعد جدوجہد کی دو سطحیں ہیں: مسلم دنیا کے مسلمان اور مشرکین، اسلام اور مغرب۔ تاہم یہ نظری تقسیم ہے جس کا مقصد مسلم اکثریتی آبادیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا مطلب واضح کرنا ہے۔ عملی طور پر القاعدۃ مسلم دنیا اور مغرب کے مشرکین دونوں کے لیے حربی حکمتِ عملی ہی اختیار کرتی ہے۔

القاعدۃ بنیادی طور پر عرب تنظیم ہے لیکن اس نے اپنی جدوجہد کا آغاز کرنے کے لیے مصر یا مشرقِ وسطیٰ کے کسی دوسرے ملک کا انتخاب نہیں کیا۔ اس کی نظرِ انتخاب جنوبی

1۔ مسلم علماء کے مطابق نواقص اسلام (واضح شرکیہ عمل) کے مرتکب ہونے والے کلمہ گو کو کافر قرار دینا عقیدہ تکفیر کہلاتا ہے ۔ مترجم

ایشیا پر ٹھہری جہاں کی روایات، مذہبی عقاید اور رواج القاعدۃ کے عربی النسل کارکنان کے عقاید سے بالکل متضاد ہیں۔ اس انتخاب کی اصل وجہ، جو شاید کسی کو بہت عجیب لگے، عقیدہ ہی ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ خراسان آخر وقت کی جنگوں کا اولین میدانِ جنگ ہو گا لہٰذا القاعدۃ اس پیش گوئی کو پورا کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہاں یہ بات پھر دہرائی جاتی ہے کہ جغرافیائی طور پر خراسان کے میدانِ جنگ میں جدید ایران کے کچھ خطے، وسط ایشیائی ریاستیں، افغانستان اور پاکستان کے خطے شامل ہیں۔ اس ابتدائی جنگ کو حدیثِ مبارکہ کے الفاظ میں غزوۂ ہند یا ہندوستان کی جنگ بھی کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے القاعدۃ نے اپنا میدانِ جنگ وسط ایشیا اور بنگلہ دیش کے درمیان چنا۔ (بنگلہ دیش میدانِ جنگ تو نہیں ہے لیکن بھارت کے خلاف جنگ میں نقل و حمل اور رسد کی ضروریات کی وجہ سے اس دائرے میں آجاتا ہے)۔ یہ بات اسلامی عقیدے کا حصہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کی پیش گوئیاں ضرور پوری ہو کر رہیں گی اور خراسان اور ہندوستان کی جنگ جیتنے کے بعد اسلامی فوجیں مشرقِ وسطیٰ کی طرف پیش قدمی کریں گی، جہاں وہ مہدی موعودؑ کے ساتھ مل کر دجال اور اس کے مغربی حلیفوں کے خلاف جنگ لڑیں گی اور فلسطین کو آزاد کرائیں گی۔

القاعدہ اپنے 'خراسان' میں ۱۹۹۰ کی دہائی میں افغانستان میں طالبان کے دورِ حکومت میں مؤثر طور پر پہنچ چکی تھی، اس کے بعد اس کا مقصد ایسے حالات پیدا کرنا تھا کہ وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک کے علاقے میدانِ کارزار میں بدل جائیں۔ اس کی توجہ کا خاص مرکز طالبان کی امارتِ اسلامیہ افغانستان تھی جو ازبکستان، تاجکستان، چیچنیا اور سنکیانگ کی مقامی تحریکوں کا نقطۂ آغاز تھی۔ یہ مؤخر الذکر تنظیمیں اسلام کی علمبردار تھیں لیکن طالبان

تحریک کی طرح ان ایجنڈے بھی مقامی تھے۔ ان کی حکمت عملی علاقائی حدود کے اندر ہی تھی۔ القاعدۃ کا ایجنڈا اس حدوں سے ماوراہے۔

یہ کتاب ۱۹۹۶ سے ۲۰۱۰ کے دورانیے پر تفصیلاً بحث کرتی ہے اور اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ اس دور میں القاعدۃ اور طالبان بہت سے دیکھنے والوں کو ایک ہی دکھائی دیے۔ تاہم شخصیات یا مقاصد کے لحاظ سے یہ کبھی بھی مماثل نہیں رہے۔ صرف چند لوگ بشمول طالبان کی اعلیٰ قیادت، اس حقیقت سے واقف ہیں۔ القاعدۃ نے طالبان کی حمایت کی اور طالبان کی عسکری کامیابی میں قابلِ قدر حصہ ڈالا۔ پہلے ۱۹۹۰ کے اواخر میں افغان خانہ جنگی میں شمالی اتحاد کے خلاف اور پھر اکتوبر ۲۰۰۱ میں فغانستان پر امریکی حملے کے بعد امریکہ کے خلاف مدد کی۔ پھر بھی اس بنیاد پر بھی دونوں ایک اکائی نہیں بنتے۔ ان کے درمیان خاص تعلقات ہیں اور ان تعلقات سے القاعدہ کا مقصد اپنے عالمی ایجنڈے کو تقویت دینے کے لیے طالبان اور تمام مسلم آزادی کی تحریکوں کو اپنے اندر شامل کرنا ہے۔

نتیجتاً طالبان اور آزادی کی تمام ملکی اور علاقائی تحریکیں مثلاً ازبکستان ، چیچنیا، سنکیانگ اور کشمیر وغیرہ القاعدۃ کے منصوبے سے چوکنّا ہو گئی ہیں لیکن القاعدۃ نے اپنا جال بڑی احتیاط سے بچھایا ہے۔ اس کا یہ ہدف کہ تمام وسائل کا استعمال یقینی طور پر القاعدۃ کے ذریعے ہی ہو، ان تحریکوں کے لیے القاعدۃ کی ہدایات اور حکم ناموں پر عمل درآمد کرنے کے علاوہ کوئی راہِ انتخاب نہیں چھوڑتا۔ تاہم القاعدۃ خود غرض نہیں ہے۔ یہ وسیع تر اسلامی مفاد کے لیے کام کر رہی ہے۔ دراصل اگر ہم ۱۹۹۰ کے وسط سے لے کر ۲۰۱۰ تک کے واقعات پر نظر ڈالیں تو دیکھ سکتے ہیں کہ القاعدۃ نے بار بار اپنے آپ کو قربان گاہ پر (قربانی کے لیے) پیش کیا ہے۔

شمالی افغانستان میں ۱۹۹۰ کے وسط میں شمالی اتحاد کے خلاف طالبان کی ابتدائی کامیابی مستقل نہ تھی۔ القاعدۃ نے اپنے عرب جنگجوؤں سے طالبان کی مدد کی۔ سوویت روس کے خلاف افغان جہاد میں عرب مجاہدین اصل ہیرو تھے۔ اسی لیے جب القاعدۃ نے شمالی اتحاد کے خلاف طالبان کے ساتھ سپاہ ملائی تو اس سے طالبان میں بہت زیادہ اعتماد پیدا ہوا۔ عرب، افغانوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ پھرتیلے جنگجو ہیں۔ عربوں کی شمولیت نے طالبان اور شمالی اتحاد کے درمیان دشمنی کے محرکات تبدیل کر دیے۔ شمالی اتحاد کی فوجوں نے، جن کی سربراہی اس وقت احمد شاہ مسعود کر رہا تھا، تمام خطہ کھو دیا اور اس کے زیرِ اثر شمالی افغانستان کا محض تھوڑا سا علاقہ رہ گیا۔ کئی موقعوں پر احمد شاہ ایسے مشکل حالات میں پھنسا کہ تاجکستان فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ یہ وہ وقت تھا جب طالبان نے شمالی اتحاد کے گڑھ پنجشیر وادی میں اپنی راہیں بنائیں۔

طالبان کی شمالی اتحاد کے خلاف القاعدۃ کی حمایت نے طالبان پر بہت زیادہ اثر کیا۔ ملا محمد عمر ذاتی طور ممنون و مشکور ہو گئے۔ اور یہی وقت تھا کہ القاعدۃ صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھائے۔ القاعدۃ نے طالبان کی تمام دفاعی پالیسیوں کی ذمہ داری سنبھال لی جس میں تربیتی مراکز کو چلانا اور شمالی اتحاد کے خلاف حکمت عملیاں وضع کرنا بھی شامل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ القاعدۃ کو آزادی کی تحریکوں کے چیچن، پاکستانی، ازبک حتیٰ کہ چینی جہادی کیمپوں تک فوری رسائی حاصل ہو گئی۔ اس سارے عمل میں القاعدۃ نے افغانستان میں طالبان حکومت کی نوعیت تبدیل کرتے ہوئے افغانستان کو ایک نیشنل سکیورٹی سٹیٹ بنا کر پورے ملک میں جنگی خوف پیدا کر دیا۔ اس میں بامیان کے بدھا مجسموں[1] کو دھماکے سے اڑانے کی کارروائی اور اس

1۔ افغانستان کے ہزارہ جات ریجن میں بامیان وادی میں موجود چھٹی صدی کے دو بدھا مجسمے، جن کو 2001 میں طالبان (امارت اسلامیہ افغانستان) کے رہنما ملا محمد عمر کے حکم پر گولہ بارود کی مدد سے اڑا دیا گیا تھا۔ مترجم

طرح کی دوسری سرگرمیاں شامل ہیں جن کی بدولت طالبان عالمی برادری سے الگ ہو گئے۔ تین ملکوں نے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا: پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات۔ انہوں نے پرزور کوششیں کیں کہ طالبان چینی سرحد کے قریب علاقے میں منتقل ہو جائیں۔ تاہم طالبان نے چین کو باور کرایا کہ کسی کو بھی اجازت نہیں کہ طالبان کے زیرِ عمل علاقوں کو اپنے جارحانہ مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ مشرقی ترکستان کی اسلامی تحریک کو پر امن طور پر افغانستان میں رہنے کی اجازت ہو گی لیکن اسے سنکیانگ میں کارروائیوں کی اجازت نہیں دی جائے گی، جیسا کہ چین کو خدشات تھے۔ چین، افغانستان میں طالبان حکومت کو تسلیم اور سفارتی تعلقات قائم کرنے ہی والا تھا کہ بامیان بدھاؤں کا واقعہ ہو گیا۔ اس کے بعد نائن الیون کا واقعہ ہوا جس سے چین پیچھے ہٹ گیا۔ اگر چین طالبان کی حکومت کو تسلیم کر لیتا تو طالبان کے افغانستان کو عالمی برادری کا رکن بنانے کی تگ و دو کرتا لیکن یہ القاعدۃ کا مقصود نہیں تھا کیونکہ یہ بات اس کے وسیع تر مفادات کے خلاف تھی۔

القاعدۃ اس خطے کو میدانِ جنگ بنا کر امریکہ کو افغان دلدل میں پھنسانا چاہتی تھی اور جب نائن الیون کے واقعہ سے اس خطے میں چنگاری بھڑکی تو یہ القاعدۃ کے منصوبوں کے عین مطابق تھا۔ القاعدۃ کو افغانستان پر امریکی حملہ اتنا ہی ناگزیر دکھائی دیا جتنا کہ طالبان کا شکست کھا کر پاکستانی سرحدی علاقوں میں پسپائی اختیار کر جانا۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سات قبائلی ایجنسیاں ہیں:

* خیبر ایجنسی
* اورکزئی ایجنسی
* کرم ایجنسی
* مہمند ایجنسی

* باجوڑ ایجنسی

* جنوبی وزیرستان ایجنسی

* شمالی وزیرستان ایجنسی

پاکستانی شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے پاکستان کے جنوب مغربی صوبے بلوچستان تک ایسے سفری راستے جاتے ہیں جو ہلمند اور قندھار کے افغان صوبوں کی سرحد کے ساتھ متصل ہیں۔ اس جغرافیائی دائرے نے سوویت یونین کے خلاف افغان قومی مزاحمت کو بنیادیں فراہم کیں۔ اس علاقے کے زیادہ تر لوگ نسلاً پشتون ہیں لیکن کچھ بلوچی بھی آباد ہیں۔ سب کے سب فطری طور پر جنگجو ہیں۔ افغانستان میں طالبان دورِ حکومت میں یہاں کے بہت سے پشتون اور بلوچ طالبان کے ساتھ مل کر لڑے یا ان کے ساتھ کام کیا۔ اس لیے افغانستان میں پسپا ہونے کے بعد طالبان اور القاعدۃ کے لوگوں کو اس خطے میں پناگاہ فراہم کرنے میں انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔

القاعدۃ کو ایک محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی لیکن اس پناگاہ میں بیٹھ رہنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے صرف قدرتی قلعے کی ضرورت تھی جہاں سے وہ اس پورے خطے کو میدانِ جنگ میں بدل دے۔ پھر یہ امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں کو افغانستان کے قدرتی گوریلا سلسلوں میں پھنسا سکتی تھی۔ اور پھر اپنی کارروائیوں کا دائرہ شمال میں وسط ایشیا اور مشرق میں ہندوستان تک وسیع کر سکتی تھی۔ پاکستان میں جہاد شروع کرنے کا القاعدہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن جب افغانستان میں پاکستان نے امریکہ کی طرفداری کی تو بہت مشکل حالات پیدا ہو گئے۔ پاکستان نے اگرچہ بے دلی اور دباؤ میں لیکن بلاشبہ امریکہ کی طرفداری کی۔ اس وجہ سے پاکستان کو بھی امریکہ کے مغربی حلیفوں کے برابر دشمن تصور کرنے کے علاوہ القاعدۃ کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ القاعدۃ نے محسوس کیا کہ اپنی کارروائیاں

پاکستان کے اندر پھیلانے کے علاوہ اس کے پاس اب کوئی متبادل نہیں رہا۔ لہٰذا ۲۰۰۲ کے بعد سے القاعدۃ نے اپنی حکمتِ عملی میں پاکستان کے قبائلی علاقوں کو توجہ کا مرکز بنایا، وہ علاقے جہاں اس کا مرکز تھا، اور پورے خطے میں اپنے نظریات پھیلائے۔ اس نے پاکستان میں چھوٹی موٹی چند ایک کارروائیاں اس امید پر کیں کہ افغانستان میں امریکی کارناموں پر پاکستان کی حمایت ختم ہو جائے لیکن پاکستان میں بڑا محاذ اب بھی نہیں کھولا تھا۔ قبائلی علاقوں میں اپنی فوجیں منظم کرنے کے بعد القاعدۃ ۲۰۰۶ میں دوبارہ افغانستان میں داخل ہوئی تا کہ طالبان کی جارحانہ واپسی میں مدد کر سکے۔ دراصل یہی بات طالبان کی واپسی اور القاعدۃ کے لیے اہم موڑ ثابت ہوئی۔ ۲۰۰۷ میں القاعدۃ قبائلی علاقوں کی غاروں میں ایک بار پھر سے منظم ہونے کے لیے تھوڑے عرصے کے لیے واپس آئی لیکن اس دفعہ اس کا ارادہ پاکستان میں محاذ کھولنے کا تھا کیونکہ افغانستان میں امریکی کارروائیوں کی جو واضح حمایت پاکستان کر رہا تھا وہ ناقابلِ تردید (اور ناقابلِ نظر انداز) تھی۔ اس نے کچھ بڑی کارروائیاں کیں، جس میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کا قتل بھی شامل ہے، اور دوبارہ قبائلی علاقوں میں واپس چلی گئی اور نظریاتی طور پر متاثر اپنے قبائلی ساتھیوں کو 'حقیقی بھائیوں' میں بدلنے پر کام شروع کر دیا۔

یہاں سے ۲۰۰۷ کے آخر اور ۲۰۰۸ کے اوائل میں تحریکِ طالبان پاکستان وجود میں آئی اور القاعدۃ نے ان جنگجوؤں کی مدد سے رہنماؤں اور کمانڈروں کی ایک نئی نسل تیار کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا بھر کی مسلم مزاحمتی تحریکوں، جن میں ہندوستانی کشمیر اور ہندوستانی سرزمین بھی شامل ہیں، میں باہم ربط پیدا کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ فلسطین، صومالیہ، اور عراق کے مسئلے کو بھی نمایاں کیا جائے۔

چونکہ اب القاعدۃ کی حربی حکمتِ عملی اور عقاید ایک ہو گئے تھے اور ۲۶ نومبر کے ممبئی حملے اور چیچنیا کی مسلم مزاحمتی تحریک نے متحد ہو کر ہندوستان میں القاعدۃ کے نئے حملوں

کے لیے راہ ہموار کی۔ اس وقت پوری دنیا افغان جنگ سے ہراساں ہے اور ۲۶ نومبر کے واقعے کو ایک الگ واقعے کے طور پر دیکھ رہی ہے۔ اس کتاب کا مقصد اس خیال سے ہٹ کر دیکھنا ہے۔ یہ کتاب گیارہ ستمبر کے بعد ہونے والے واقعات کا ایک جائزہ پیش کرتی ہے اور ایک مختلف رخ دکھاتی ہے اور اس بات کی دلیل پیش کرتی ہے کہ ہندوستان کو میدانِ جنگ میں لانے کی شروعات کرکے القاعدۃ مغرب کے خلاف جنگ کو مشرقِ وسطیٰ تک پھیلانا چاہتی ہے تاکہ 'وقتِ آخر' کی آخری جنگ یہاں لڑکر فلسطین کو آزاد کرایا جائے۔

بابِ اول

ایک نئی دنیا: تباہی، ہجرت، دوست اور دشمن

آگ کا کھیل

القاعدۃ نئے راستے پر

ایک نئی دنیا: تباہی، ہجرت، دوست اور دشمن

گیارہ ستمبر کے فوری بعد اسامہ بن لادن نے ٹی وی چینلز پر اپنے پیغامات نشر کروائے اور اس دوران گرفتاری سے بچنے کے لیے ایک سے دوسرے خفیہ ٹھکانے تک حرکت کرتے رہے۔ القاعدۃ کی ان چالوں کا دور امریکہ کی افغانستان پر ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ کی چڑھائی سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس دوران اسامہ بن لادن کے مخبروں نے پاکستان میں پہلے سے قائم شدہ روابط کے ذریعے نئے تعلقات بنائے۔ انہوں نے القاعدۃ کے جنگجوؤں کے خاندانوں کو بسانے کے لیے پاکسان میں کرائے پر مکان لیے۔ ابوزبیدہ فلسطینی کو ایک لاکھ امریکی ڈالر دے کر لشکر طیبہ کے سربراہ حافظ محمد سعید سے ملاقات کے لیے لاہور بھیجا گیا تاکہ خواتین اور بچوں کے پاسپورٹ اور ٹکٹوں کا بندوبست کیا جائے اور ان کے لیے عارضی رہائش کے انتظامات کیے جائیں۔ حافظ سعید، اسامہ بن لادن اور القاعدۃ قیادت کا دیرینہ ہمراز تھا اس لیے اس حساس مشن کے لیے اس کا انتخاب کیا گیا۔

ابو عبد الرحمان سریحی (جو ایک سعودی اور بن لادن کے نائبین میں سے تھے) نے افغانستان کی کنڑ وادی میں ۱۹۸۸ میں ایک تنظیم باجوڑ ایجنسی سے پاکستانیوں کی بھرتی کے لیے قائم کی تاکہ افغانستان کے خلاف لڑا جائے۔ سریحی لشکر طیبہ کے کمانڈر ان چیف اور ۲۶ نومبر کے ممبئی حملوں کے مرکزی مشکوک زکی الرحمان لکھوی کے برادرِ نسبتی تھے۔ تربیتی کیمپوں کے لیے ابتدائی رقوم اسامہ بن لادن نے فراہم کیں اور یہ تنظیم کنڑ اور باجوڑ میں پھیلی پھولی۔ سلفی مکتبۂ فکر کے سیکڑوں پاکستانی نوجوان اپنے افغان بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے اس تنظیم میں شامل ہوئے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۸۸ تک اسامہ بن لادن عالمی مزاحمتی تحریک کے رنگ وروِش کی بنیاد رکھ چکے تھے۔

۱۹۹۰ میں عراق نے کویت پر چڑھائی کر دی۔ اسامہ بن لادن نے سعودی عرب کو ملک کے دفاع کے لیے رضاکار فراہم کرنے کی پیش کش کی تاکہ اس کے پاس امریکی مدد کوئی متبادل ہو جائے۔ اسامہ بن لادن نے ان وسائل کی تفصیلات بھی فراہم کیں جن پر ان کا اختیار تھا۔ ان میں کنڑ وادی کا سریکی سیٹ اپ بھی شامل تھا۔ لشکر طیبہ نے انھی ایام میں کنڑ وادی میں جنم لیا۔ یہ اسامہ بن لادن کے قائم کردہ سریکی سیٹ اپ کی ایک شاخ تھی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد افغانستان میں کمیونسٹ دور ختم ہو گیا اور اس سے پہلے کہ طالبان حکومتی باگ ڈور سنبھالتے، کویت اور سعودی عرب کی پشت پناہی میں وادی میں سلفی عقائد پر مبنی ایک امارتِ اسلامیہ قائم ہو گئی۔

۷ اکتوبر ۲۰۰۱ کو امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ دو ماہ تک یک طرفہ جنگ جاری رہی جس میں امریکہ غالب رہا، اس کے بعد القاعدۃ اور طالبان کی ساری قیادت پاکستان منتقل ہو گئی۔ یہ جنگ کا خاتمہ نہیں تھا جیسا کہ امریکہ نے رجائی طور پر فرض کر لیا تھا بلکہ ایک نئی عالمی کشمکش کی بنیاد تھی۔ گیارہ ستمبر کے حملے مغربی اجارہ داری اور مفادات کے خلاف عالمی جنگ میں مرکزی اہمیت اختیار کر چکے تھے۔ اس کی بنیاد ان حکومت مخالف مسلم گروہوں نے رکھی جو دو دہائیاں پہلے افغانستان کے عسکری کیمپوں میں مل چکے تھے۔ اولین آمد مصری نوجوانوں کی ہوئی جو اخوان المسلمون سے آئے تھے۔ بعد میں مختلف عرب حکومتوں کی مخالف بہت سی زیرِ زمین تنظیموں کے لوگ بھی ان سے آن ملے۔ یہ اس تحریک کا مرکزہ تھا جس نے افغانستان میں کمیونزم کو شکست دے کر سوویت سلطنت کے خاتمے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ لیکن مغربی دنیا کی دشمنی کے ساتھ طاقتور امریکی جنگی مشینری کے ساتھ ٹکر لینا ایک دوسرا معاملہ تھا۔ امریکہ اور اس کی اتحادی فوجوں کا مشترکہ سخت حملہ بہت مہلک تھا جس میں بہت سے جنگجو ملیامیٹ ہو گئے۔ دو ماہ کی جنگ میں سرکاری

اعداد و شمار کے مطابق امریکی مقتولین کی تعداد صرف بارہ تھی۔ جبکہ فضائی بمباری میں القاعدۃ کے ہزاروں جنگجو اور عام آدمی مارے گئے۔ جب دسمبر ۲۰۰۱ میں طویل افغان جنگ کا یہ دوماہی دور ختم ہوا تو ایک اندازے کے مطابق القاعدۃ کے تین ہزار جنگجو مارے جا چکے تھے۔ درجنوں گرفتار ہو چکے تھے اور جس وقت باقی ماندہ لوگ پاکستان کے قبائلی علاقوں باجوڑ، مہمند، شمالی اور جنوبی وزیرستان میں پہنچے تو ان کی تعداد کم ہوتے ہوتے چند ہزار رہ گئی تھی۔ قبائلی علاقے ہندو کش کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع ہیں۔ ان علاقوں میں موجود دنیا کے بنجر ترین قطعاتِ زمین قدرتی پہاڑی پناگاہیں فراہم کرتے ہیں۔ افغانستان پر امریکی حملے کے بعد فرار ہونے والے غیر ملکی جنگجوؤں کی درست تعداد کے متعلق کوئی قابلِ اعتبار معلومات نہیں ہیں لیکن ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں آنے والے ازبک، چیچن، ایغور، چینی اور عرب جنگجوؤں کی کل تعداد دس ہزار ہے۔ ان میں سے القاعدۃ کے مبینہ ارکان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔

جب افغان مزاحمت کے بچے کھچے لوگ اس ناگفتہ بہ حالت میں تھے تو القاعدۃ امریکی اجارہ داری سے مبارزت کرنے کے قابل نہ تھی۔ لیکن اس کے اصل نقصانات مفروضہ اندازوں سے بہت کم تھے کیونکہ القاعدۃ کے اصل ممبران نے افغان لڑائی میں اصلاً کوئی حصہ نہیں لیا، صرف خاص حالات اس سے مستثنیٰ ہیں، جیسا کہ تورابورا کا محاصرہ، جہاں پر اس کے آدمی گھیرے جا چکے تھے اور ان کے پاس لڑنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ القاعدۃ کی شروع سے حکمتِ عملی رہی کہ توانائیوں اور وسائل کو جنگ کے اگلے مرحلے کے لیے بچا کر رکھا جائے۔ وہ مرحلہ جب امریکی فوجیں افغانستان میں مکمل طور پر گشت لگا چکیں۔ القاعدۃ نے آہستہ آہستہ ناکارہ کر دینے والی جنگ کا یہ مرحلہ پاکستانی قبائلی علاقوں سے شروع کیا۔

آگ کا کھیل

افغانستان میں طالبان کی شکست کے تھوڑے ہی عرصے بعد پاکستان میں القاعدۃ کا نیٹ ورک ایک حد تک تباہ ہو چکا تھا۔ افغان جنگ میں پاکستان القاعدۃ کے لیے جنگی حکمتِ عملی کا اہم مرکز تھا۔ مارچ ۲۰۰۲ میں القاعدۃ کے اہم رہنما ابو زبیدہ گرفتار ہوئے۔ چند ماہ بعد گیارہ ستمبر ۲۰۰۲ کو رمزی بن الشیبہ پکڑے گئے۔ خصوصاً ابو زبیدہ کی گرفتاری سے القاعدۃ کی پاکستان میں ناقص منصوبہ بندی ظاہر ہوئی۔ انہیں یہ ذمہ داری ملی تھی کہ لشکرِ طیبہ کے چیف حافظ سعید سے رابطہ کریں اور القاعدۃ کے ارکان کے خاندانوں کو محفوظ منزلوں تک پہنچائیں۔ میں نے یہ حقیقت ۲۷ جنوری ۲۰۰۶ کو ایشیا ٹائمز آن لائن میں بیان کی تھی:

لشکرِ طیبہ میں موجود ذرائع کے مطابق رقم کی مالیت ایک لاکھ امریکی ڈالر تھی جسے ۲۰۰۱ میں امریکی حملے کے نتیجے میں افغانستان سے منتقل ہونے والے جہادیوں اور ان کے خاندانوں کی دیکھ بھال پر خرچ ہونا تھا۔ لشکرِ طیبہ پاکستان کی واحد تنظیم تھی جس سے عرب معاملات کر سکتے تھے۔ فریقین کے سلفی پس منظر کے علاوہ بھی اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ سب سے اہم وجہ وہ تعلقات تھے جو سوویت کے خلاف ۱۹۸۰ کی دہائی میں ہونے والی افغان مزاحمت کے دوران میں فروغ پائے۔ چنانچہ لشکرِ طیبہ نے سقوطِ کابل اور سقوطِ قندھار کے بعد کئی عرب خاندانوں کے لیے عارضی رہائش کا انتظام کیا۔ اگلے مرحلے میں جعلی دستاویزات اور فضائی ٹکٹوں کا بندوبست کیا جانا تھا۔ لیکن حافظ سعید اور رقم کوئی تعاون نہیں کر رہے تھے۔ ابو زبیدہ اس وقت فیصل آباد میں لشکرِ طیبہ کے محفوظ ٹھکانے میں رہ رہے تھے۔ وہ حافظ سعید سے بات کرنے کے لیے لاہور آئے تو حافظ سعید نے رونا رویا کہ عربوں کی مدد کرنے کے لیے میرے پاس رقم ناکافی ہے۔ ابو زبیدہ برافروختہ ہو کر واپس اپنے محفوظ ٹھکانے پر لوٹ گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد اس ''محفوظ'' گھر پر ریڈ ہوئی اور ابو زبیدہ گرفتار کر لیے

گئے۔ یہ واقعات جہادی لوک کہانی کا حصہ ہیں۔ تاہم، اس میں نئی بات کا اضافہ ایک دوسرے ذریعے نے کیا جنہوں نے لشکرِ طیبہ میں شامل ہونے کے لیے پاک آرمی چھوڑی لیکن جلد ہی حقیقت آشکار ہونے پر اس سے علیحدہ ہوئے اور کاروبار کرنے افریقہ چلے گئے۔ ابو جبران، ابوزبیدہ کا محافظِ خاص تھا۔ اسے بھی ابوزبیدہ کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اسے اس وقت کیوبا میں گوانتاناموبے کے امریکی فوجی اڈے کے ایکسرے کیمپ میں ہونا چاہیے۔ لیکن وہ اس وقت لشکرِ طیبہ کے کمانڈران چیف ذکی الرحمان کا ذاتی مشیر ہے۔ ایشیا ٹائمز آن لائن کی تحقیق کے مطابق ابو جبران کو امریکی ایف بی آئی نے ابوزبیدہ کے ساتھ گرفتار کرنے کے آٹھویں روز ہی رہا کر دیا تھا۔ جوں ہی وہ رہا ہوا اسے ذکی الرحمان کا مشیر بنا دیا گیا۔ لشکرِ طیبہ کے اندرونی حلقوں میں ابو جبران، جناب جبران چاچا کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جین مائیر (Jane Mayer) اپنی کتاب "تاریک رخ: دہشت گردی کے خلاف جنگ کس طرح امریکی آئیڈیلز کے خلاف جنگ میں بدلتی ہے" میں لکھتی ہے کہ سی آئی اے کے ایک کارندے کے مطابق امریکہ نے پاکستانی حکومت کو دس ملین امریکی ڈالر ادا کیے جس نے ایک مخبر کو رشوت دے کر ابوزبیدہ کا اتا پتا معلوم کروایا۔ ابوزبیدہ کی گرفتاری کی وجہ سے درجنوں گرفتاریاں ہوئیں۔ مہینوں کے اندر ہی القاعدۃ کا نیٹ ورک بیڑیوں میں تھا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ اس کی بقا پر سوالیہ نشان لگ گیا۔

پاکستان ۲۰۰۱ کے آخر میں طالبان کی شکست کے بعد سے واشنگٹن کی طرف سے دباؤ میں تھا۔ اس دباؤ میں افغان سرحد کے نزدیک جنوبی وزیرستان میں اعظم وارسک میں ۲۲ جون ۲۰۰۲ کو طالبان کے خلاف آپریشن شروع کیا۔ اعظم وارسک آپریشن پاکستانی فوج کا القاعدۃ پر پہلا حملہ تھا۔ اس حملے میں ایف سی کی پیراملٹری فورس اور وزیرستان سکاؤٹس بھی شامل تھے۔ کل سترہ افراد مارے گئے جن میں گیارہ سکیورٹی فورسز کے اہلکار اور چھ چیچن اور

ازبک جنگجو تھے۔ اطلاعات کے مطابق پچاس سے زائد غیر ملکی حملے سے بچ نکلے۔ لیکن یہ آپریشن پاکستانی قبائل کی شکست خوردہ طالبان اور اس کے غیر ملکی اتحادیوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ افغانستان پر امریکی چڑھائی کی وجہ سے قبائل غم و غصے میں تھے اور جب پاکستانی فوج نے فرار ہوتے القاعدۃ کے ارکان کو پکڑنے کی کوشش کی تو قبائلی فوج پر چڑھ دوڑے۔ ان کے غم وغصے کا واضح اظہار تب ہوا جب محسود قبیلہ پاکستانی فوج کے سامنے رکاوٹ بنااور غیر ملکیوں کو محفوظ راستہ فراہم کیا۔ حالانکہ محسود قبیلہ ایک مدت تک اسٹیبلشمنٹ کا حامی تھا۔وزیر قبائل اور دوسرے قبائلی سرداروں اور عمائدین نے پاکستان کو ترکی بہ ترکی جواب کے لیے خبر دار کر دیا۔ انہوں نے آپریشن کو امریکی سپانسرڈ کہا اور اعلان کیا کہ اگر مزید کوئی آپریشن قبائلی علاقوں میں ہوا تو یہ تمام پشتون قبائل کے خلاف اعلانِ جنگ تصور کیا جائے گا۔

۲۷جون ۲۰۰۲ کو پاکستانی فوج کے کئی افسر جن میں بریگیڈیئر شوکت حیات اور کرنل سعید خاں بھی شامل تھے، قبائلی جرگے سے ملے۔ دونوں فوجی افسران نے وعدہ کیا کہ آئندہ القاعدۃ کے خلاف کوئی بھی آپریشن شروع کرنے سے پہلے قبائل کو موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے طور پر معاملات کو سنبھال لیں۔ فوج صرف اس صورت میں لڑائی میں شامل ہو گی جب قبائل صورتحال سے نبٹنے میں ناکام ہو جائیں گے۔ تاہم معاہدے کے باوجود پاکستانی سکیورٹی فورسز اور مقامی انتظامیہ نے ایسے چھوٹے چھوٹے آپریشن کرنا جاری رکھے جن میں غیر ملکی باشندے گرفتار ہوئے۔ قبائل نے اس پر سنجیدہ احتجاج کیا لیکن اس معاملے پر اتنی توجہ نہ دی جتنی کی متوقع تھی۔ پھر ۲، اکتوبر ۲۰۰۳ کو پاکستانی فوج نے بیہودگی سے عدمِ ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے بغیر انتباہ کے پچیس سو کمانڈو انگور اڈہ کے قریب بغار گاؤں میں اتار دیے اور ان کی فضائی مدد کے لیے بارہ گن شپ ہیلی کاپٹر بھی تھے۔ مقامی باشندوں کے مطابق کچھ

ہیلی کاپٹر افغان سرحد کے پار مچداد کے امریکی ایئر بیس سے آئے تھے۔ عینی شاہدین کے مطابق حملے میں اکتیس پاکستانی فوجی اور تیرہ غیر ملکی لڑاکے اور قبائلی آدمی مارے گئے۔ تاہم عسکریت پسندوں کی بڑی تعداد بچ نکلی۔ میجر جنرل فیصل علوی نے اس آپریشن کی سربراہی کی اور القاعدۃ کے کئی اہم کمانڈر مارے گئے جن میں عبدالرحمان کندی بھی شامل تھے۔ القاعدۃ نے حملے کا انتقام لیا اور ریٹائرڈ میجر ہارون عاشق نے ۲۰۰۸ میں میجر جنرل علوی کو قتل کر دیا۔ لیکن حالات متقاضی تھے کہ القاعدۃ نئی حکمتِ عملی اپنائے اور اس طرح اس حقیقی الف لیلۃ کا ایک اور اہم کردار سامنے آیا۔

اکتوبر ۲۰۰۳ کے فوجی آپریشن نے القاعدۃ رہنماؤں کو مجبور کر دیا کہ فوری طور پر اقدامات کیے جائیں۔ القاعدۃ کو اب سمجھ میں آیا کہ پرانی طالبان جماعت کا واحد مفید کام اس کے ارکان کو پناہ دینا ہے۔ جلال الدین جیسے کمانڈر صرف اپنے پاکستانی تعلقات کی وجہ سے بچے رہے۔ ان کی کمر اتنی مضبوط نہیں تھی کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے مقابل ہوں۔ القاعدۃ نئے جوان خون کی تلاش میں تھی جس کا پاکستانی سکیورٹی فورسز کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ القاعدۃ درجنوں جوان قبائلیوں سے ملتی رہی اور اس کی تربیت یافتہ نظروں میں نیک محمد موزوں شخص قرار پائے۔ یہ نئے طالبان کا آغاز تھا، جنوبی ایشیاء کی جوان نسل جس نے القاعدۃ کے نظریاتی اور عسکری وژن کے ساتھ جنم لیا۔

القاعدۃ نئے راستے پر

نیک محمد بیس برس کے نیم خواندہ اور غریب آدمی تھے جو وزیر قبیلے سے جنوبی وزیرستان کی طرف سفر کر رہے تھے۔ القاعدۃ رہنماؤں نے ان کے اندر چھپے فطری جنگجو کو تلاش کر لیا۔ اسے رقم اور اسلحہ فراہم کیا گیا۔ نیک محمد اور اس کے قبائلی دوست وانا کے قبائلی مرکز جانے کی خاطر پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے پہاڑوں پر دوڑے پھرا کرتے تھے۔ اب ان

کے پاس سفر کے لیے نئی گاڑیاں تھیں۔ مسلح محافظ ان کے ساتھ ہوتے ۔ پشتون قبائلی معاشروں میں اسلحہ، دولت اور آدمیوں کا ساتھ ایک لیڈر کی علامتیں ہیں۔ ان تینوں چیزوں کی موجودگی میں نیک محمد کو جنوبی وزیرستان کا ایک حقیقی لیڈر تسلیم کر لیا گیا۔

قبائلی سرداروں کی پرانی جاگیردارانہ گرفت کمزور پڑنا شروع ہو گئی۔ نیک محمد نے مذہبی نوجوانوں کو منظم کیا اور پرانے نظام کو چیلنج کر دیا۔ چند ہی مہینوں میں صدیوں پرانا قبائلی ڈھانچہ ختم ہو گیا۔ نئی نسل خود اسلامی فیصلے کر رہی تھی۔ ان کی نافرمانی کی کوئی حد نہ تھی۔ قبائلی بڑوں اور ان کے ہمنوا مولویوں کی کوئی گرفت نہ رہی۔ روائتی قبائلی نظام راتوں رات بدل گیا۔ نوجوان مذہبی عسکریت پسند کسی بھی حریف کی موجودگی برداشت کرنے کے روادار نہ تھے۔ قبائلی سردار یا تو مقابلے میں مار دیے گئے یا وہ شہروں کو بھاگ گئے۔ ان کی جاگیریں اس نئی نسل کے ہاتھ آ گئیں جو مکمل طور پر القاعدۃ کے ساتھ تھی۔

پاکستانی ملٹری اسٹیبلشمنٹ نے ان واقعات کو عارضی سمجھا اور پر اعتماد رہی کہ ایک ٹھیک ٹھاک فوج آپریشن سے القاعدۃ نظریات کے تمام نشانات مٹ جائیں گے۔ اسٹیبلشمنٹ اس بارے میں پر یقین ہو گئی جب ۲۰۰۴ میں نیک محمد سی آئی اے کے ڈرون حملے میں مارے گئے۔ تاہم امریکہ اور پاکستان دونوں نے القاعدۃ کے متعلق غلط اندازہ لگایا۔ القاعدۃ افراد پر انحصار نہیں کرتی، اس کی جنگی حکمتِ عملی بہت رواں اور متحرک ہے۔ نیک محمد کی شخصیت کے پیچھے اس نے ایک ایسی جماعت کو متحرک کر دیا تھا جو افغانستان میں امریکی نیٹو فوجوں کے خلاف جنگ جاری رکھ سکے اور پاکستان پر سے دباؤ کو بھی کم کر سکے۔

جنوبی وزیرستان میں القاعدۃ کی زیر کمان دو بڑی طاقتیں جنداللہ اور جیش القبہ الجہادی السیری العالمی تھیں، جنہیں ۰۴-۲۰۰۳ میں القاعدۃ کی اعلیٰ قیادت نے تیار کیا تھا۔ جیش القبہ کو بشمول افغانستان بین الاقوامی سطح کی کارروائیوں کی ذمہ داری دی گئی جبکہ جنداللہ

کا ہدف امریکہ، پاکستان میں مغربی مفادات اور پاکستان پر سے امریکی دباؤ کو کم کرنے کے لیے آپریشن کرنا تھا۔ پاکستانی جند اللہ ایرانی جند اللہ سے مختلف تھی۔ یہ تنظیمیں صرف عسکری کارروائیوں کے لیے ہی نہیں بنائی گئیں بلکہ ان کا مقصد القاعدۃ کے مشن کو (دعوت کے ذریعے) عوام تک پہنچانا، اس کی طاقت میں اضافہ کرنا بھی تھا۔ ان تنظیموں نے پراپیگنڈہ لٹریچر پیدا کیا، ڈاکومنٹریز بنائیں، امت سٹوڈیو[1] بنایا جس نے القاعدۃ کے میڈیا ونگ السحاب فاؤنڈیشن کی طرح کے کئی کام سرانجام دیے۔

۲۰۰۴ کے آخر میں القاعدۃ نے اسامہ بن لادن کی ۲۰۰۲ سے ۲۰۰۴ تک کی منتخب تقاریر پر مشتمل ایک سی ڈی جاری کی۔ یہ سی ڈی افغانستان، پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ میں پھیلائی گئی۔ عوام میں اپنے مبہم تصور کو واضح کرنے اور افغانستان اور مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ اور دوسری غیر ملکی قابض فوجوں کے خلاف اعلانیہ جہاد شروع کرنے جیسے وسیع تر ہدف کی طرف یہ القاعدۃ کا پہلا قدم تھا۔ ان تقاریر میں مختلف سطح کے سامعین کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ۲۰۰۲ کی ایک تقریر میں پاکستانی قوم سے خطاب تھا۔ ۲۰۰۴ کی تقریر یورپ والوں کے لیے تھی اور دسمبر ۲۰۰۴ کی تقریر جزیرۃ العرب کے عوام کے لیے تھی۔ ان تقاریر میں سے طویل ترین اور پر اثر تقریر جزیرۃ العرب کے عوام سے دسمبر ۲۰۰۴ کا ویڈیو خطاب تھا۔ اس میں وضاحت کی گئی تھی کہ القاعدۃ سعودی حکمرانوں کو کیوں ہدف بنا رہی ہے۔ اس میں ان حکمرانوں کی بدعنوانی، ظلم واستبداد، انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اور اسلامی عقیدے سے انحراف جیسی وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ سی ڈی میں عراق جنگ اور تباہی کے ہولناک مناظر

1۔ امت سٹوڈیو دراصل القاعدہ کی اتحادی تحریک طالبان پاکستان اور حرکت اسلامی ازبکستان کا مشترکہ نشریاتی ادارہ تھا جو فی الوقت غیر فعال ہے، البتہ ادارہ "السحاب" القاعدہ کا مرکزی نشریاتی ادارہ ہے-مترجم

دکھائے گئے تھے اور عراقی مزاحمت کاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ القاعدۃ کی پرانی پیش کشوں کے مقابلے میں یہ سی ڈی جدید سٹوڈیو میں پیشہ ور ماہرین کی بنائی ہوئی لگتی تھی۔ سمعی و بصری اثرات بہت واضح تھے اور غیر عرب مقررین کے لیے انگریزی سب ٹائٹلز دیے گئے تھے۔ اردو، فارسی، انگریزی، پشتو اور عربی زبانوں میں علیحدہ علیحدہ فائلیں بھی شامل تھیں۔ اس سی ڈی سے واضح نظر آتا تھا کہ القاعدۃ دوبارہ منظم ہو چکی ہے اور اب زیادہ منظم انداز سے اپنے پیغام مسلم دنیا تک پہنچانے کے لیے تیار ہے۔ لیکن ماضی کے برعکس لوگوں کو صرف افغان مزاحمت میں شمولیت کی ترغیب دینے کی بجائے ۲۰۰۵ کے بعد سے اس کا مقصد عالمگیر مزاحمت کے لیے مسلم عوام سے تعلق جوڑنا تھا۔ لہٰذا سی ڈی کے لیے منتخب تقاریر میں لوگوں کو جنگ پر اکسانے کے لیے محض خالی اور سادہ پراپیگنڈہ نہیں تھا بلکہ القاعدۃ کے منہاج کا گہرا تجزیہ اور اس کی کارروائیوں کی توجیہات کے ساتھ وضاحت بیان کی گئی تھی۔ عام طور پر خفیہ گروپ اپنے کاموں کی توجیہہ بیان کرنے کے لیے کوئی بحث مباحثہ نہیں کرتے۔ وہ زورِ بیان سے تازہ خون کو مائل کرنے میں ہی خوش رہتے ہیں۔ تاہم جب کبھی وہ اجتماعی سوچ پیدا کرنے کے لیے میڈیا کے ذریعے عوام سے رابطہ کریں تو یہ چیز مرکزی دھارے کے ساتھ تعلق میں ان کے مفاد کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں کسی بہت بڑے مقصد کے لیے عوامی تحریک اور عوامی شمولیت کے پروگرام ہوتے ہیں۔

۲۰۰۴-۰۵ میں القاعدۃ خاص طور پر پاکستان میں بالکل یہی کرنا چاہتی تھی۔ جند اللہ سٹوڈیو شروع کرنے کا مقصد اس میڈیا کے ذریعے پاکستانی نوجوانوں پر القاعدۃ کے دروازے کھولنا اور ان کے جذبات کو انگیخت کرنا تھا۔ جہادیوں کی ایک نئی نسل پیدا کرنے کے لیے القاعدۃ کا یہ بنیادی ہتھیار تھا لیکن القاعدۃ نے جند اللہ کو محض اسی مقصد کے لیے نہیں بنایا تھا۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ ایک ایسا پاکستانی جہادی گروپ پیدا کیا جائے جو پاکستان اور

افغانستان میں محدود مقاصد کے لیے کام کرے اور پھر اگلے مرحلے میں جیش القبہ کے ذریعے مغربی مفادات کے خلاف بین الاقوامی کارروائیوں میں حصہ لے۔ جند اللہ کے اصل سامعین مقبوضہ کشمیر میں لڑنے والی جہادی تنظیموں کے کارکن تھے۔ انہیں اس بات پر قائل کرنا مقصود تھا کہ مسلم خطوں کی آزادی اس صورت میں ممکن ہے کہ تمام کوششیں متحد ہو کر ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر کی جائیں۔ بعد میں ممکنہ رنگروٹوں کو عالمی جہاد میں شرکت کے لیے مدعو کیا جانا تھا۔ چند مہینوں میں ہی اس نئے کھیل کے لیے میدان تیار ہو چکا تھا۔

القاعدۃ جان گئی تھی کہ نظریاتی کاشتکاری کے لیے پاکستان ایک زرخیز زمین ہے۔ ۱۹۷۹ سے اب تک کم از کم چھ لاکھ نوجوان تربیت لے کر افغانستان اور مقبوضہ کشمیر میں لڑ چکے تھے۔ کم از کم ایک لاکھ افراد مختلف جہادی گروپوں کے فعّال کارکن تھے۔ دس لاکھ سے زائد طلبا مختلف دینی مدارس میں زیرِ تعلیم تھے اور پاکستانی مذہبی جماعتوں کے حامیوں کی تعداد بھی لاکھوں میں تھی۔ سوویت یونین کے خلاف افغان جہاد کا سارا کھیل اصلاً پاک فوج کے ہاتھوں میں تھا جو خود بھی اندرونی طور پر انقلابی اثرات سے محفوظ نہیں تھی۔ آرمی کے بہت سے افسر مختلف جہادی تنظیموں کے پیشواؤں، جن میں چکوال کے مولانا اکرم اعوان بھی شامل ہیں، کے ساتھ بیعت تھے۔ پاکستانی فوج میں یہ لوگ "پیر بھائی" گروپ کے نام سے مشہور تھے۔ اگرچہ نائن الیون کے بعد جنرل پرویز مشرف نے پاکستان آرمی سے ان عناصر کو کسی حد تک ختم کر دیا تاہم وہ انقلابی رجحانات کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے میں ناکام رہا۔ یہ انقلابی رجحان پاکستانی سکیورٹی فورسز میں ۱۹۷۹ سے ۲۰۰۱ تک بہت گہری جڑ پکڑ چکا تھا۔ مشرف کے معتوبین میں اس کے انتہائی قریبی دوست اور ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی بھی شامل ہیں۔ القاعدۃ نے جند اللہ جیسی تنظیموں کے

ذریعے دوسروں کے ساتھ ساتھ اسلام پسندوں کے اس متاثر کن ذخیرے کی بیعت و حمایت کو اپنی طرف پھیرنے پر توجہ دی۔

نہایت طاقتور کالعدم شیعہ دشمن تنظیم لشکرِ جھنگوی نے سب سے پہلے القاعدۃ جماعت سے الحاق کیا۔ لشکرِ جھنگوی کالعدم سیاسی جماعت سپاہِ صحابہ پاکستان کا ایک الگ ہو جانے والا گروپ ہے۔ لشکرِ جھنگوی نے درجنوں شیعہ ذاکرین اور شیعہ ماہرین قتل کیے اور ریاست اس کے تمام ارکان کو مطلوب لوگوں کی فہرست میں ڈال چکی ہے۔ طالبان دورِ حکومت میں ان کی اکثریت افغانستان میں چھپی ہوئی تھی اور طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد ان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے القاعدۃ نے لشکرِ جھنگوی کے ارکان کو عالمی جہاد میں واضح کردار سونپا۔ القاعدۃ کی قبائلی علاقوں میں تنظیمِ نو کے بعد جنوبی وزیرستان میں لشکرِ جھنگوی کے ارکان کو خوش آمدید کہا گیا اور پاکستان میں القاعدۃ کی کثیر الجہت کارروائیوں میں مدد کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ لشکر جھنگوی کے ارکان کو شیعہ اہداف کو نشانہ بنانے کی اجازت تھی لیکن بعض ارکان مثلاً قاری ظفر کو لاہور میں ایف آئی اے کے دفاتر پر حملے جیسی القاعدۃ کارروائیوں میں بھی استعمال کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ قاری حسن جیسے رہنماؤں کو القاعدۃ کی امریکہ مخالف کارروائیوں کے لیے فدائی حملوں کے لیے گروپ تیار کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ آہستہ آہستہ یہ حکمتِ عملی مؤثر ثابت ہوئی اور ہزاروں کی تعداد القاعدۃ میں شامل ہوئی۔ ان میں دو معروف بھائی ڈاکٹر اکمل وحید اور ڈاکٹر ارشد وحید، جو پہلے جماعتِ اسلامی میں تھے، بھی شامل ہیں۔ کراچی کے یہ دونوں بہترین ڈاکٹر، جند اللہ کے ذریعے القاعدۃ سے منسلک تھے۔ بعد ازاں ڈاکٹر ارشد وحید وانا میں سی آئی اے کے ڈرون حملے میں مارے گئے اور اس کے فوراً بعد القاعدۃ کے میڈیا ونگ

السحاب نے نئی نسل کو تحریک دینے کے لیے ان کی زندگی پر ایک ڈاکومنٹری جاری کی۔ اسی وجہ سے کئی ایک آرمی افسران القاعدۃ میں شامل ہوئے۔

جولائی ۲۰۱۰ میں پنجابی طالبان کے ایک ترجمان نے اعتراف کیا کہ ارشد اور اکمل وحید کے اثر کی وجہ سے پاکستان کی سب سے بڑی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ میں پھوٹ پڑ چکی ہے۔ خاص طور پر وہ طلبہ تنظیمیں بھی متاثر ہوئی ہیں جن کا تعلق کراچی سے ہے۔ بہت سے طلبہ شمالی وزیرستان میں القاعدۃ کی صفوں میں جاملے۔ اسلامی جمعیت طلبہ ۱۹۴۸ میں جماعت اسلامی کی ایک شاخ کے طور پر قائم ہوئی تھی اور ۱۹۷۰تک ملک کے تمام بڑے تعلیمی اداروں خاص طور پر پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی میں غالب آ چکی تھی۔ پاکستان کے زیادہ تر مڈل کلاس سیاستدان طالب علمی کے زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رکن رہ چکے ہیں۔ ان میں حسین حقانی، جاوید ہاشمی، احسن اقبال، ڈاکٹر بابر اعوان، اور اردو اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے تقریباً اسی فیصد کالم نگار اور ٹاک شوز کے اینکر پرسنز شامل ہیں۔

جب جند اللہ اور ۲۰۰۳-۰۴ میں القاعدۃ کے زیرِ اثر جنوبی وزیرستان میں بننے والی دوسری تنظیمیں مقامی گروپوں کو وسیع تر رہنمائی فراہم کر رہی تھیں، تو ہر ایک حملے کے پیچھے القاعدۃ کا ہاتھ نہیں تھا۔ نظریاتی اختلافات نے القاعدۃ کے لیے مسائل پیدا کر دیے کیونکہ فرقہ پرست جہادیوں نے پاکستان کے معصوم مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا جس طرح عراق میں ہو چکا تھا[1]۔ لیکن ان جہادیوں مثلاً لشکرِ جھنگوی کے ارکان کا نقطۂ نظر بالآخر محدود فرقہ پرستی کے بجائے عالمی مسلم مزاحمتی تحریک کے وسیع منظرنامے میں تبدیل ہو ہی گیا۔

1۔ ان جیسے واقعات کا تسلسل ہی عراق میں القاعدہ کی باغی شدت پسند تنظیم داعش کو پیدا کرنے کا سبب بنا، پاکستان میں موجود ایسے فرقہ پرست جہادیوں نے حال ہی میں داعش کی افغانستان و پاکستان میں موجود شاخ داعش خراسان میں شمولیت اختیار کی ہے۔ مترجم

پاکستانی قبائلی علاقوں میں ہجرت کے بعد القاعدۃ نے ابتدائی طور پر اپنی مساعی کو وسعت دینے کے لیے کوشش کی تاکہ نئے رکن اور حلیف حاصل کیے جائیں۔ تاہم یہ مقابلتاً ایک آسان کام تھا کیونکہ زمین تو بہت پہلے تیار ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں امریکہ اور پاکستان کے بڑھتے ہوئے اتحاد سے بھی القاعدۃ کو بہت فائدہ پہنچا اور پاکستانی فوجی اسٹیبلشمنٹ نے رفتہ رفتہ اسلام پسندوں کو نکال باہر کیا۔ نتیجہ یہ کہ بہت سے حامیانِ پاکستان اسلامی عسکریت پسند جو کشمیر میں انڈین آرمی سے برسرِ پیکار رہے تھے، مشکوک ٹھہرے اور ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ اس وجہ سے بہت سے دوسرے لوگ بھی ہزاروں کی تعداد میں پاکستان سے وفاداری سے منحرف ہوئے اور القاعدۃ سے ہاتھ ملا لیے۔ القاعدۃ نے پھر اپنی حکمتِ عملی کو نئی شکل دینے کے لیے ایک گروپ کا چناؤ کیا جبکہ دیگر ہزاروں افراد نے اسے ایک خالص عسکری گروپ کی بجائے ایک حقیقی اسلامی تحریکِ مزاحمت بننے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

باب دوم

سیاسیاتِ جنگ و امن

القاعدۃ کے نئے کھلاڑی اور ایکشن

۲۰۰۶ کا جارحانہ ظہور: القاعدۃ کا نیا موڑ

طالبان کی نئی حکمتِ عملی

اڈے پر واپسی

امریکا کا غصہ

Af-Pak میدانِ جنگ

تحریکِ طالبان پاکستان: القاعدۃ کی جھول

ایرانی جند اللہ: القاعدۃ کا نیا اتحاد

نیٹو کے واٹرلوُ کی منصوبہ بندی

ایف پاک حکمتِ عملی کی غرقابی کے لیے سوات کا گرداب

نئی بوتل پرانی شراب

القاعدۃ کی پالیسی میں مرکزی اہمیت پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف آپریشن کو نہیں بلکہ افغانستان کو حاصل ہے۔ درحقیقت نائن الیون کے بعد ڈائرکٹر جنرل آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل محمود اور القاعدۃ ممبران کے درمیان ایک خاموش معاہدہ تھا کہ اگر القاعدۃ پاکستان کے مفادات کو نقصان نہ پہنچائے تو پاکستان القاعدۃ کے ساتھ کوئی معاندانہ رویہ نہیں رکھے گا۔ یہ معاہدہ اس وقت ہوا تھا جب محمود نے ملاعمر کو اسامہ بن لادن کی حوالگی پر مائل کرنے کے لیے قندھار کا دورہ کیا تھا۔ امریکی دباؤ میں آکر پاکستان نے ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۳ میں القاعدۃ کے خلاف چند ایک فوجی آپریشن کیے لیکن القاعدۃ ۲۰۰۳ تک اپنے وعدے پر قائم رہی اور پاکستان کی دشمنی سے گریز کیا۔ ۲۰۰۳ میں عسکریت پسندوں [1] نے جنرل مشرف پر حملہ کیا اور اس وقت سے پاکستان اور القاعدۃ کے درمیان مخاصمت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جو اب تک جاری ہے۔

۲۰۰۳ کے آخر میں مشرف کے کانوائے پر دونوں حملے، ۲۰۰۴ میں مارے جانے والے لشکرِ جھنگوی کے سابق رہنما امجد فاروقی کا منصوبہ تھا۔ وہ اس وقت القاعدۃ کے بہت زیادہ قریب تھے لیکن یہ منصوبہ صرف ان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ مشرف پر حملے سے جہادی تنظیموں کے خلاف وسیع پیمانے پر سخت اقدامات شروع ہو گئے۔ صرف چند مہینوں میں خفیہ ایجنسیوں نے ہزاروں جہادی پکڑے اور بلا تفتیش حراستی مراکز میں قید کر دیا۔ اس کے فوراً بعد القاعدۃ نے پاکستان میں دہشت ناک کارروائیوں کی حکمتِ عملی اپنانے کا منصوبہ بنایا اگرچہ یہ فیصلہ بے دلی سے کیا گیا۔

1۔ان میں سے اکثر پاکستانی فوج کے حاضر سروس اہلکار و افسران تھے جیسا کہ بنوں جیل سے چھڑوایا جانے والا مشہور طالبان کمانڈر عدنان رشید۔ مترجم

اس وقت تک القاعدۃ پاکستان کو اپنے عسکری اڈے کے لیے افراد کی بھرتی کا مرکز تصور کرتی تھی نہ کہ میدانِ جنگ کے طور پر جہاں کارروائیاں کی جائیں۔ تاہم جب امریکی دباؤ نے پاکستان کو مجبور کیا کہ القاعدۃ، طالبان اور دیگر عسکری گروپوں کے خلاف جنگ کرے تو القاعدۃ کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ پاکستان میں مدافعانہ کارروائیاں کی جائیں۔ اس حکمتِ عملی سے یہ پیغام دیا گیا کہ اگر امریکہ عسکری ذرائع کی مدد سے پاکستان پر دباؤ ڈال سکتا ہے تو عسکریت پسند بھی اس طرح کے حملوں کی برابر اہلیت رکھتے ہیں کہ پاکستان کے مستقبل کا رخ تبدیل کر دیں۔ اس حکمتِ عملی سے یقینی طور پر امریکی وار آن ٹیرر پر پاکستانی حمایت میں نمایاں کمی ہوئی۔ جیسے جیسے جنگ نے طول پکڑا، عسکریت پسندوں کی طاقت بڑھتی گئی اور پاکستان مجبور ہو گیا کہ انہیں سنجیدہ فریق کے طور پر تسلیم کرلے۔ پاکستان ان کے ساتھ بیٹھنے اور عارضی صلح کی شرائط طے کرنے پر مجبور ہو گیا۔

بعد ازاں یہ نیم دلانہ حکمت عملی ٹھوس منصوبہ بندی کی صورت اختیار کر گئی جس میں القاعدۃ نے اپنی جنگ کی راہ وضع کی۔ اس حکمتِ عملی کی تین نمایاں خصوصیات تھیں:

ا۔ پاکستانی قبائلی علاقوں میں اپنے گروپوں کی تنظیمِ نو کی جائے اور پاکستان آرمی کے خلاف مدافعانہ جنگی حکمتِ عملی ترتیب دی جائے۔

۲۔ اصل میدانِ جنگ یعنی افغانستان میں جانے سے پہلے پاکستان کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدوں کے ذریعے تنظیمِ نو کے کام کو محفوظ کیا جائے۔

۳۔ پھر جنگ کو پاکستان میں (۲۰۰۷ تک پاکستان القاعدۃ و طالبان کے خلاف جنگ میں امریکہ کا خاص فرنٹ لائن اتحادی بن چکا تھا اس لیے جنگ کو امریکی و نیٹو اتحاد کے مفادات اور اس کے اتحادیوں یعنی پاک فوج کے خلاف) بھی پھیلایا جائے اور پھر یہاں سے

وسط ایشیائی ریاستوں سے امریکہ تک میدانِ جنگ میں وسعت کی حکمتِ عملی وضع کی جائے تاکہ افغانستان میں نیٹو افواج کو شکستِ فاش دی جاسکے۔

اس حکمتِ عملی پر عمل کرنے کے لیے القاعدۃ نے قبائلی پٹی میں اپنی فوجوں کو منظم کیا اور نئے عسکری ڈھانچے وضع کیے اور پھر ان ڈھانچوں کی تشکیل کو وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک وسعت دی۔

مارچ ۲۰۰۴ میں امریکی دباؤ کے زیرِ اثر پاکستان آرمی کے ہزاروں دستوں نے جنوبی وزیرستان کی تحصیل وانا میں کلوشہ آپریشن شروع کیا۔ وہ اس غلط فہمی میں تھے کہ ایک مختصر، سریع الحرکت اور شدید آپریشن عسکریت پسندوں کا صفایا کر دے گا۔ لیکن ۲۰۰۳ اور ۲۰۰۴ کے پچھلے آپریشنز کی نسبت اس مرتبہ القاعدۃ اور اسکی اتحادی جہادی قوتیں بہت فعّال تھیں۔ آرمی کو اس طرح کے شدید ردِ عمل کی توقع ہی نہیں تھی، یہ آپریشن ناکام ہو گیا۔ عسکریت پسندوں نے فوجی دستوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔ پاکستانی افسر اور جوان گھیر کر پکڑ لیے گئے اور قبائلی لڑکوں نے زیرِ حراست افسروں اور جوانوں کو تھپڑ مارتے ہوئے مسلح افواج کے فخر و غرور کی سرکاری اور عوامی تذلیل کی۔ آخر کار پاکستان آرمی نے ہتھیار ڈال دیے اور جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ جنوبی وزیرستان میں یہ القاعدۃ کی(حکمت عملی کی) پہلی کامیابی تھی۔ عسکریت پسندوں نے یہ درمیانی عرصہ امریکہ اور اس کے پاکستانی حلیفوں کے خلاف اپنی کوششیں مضبوط کرنے میں صَرف کیا۔ آنے والے وقتوں میں جنگ بندی کے اس طرح کے کئی معاہدے القاعدۃ کی وسیع جنگی حکمتِ عملی کے عین مطابق تھے۔ عسکریت پسندوں نے جنگ کو ایک سے دوسرے علاقے میں منتقل کیا اور اپنی پسند کے میدانِ کارزار کے تعین کے لیے اپنی صلاحیتوں کو نکھارا۔ نیک محمد وانا کے ہیرو بن کر ابھرے۔ انہوں نے القاعدۃ کے ارکان کو پاکستانی فوج کی بربریت سے بچایا اور کلوشہ آپریشن

کے دوران ازبکستان اسلامی تحریک کے سربراہ قاری طاہر یلدوشف کی زندگی بچائی۔ یہ پہلا آپریشن تھا جس میں غیر ملکی جنگجوؤں کو واضح طور پر اصل کھلاڑی تسلیم کیا گیا۔

القاعدۃ کے نئے کھلاڑی اور ایکشن

شکئی معاہدے سے القاعدۃ کی الف لیلۃ میں کئی نئے کرداروں کا ظہور ہوا۔ ان میں سب سے واضح قاری طاہر تھے۔ انہوں نے بعد ازاں عبد اللہ محسود اور بیت اللہ محسود جیسے قبائلی جنگجو رہنماؤں کی مدد سے پچیس سو ازبکوں کا لشکر تیار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ازبکوں نے پاکستانی جنگجوؤں کو دہشت کی فضا قائم کرنے کے لیے نئی سفاکیت سکھائی۔ دشمن کے گلے کاٹنا ان کا عام جنگی مشغلہ تھا[1]۔ معاہدے پر دستخط کرنے والوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اہم ہے۔ سرکاری دستاویزات میں نیک محمد کو مجاہد کہا گیا ہے۔ دستاویزات کے مطابق شکئی معاہدے کے اہم فریق یہ تھے:

محمد معراج الدین، مولانا عبد المالک، مولانا اختر گل، محمد عباس، نیک محمد، حاجی شریف، نور اسلام، بیت اللہ محسود، محمد جاوید، محمد عالم عرف عبد اللہ

مولانا معراج الدین اور مولانا عبد المالک متحدہ مجلسِ عمل کے پارلمنٹیرین تھے۔ مولانا اختر گل طالبان حمایتی مقامی مولوی تھے۔ محمد عباس، نیک محمد، حاجی شریف، نور اسلام اور محمد جاوید خالصتاً جنگجو تھے۔ عبد اللہ محسود پاکستانی طالبان کے اعلیٰ رہنما تھے۔ اس فہرست پر ایک سرسری نظر سے ہی واضح ہوتا ہے کہ ۲۰۰۴ میں القاعدۃ اور طالبان کے سیاسی اتحاد نے

1۔ انہی وجوہات کی وجہ سے القاعدہ نے اور اس میں شامل کئی ازبک عسکریت پسندوں نے اس تنظیم یعنی حرکت اسلامی ازبکستان سے دوری اختیار کر لی بعد ازاں داعش کی خلافت کے اعلان کے بعد یہ تنظیم داعش میں شامل ہوگئی اور افغان طالبان کے خلاف بغاوت کی وجہ سے طالبان کے حملے میں اس تنظیم کے اکثر جنگجو مارے گئے اور باقی قیادت پکڑی گئی۔

مترجم حکومت کے حمایتی قبائلی رہنماؤں کا مقام اور حیثیت تبدیل کر دی تھی۔ معاہدے کے اہم نکات یہ تھے:

أ. حکومت تمام قیدیوں کو رہا کرے گی۔

ب. حکومت آپریشن میں شہید ہونے والوں کی دیت ادا کرے گی۔

ج. فوجی آپریشن میں ہونے والے ضمنی نقصان کا معاوضہ بھی حکومت ادا کرے گی۔

د. حکومت نیک محمد اور دوسرے مطلوب افراد کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے گی۔

ہ. حکومت غیر ملکی مجاہدین کو پر امن طور پر وزیرستان میں رہنے کی اجازت دے گی۔

اس کے بدلے میں:

أ. مجاہدین حکومتِ پاکستان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے۔

ب. وزیرستان کے مجاہدین افغانستان کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔

غیر ملکیوں کی رجسٹریشن والی دفعہ کی متضاد تشریحات کی وجہ سے یہ معاہدہ ناکام ہو گیا۔ حکومت کا کہنا تھا کہ جنگجوؤں کو "غیر ملکی جنگجو" کے طور پر رجسٹر کیا جائے گا اور انہیں گرفتار کیا جائے گا۔ جنگجوؤں کے مطابق معاہدے میں ایسی کوئی شق موجود نہیں۔ اس سے تنازعات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ پاکستانی فوج نے جنوبی وزیرستان میں ایک اَور آپریشن شروع کر دیا۔ تاہم القاعدۃ ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے تیار تھی۔ آپریشن کے خلاف پہلا ردِ عمل کراچی میں شروع ہوا جہاں کمانڈر جنرل احسن سلیم حیات پر حملہ کیا گیا۔ جنرل احسن تو بچ گیا لیکن اس کے ارد گرد کئی فوجی مارے گئے۔ حملے کی ذمہ داری جند اللہ کراچی گروپ پر ڈالی گئی۔ حملہ آور گرفتار ہوئے اور حکومت نے ۱۹ جون ۲۰۰۴ کو امریکی ڈرون حملے میں نیک محمد کے مارے جانے کے بعد عسکریت پسندی کے خلاف زیادہ سنجیدہ اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا۔ معاہدے کی مدت پچاس دن سے بھی کم تھی لیکن اس کے اثرات دور رس تھے۔

أ۔ ناراض قبائلی ایک طاقتور جنگجو گروپ بن گئے۔

ب۔ حکومت نے وار آن ٹیرر کے امریکی ایجنڈے کی حمایت کی اور حالات کو عسکری رنگ دیا۔

ج۔ جنگجوؤں کو ہم پلہ فریق کی حیثیت دی گئی جو قبائل کے لیے بلند تر رتبہ تھا۔

نیک محمد کی شہادت ایک داستان کا اختتام تھا لیکن القاعدۃ اسی حیثیت کے نئے کرداروں کی پرورش کر چکی تھی جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتے گئے اور القاعدۃ کے نئے آفاق روشن کرتے گئے۔

نیک محمد کے جانشین بننے والے حاجی عمر پچاس کے پیٹے میں تھے۔ وہ بھی اسی قبیلے سے تھے لیکن القاعدۃ وراثتی قیادت پر یقین نہیں رکھتی، خاص طور پر حاجی عمر کے معاملے میں، کیونکہ اتنے عمر رسیدہ تھے کہ القاعدۃ کی سٹریٹیجی کے مطابق نہیں ڈھل سکتے تھے۔ القاعدۃ نیک محمد کی طرح کے کسی نوجوان کی تلاش میں تھی۔ بالآخر القاعدۃ قیادت نے عبد اللہ محسود اور بیت اللہ محسود کا انتخاب کیا۔ ازبک جنگجو قاری طاہر یلدوشف ان دونوں کے بہت قریب تھے۔ نیک محمد کی طرح ان دونوں کا پس منظر معمولی سا تھا لیکن ان کا تعلق محسود قبائل سے تھا۔ وزیر قبائل کے برعکس محسود قبائل ہمیشہ سے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے بہت قریب رہے ہیں۔ عام قبائلیوں کے برعکس یہ تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے قبائل ہیں۔ ان کی شمولیت میں پیسے کا کوئی کردار نہ تھا۔ قاری طاہر نے پچیس سے زائد ازبکوں کی ملیشیا سے ان کی مدد کی اور انہوں نے غارت گری کے نئے کلچر کو فروغ دیا۔

۱۹۷۴ میں جنوبی وزیرستان کے گاؤں نینو میں پیدا ہونے والے عبد اللہ محسود کا اصل نام محمد عالم محسود تھا۔ وہ جنوبی وزیرستان کے محسود قبیلے کے سلیمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے پشاور سے ڈی کام کیا تھا۔ عبد اللہ محسود افغانستان میں امریکی اور شمالی اتحادی فوجوں

کے خلاف لڑ چکے تھے اور ۱۹۹۶ میں ایک بارودی سرنگ سے ان کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی تھی۔ امریکی حملے کے بعد قندوز کی جنگ میں انہوں نے دسمبر ۲۰۰۱ میں ازبک جنگی سردار عبدالرشید دوستم کو سرنڈر کیا۔ پھر انہیں امریکہ کے حوالے کر دیا گیا اور گوانتانامو بے کے حراستی کیمپ میں پچیس ماہ تک قید رکھا گیا اور وہیں پر ان کی مصنوعی ٹانگ بھی لگائی گئی۔ بعد میں امریکہ نے محسود کو رہا کر دیا اور جنوبی وزیرستان واپس لوٹا دیا۔ قید وبند کی صعوبتوں سے القاعدۃ اور طالبان کے ساتھ ان کی وفاداریوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جنوبی وزیرستان واپس آنے پر عبداللہ محسود قاری طاہر کے قریب ہو گئے اور قاری طاہر نے انہیں پاکستانی سکیورٹی فورسز کے خلاف کھڑا کیا۔ پھر آپ طالبان (اور القاعدہ) کے ساتھ مل کر نیٹو کے خلاف لڑنے کے لیے ہلمند چلے گئے لیکن وہاں سے واپسی پر سکیورٹی فورسز کے گھیرے میں آ گئے۔ انہوں نے سرنڈر کرنے سے انکار کر دیا اور خود کو ایک ہینڈ گرنیڈ سے اڑا لیا۔

بیت اللہ محسود ۱۹۷۴ میں بلوچستان کے ضلع بنوں کے گاؤں لنڈی ڈھوک میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق محسود قبیلے کی شاخ شبی خیل سے تھا اور آپ پانچ بھائی تھے۔ مذہب سے گہرے لگاؤ کی بنا پر بیت اللہ محسود نے میڈیا پر آنے اور تصاویر بنوانے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ آپ نے کوئی رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے۔ مدرسہ کے طالب علم کے طور پر آپ نے طالبان کی نفاذِ شریعت اور شمالی اتحاد کے خلاف جنگ میں مدد کے لیے اکثر افغانستان کا سفر کیا۔ نیک محمد کی وفات کے بعد آپ ایک بڑے قبائلی مذہبی رہنما بن کر ابھرے۔

طالبان کے پانچ بڑے کمانڈروں کی ایک تقریب میں، جن میں ملا داداللہ بھی شامل ہیں، بیت اللہ محسود کو محسود علاقے میں ملا عمر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں آپ قاری طاہر کے قریبی ساتھی بنے اور طاہر کی نظریاتی وابستگی نے بیت اللہ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

القاعدۃ کو بیت اللہ محسود کے طریقۂ کار سے تھوڑا بہت اختلاف تھا لیکن اس کے پاس کوئی اور انتخاب بھی نہیں تھا کیونکہ بیت اللہ محسود شمالی اور جنوبی وزیرستان میں جہادی تحریک کے رہنما تھے۔ محسود کو ۲۰۰۹ میں ڈرون حملے میں شہید کیا گیا۔ عبد اللہ محسود اور بیت اللہ محسود میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور عبد اللہ کو بیت اللہ کے حق میں کمانڈرشپ سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے باوجود دونوں جنگجوؤں نے اپنے اپنے علاقوں سے قبائلی سرداروں کو بھگا کر قبائلی نظم و ضبط کی تباہی میں اہم کردار ادا کیا۔ پھر وہ اس علاقے کے سب سے بڑے جنگجو سردار کے طور پر ابھرے۔

پاکستانی حکومت ایک دفعہ پھر سرنڈر کرنے پر مجبور ہو گئی، اس دفعہ اس نے جنگجو قبیلے محسود کے سامنے سرنڈر کیا۔ فروری ۲۰۰۵ میں سراروغہ امن معاہدے کی شکل میں اس سرنڈر کی اہم شرائط لکھی گئیں۔ یہ معاہدہ طالبان دوست محسود قبیلے اور حکومتِ پاکستان کے مابین جنوبی وزیرستان میں سراروغہ ۷ فروری ۲۰۰۵ کو مقامی جرگے کے توسط سے ہوا۔ یہ چھ نکاتی معاہدہ باقاعدہ تحریری شکل میں تھا جس میں لکھا تھا کہ:

- بیت اللہ محسود اور اس کا گروپ علاقے میں موجود کسی غیر ملکی جنگجو کی حمایت نہیں کرے گا۔
- بیت اللہ اور اس کے حامی کسی حکومتی ادارے یا املاک پر حملہ نہیں کریں گے اور ترقیاتی کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کریں گے۔
- حکومت بیت اللہ اور اس کے ساتھیوں کی پچھلی سرگرمیوں کا مواخذہ نہیں کرے گی۔ تاہم آئندہ اگر کسی بھی قسم کی دہشت گردانہ اور مجرمانہ سرگرمی میں ملوث پائے گئے تو فاٹا قوانین کے مطابق ان سے نمٹا جائے گا۔ اگر کوئی مجرم محسود علاقے میں ہوا تو وہ حکومت کے حوالے کیا جائے گا۔

قبائل کی طرف سے معاہدے میں لکھا گیا کہ:

- ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اگر کوئی مجرم اس علاقے میں پایا گیا تو محسود قبیلہ اسے حکومت کے حوالے کر دے گا اور حکومت کے پاس اختیار ہے کہ ایف سی آر قوانین کے مطابق ایکشن لے۔
- وہ تمام مسائل جن کا اس معاہدے میں ذکر نہیں ہے، سیاسی انتظامیہ اور محسود قبائل کے مابین باہمی مشاورت سے حل کیے جائیں گے۔
- اگر کسی بھی شق کی خلاف ورزی ہوئی تو سیاسی انتظامیہ قانونی کارروائی کرنے میں با اختیار ہے۔

اس معاہدے پر بیت اللہ محسود اور جرگے کے ممبران (ملک عنایت اللہ خان، ملک قیوم شیر، ملک شیر بہادر) نے دستخط کیے۔ اس امن معاہدے پر کچھ تبصرہ:

- اس معاہدے میں سرحد پار آنے جانے یا افغانستان میں حملوں سے متعلق کوئی شق شامل نہیں تھی۔
- اس معاہدے میں کوئی ایسی شق نہیں تھی کہ غیر ملکی جنگجو سرنڈر کر دیں گے۔
- کوئی شق نہیں تھی کہ جنگجو ہتھیار رکھ دیں گے۔
- امن مذاکرات کے دوران جنگجوؤں کو رقوم کی ادائیگی کی خبروں پر اختلافات پیدا ہو گئے۔
- عبد اللہ محسود دوسرے بڑے کمانڈر تھے لیکن وہ اس معاہدے میں شامل نہ تھے۔

تکنیکی طور پر ۲۰۰۴ کے شکئی معاہدے سے القاعدۃ کو نئی زندگی مل گئی جس کے بعد القاعدۃ نے مقامی قبائلی اتحادیوں سے اپنے تعلقات مضبوط بنائے اور جنگ کے لیے جن جن علاقوں کی ضرورت تھی وہاں تک اپنے بازو پھیلائے۔ جنوبی وزیرستان کا مکمل کنٹرول حاصل

کرنے کے بعد القاعدۃ کے پاس کارروائیوں کے لیے وسیع اڈے تھے۔ قبائلی خطے اور پاکستانی شہروں میں القاعدۃ کے نیٹ ورک کی اثر پذیری کی ضرورت تھی تاکہ نئی بھرتیوں کی مسلسل فراہمی کے لیے وسعت پیدا کی جائے تاکہ ایسے گروہ بنتے رہیں جو افغانستان میں جنگ اور پاک امریکہ اتحاد کے خلاف اپنا کردار ادا کریں۔ صرف اسی صورت میں القاعدۃ افغانستان میں اطمینان کے ساتھ جنگ لڑ سکتی تھی۔ القاعدۃ کی چالوں نے مستقبل کی لڑائیوں کا رخ تبدیل کر دیا۔

جنوبی وزیرستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمانے کے بعد القاعدۃ کے نظریہ ساز شمالی وزیرستان کے قصبے رزمک میں منتقل ہو گئے۔ جنوبی وزیرستان کی بجائے شمالی وزیرستان میں کارروائیاں کرنے کے لیے زیادہ مواقع میسر تھے۔ جنوبی وزیرستان طالبان کے لیے ہلمند صوبے کی چوکی کی حیثیت رکھتا تھا اور براہِ راست افغان طالبان کے کنڑول میں تھا۔ شمالی وزیرستان کی صورتحال مختلف تھی۔ یہاں کے زیادہ تر جنگجو تنہا کارروائیوں میں ملوث تھے۔ لہٰذا شمالی وزیرستان کو القاعدۃ کے عالمی ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کیا گیا۔

جلال الدین حقانی سوویت کے خلاف ایک مثالی جنگجو تھے۔ انہوں نے طالبان کی اطاعت کا عہد کیا لیکن ۱۹۹۴ میں افغان جنگجو سرداروں کے خلاف طلبہ ملیشیا کے طور پر ابھرنے والی طالبان تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں بنے۔ امریکی حملے کے بعد بھی حقانی طالبان کے ساتھ وابستہ رہے لیکن اب بھی نیٹو دستوں کے خلاف لڑائی میں اپنی حکمتِ عملیاں وہ ذاتی طور پر خود ترتیب دیتے۔ البتہ ان کے صاحبزادے نصیر الدین حقانی اور سراج الدین حقانی مقامی عرب جنگجوؤں کے بہت قریب تھے۔ جنوبی وزیرستان کے برعکس، جہاں نظریاتی ہم آہنگی کے باوجود محسود اور وزیر قبائل میں اختلافات ہوتے رہتے تھے، شمالی وزیرستان صرف

وزیر قبائل پر مشتمل تھا۔ داور قبیلہ بھی شمالی وزیرستان ہی میں ہے لیکن وزیر قبائل کا مطیع ہونے کی وجہ سے کبھی ان کی مخالفت نہیں کرتا۔

القاعدۃ جانتی تھی کہ امریکی دباؤ میں پاکستان لازمی طور پر مزید آپریشن کرے گا اور آخرکار جنگ ان قبائل میں بھی پھیل جائے گی جہاں امریکہ براہِ راست القاعدۃ کے پیروکاروں کے آمنے سامنے ہو گا۔ اس لیے القاعدۃ نے مضبوط نظریاتی قلعوں کا ایک سلسلہ تعمیر کرنا شروع کر دیا کہ اگر امریکہ اور اس کے اتحادی ایک قلعہ مسخر کر لیں تو جدوجہد ختم نہ ہو جائے۔ القاعدۃ کا ہدف یہ تھا کہ قبائلیوں کو حکومتِ پاکستان کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھولنے پر راضی کیا جائے۔

شمالی وزیرستان میں جلال الدین حقانی ایک مرکزی طالبان جنگجو تھے۔ پاکستانی آئی ایس آئی نے ان سے رابطہ کیا اور انہیں یقین دہانی کرائی کہ شمالی وزیرستان میں فوجی کارروائیاں سطحی نوعیت کی ہیں اور ایک دفعہ حالات بدلے تو پاکستان دوبارہ طالبان کی حمایت کرے گا۔ حقانی نے اس بات پر اعتبار کر لیا اور پاکستان کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے باز رہے۔ تاہم القاعدۃ اپنے ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۳ کے سابقہ تجربات کی بنیاد پر یہ بات جانتی تھی کہ بڑھتے ہوئے امریکی اثرورسوخ کی وجہ سے پاکستان ایک وقت طالبان کے خلاف حقیقی جنگ لڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہی فہم و ادراک ستر سالہ شیخ عیسیٰ کو شمالی وزیرستان لے آیا۔ شیخ عیسیٰ نے کسی بھی بڑے مجاہد رہنما سے بات نہیں کی۔ اس کے بجائے انہوں نے داور قبیلے کے دو علماء مولانا صادق نور اور عبد الخالق حقانی کا انتخاب کیا اور انہیں اس بات پر قائل کیا کہ امریکہ اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ پاکستانی فوجیں تو بدتر ہیں کہ یہ پیدائشی مسلمان ہونے کے باوجود امریکی اور اسرائیلی ایجنڈے کی حامی ہیں۔

مولوی صادق نور اور عبد الخالق حقانی کے پاکستانی فوجوں کے خلاف خطباتِ جمعہ سے شمالی وزیرستان کے قصبے میر علی اور درپہ خیل القاعدۃ کے قلعوں میں تبدیل ہو گئے۔ وسیع منظر نامے کی یہ صرف ہلکی سی جھلک تھی۔ اعلیٰ سطح کی پیش رفتوں کا انتظام خفیہ ہاتھ کر رہے تھے۔ ایک سطح پر تو القاعدۃ کے نظریہ ساز مقامی قبائلیوں اور جنگجو سرداروں کے ذہنوں اور دلوں پر حکمرانی کر رہے تھے اور دوسری سطح پر القاعدۃ کے ماہر حربیات نے پوشیدہ طور پر مقامی جنگجو سرداروں کو مجاہدین کی جماعت سے اجتماعی قوت جمع کرنے کی ہدایت کی اور قبائلی روایات کی بجائے نظریاتی بنیادوں پر تعلقات مضبوط کرنے پر زور دیا۔

دسمبر ۲۰۰۵ میں شمالی وزیرستان میں پاکستانی طالبان نے کئی ڈاکوؤں کو قتل کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ طالبان اس علاقے کی سکیورٹی سنبھال چکے ہیں۔ ماضی میں طالبان نے مقامی معاملات سے خود کو دور رکھا تھا جس کی وجہ سے دونوں وزیرستان منشیات کے اسمگلروں، گاڑی چوروں، غنڈوں اور بچوں کے اغواکاروں کی آماجگاہ بن چکے تھے۔ یہ مجرم زیادہ تر پاکستانی شہروں میں جرم کرتے اور پھر وزیرستان میں اپنے دیہات میں پلٹ جاتے۔ تاہم اب یہ لوگ قبائلی علاقوں میں بھی بدنظمی شروع کر چکے تھے۔ یہ لوگ دوسرے دیہات پر حملے کر کے لوٹ مار اور غارت کرتے اور ناکے لگا کر تمام مسافروں سے پیسے وصول کرتے۔ چونکہ طالبان افغانستان میں نیٹو اور امریکہ کے خلاف جہاد میں مصروف تھے لہٰذا انہوں نے ان سرگرمیوں پر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ تاہم اب القاعدۃ چاہتی تھی کہ طالبان مقامی سیاست میں شامل ہوں تاکہ قبائلی علاقوں کو اپنے سٹریٹجک اڈے میں تبدیل کرنے کی حکمتِ عملی کی تطبیق ہو جائے۔ اس لیے پہلی دفعہ طالبان نے کھلے عام اعلان کر دیا کہ پاکستانی فوج، مقامی غنڈوں اور قبائلی عمائدین کے بجائے اس خطے کے معاملات وہ سنبھالیں گے۔ انہوں نے عوام کے سامنے تیس لٹیروں کو قتل کیا،

ان کی لاشوں کو بازاروں میں گھمایا، ان تمام مناظر کی فلم بندی کی اور ایشیا ٹائمز آن لائن پر اسے ریلیز کر دیا۔ صدر بش کے دورۂ پاکستان کے ایک ماہ قبل فروری ۲۰۰۶ میں ریلیز ہونے والے ان مناظر نے دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ میڈیا نے مصنف سے یہ فوٹیج حاصل کی اور انٹرنیشنل ٹی وی چینلز پر چلایا۔ افغانستان سے پسپائی کے تھوڑے عرصے بعد ہی طالبان اور القاعدۃ نے شمالی وزیرستان میں اسلامی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا اور جرائم اور برائیوں سے نبٹنے کے لیے طالبان پولیس کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بیرونی دنیا نے شمالی وزیرستان کی اسلامی ریاست کی تشکیل کو محض ایک سادہ پیش رفت خیال کیا لیکن القاعدۃ نے بہت پہلے ہی اس خطے میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے قبائلی علاقوں کا انتخاب کر لیا تھا۔ القاعدۃ کا بڑا منصوبہ اسی طرز پر تنظیمِ نو کرتے ہوئے تمام قبائلی علاقوں کے لیے زمین ہموار کرنا تھا تاکہ بلوچستان اور خیبر پختونخوا تک توسیع سے پہلے یہ علاقے مکمل طور پر فعال قلعوں کا کام دے سکیں۔ اس طرح القاعدۃ پاکستان میں نیٹو سپلائی لائن کو مکمل طور پر منقطع کر کے مغربی اتحادیوں کو ایک طویل جنگ پر مجبور کر سکتی تھی۔ بہر حال، اصل میدان جنگ ہمیشہ افغانستان ہی رہا۔ ۲۰۰۵ میں شمالی اور جنوبی وزیرستان میں حاصل کردہ فوائد کا مقصد بلاشبہ افغان طالبان کو امریکہ اور نیٹو فورسز کے خلاف جنگ میں فائدہ پہنچانا تھا۔ وہ کہانی جو نائن الیون کے بعد وسیع تر نظریاتی تبلیغ و تشہیر کے لیے القاعدۃ کی قبائلی علاقوں میں ہجرت سے شروع ہوئی اس کا مقصد صوبہ ہلمند اور پھر پورے جنوب مغربی افغانستان میں فتح حاصل کرنا تھا۔

القاعدۃ نے اس بات کو یقینی بنایا کہ طالبان مالی وسائل، حکمتِ عملی، افراد اور تنظیم شدہ کمانڈ سسٹم کے ساتھ افغانستان واپس آئیں۔ ۲۰۰۶ کے موسم گرما میں افغانستان میں طالبان کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں نے مغربی اتحاد کو خطرے میں مبتلا کر دیا۔ ۲۰۰۶ کی گرمیوں کی

جنگ نے صحیح معنوں میں انہیں گھبراہٹ سے دوچار کیا کیونکہ انہیں ذرا سا بھی علم نہیں تھا کہ قبائلی علاقوں کے اندھیروں میں کیا کیا پیش رفتیں واقع ہو چکی ہیں۔ وہ اس خوش فہمی میں تھے کہ طالبان اور القاعدۃ کی کمر ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکی ہے۔ ۲۰۰۶ میں القاعدۃ کی مدد سے طالبان کی واپسی نے جنگجوؤں کو اہم علاقائی کھلاڑی بنا دیا۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ طالبان کی ۲۰۰۶ میں کامیاب جارحیت القاعدۃ کا ایک اہم موڑ تھا۔ اس کے بعد ۲۰۰۷ اور ۲۰۰۸ میں القاعدۃ واضح طور پر پاکستان میں چھائی رہی، ۲۰۰۸ کے آخر میں اپنی کارروائیوں کو انڈیا تک پھیلایا اور ۲۰۱۰ میں چیچنیا میں محاذ کھولا۔ اس طرح ۲۰۰۶ کے ظہور سے پہلے بعد میں ہم دیکھتے ہیں کہ القاعدۃ افغان طالبان کو آزادانہ کارروائیاں کرنے اور پسپائی کی چالیں اختیار کرنے کے لیے مواقع فراہم کرتی رہی۔ لیکن در حقیقت ۲۰۰۶ کی جارحانہ کارروائیاں امریکہ پر دباؤ ڈالنے کی ایک منصوبہ بندی تھی اور اس کے انتظامات بہت اچھی طرح کیے گئے تھے۔

۲۰۰۶ کا جارحانہ ظہور: القاعدۃ کا نیا موڑ

شمالی اور جنوبی وزیرستان میں غیر معمولی پیش رفتیں ہو چکی تھی۔ القاعدۃ نے خاموشی سے خود کو یہاں از سرِ نو تخلیق کیا اور اس فائدے کو افغان طالبان تک منتقل کر دیا تاکہ وہ نیٹو افواج کا حلقہ تنگ کر دیں جو افغانستان کو آسان شکار سمجھتی ہیں۔ یہ وہ سنگِ میل تھا جسے القاعدۃ نے اپنے اہداف حاصل کرنے کے لیے عبور کیا۔ القاعدۃ نے یہ حالات ۲۰۰۲ سے ۲۰۰۵ تک پیدا کیے تاکہ ۲۰۰۶ میں طالبان افغانستان میں متاثر کن واپسی کے قابل ہو سکیں۔ یہ واپسی طالبان کی ۲۰۰۶ کی جارحانہ واپسی کی لرزہ خیز کہانی سناتی ہے جس میں نئے کرداروں کا ظہور ہوا۔ انہوں نے اس دنیا کو حیران کر دیا جو یہ خیال کرتی تھی کہ طالبان ماضی کا قصہ ہیں۔

۲۰۰۶ میں القاعدۃ سب کچھ تھی لیکن منظر سے غائب تھی۔ اس کے تانے بانے سے طالبان کی چادر بنی گئی اور اس کا فوری مقصد افغانستان میں طالبان کا شاندار ظہور تھا۔ اس مقصد کے حصول کے بعد اگلی حکمتِ عملی آنا تھی۔ اسی دوران، پاکستانی قبائلی علاقوں میں طالبان کی تنظیمِ نو اور عراقی مزاحمت سے روابط کے ساتھ ساتھ جنوب مغربی افغانستان میں طالبان و القاعدہ قیادت نے ۲۰۰۵ کا زیادہ تر عرصہ آئندہ جارحیت کے لیے تیاری میں گزارا۔ ان تیاریوں میں عراقی مزاحمت (عراقی القاعدہ اور دوسری عراقی جہادی جماعتیں) کے سر دو گرم چشیدہ ابطال کے گروپ سے کثیر الواقع تربیتی ورکشاپوں کا تبادلہ بھی شامل تھا۔ عراقیوں اور پاکستانیوں نے مل کر حربی کارروائیوں کا ایک منصوبہ تیار کیا جسے بعد میں طالبان فوجوں نے وزیرستان میں استعمال کرنا تھا۔ یہ جنگی حربے مختلف بکھرے مسلح پشتون قبائلیوں اور نظریاتی طور پر متحرک سپاہیوں میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیے گئے۔ عرب، ازبک، چیچن اور افغانی لڑاکے (امریکی حملے کی ابتداء میں) قندھار کی شکست کے بعد چھوٹے چھوٹے عارضی اڈوں پر دوبارہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ معسکرات شمالی اور جنوبی وزیرستان کے عین قلب میں تھے۔

افغانوں کو کرزئی حکومت اور اس کے مغربی اتحادیوں کے خلاف فوری مزاحمت پر قائل کرنے کی بجائے جنوب مغرب میں طالبان گروپوں کو منظم کرنے کی دانشمندی کا نتیجہ ۲۰۰۶ کا کامیاب جارحانہ ظہور تھا۔ اگرچہ پہلے اس ناپاک طبقے کی چھان بین کرنا ضروری تھی جو بار بار طالبان گروپوں کی تباہی کا باعث بنا۔ ان دونوں قبائلی علاقوں میں دو بالکل مختلف گروپوں کی تنظیمِ نو اور نقل و حرکت القاعدہ، ملا عمر اور طالبان کی مرکزی قیادت کا اولین مقصد بن گیا تھا۔ نتیجہ یہ مقصود تھا کہ (ان مراکز سے) جنوب مغربی افغانستان میں طاقتور امریکی جنگی مشینری پر جان لیوا ضرب لگائی جائے اور مسحور عالمی ناظرین پر جنوبی افغانستان اور

ملحقہ قبائلی علاقوں پر کنٹرول کا اعلان کیا جائے۔ اس سے طالبان کی واپسی اور القاعدۃ کے مرکزی علاقائی طاقت بننے کے لیے راہ ہموار ہو گی۔ غوغا آرائی اور تشہیر کے باوجود ۲۰۰۶ کی واپسی کے آغاز میں معمول کی محدود جھڑپوں کے سوا کچھ نہ ہوا۔ وانا میں یہ خیال عام تھا کہ طالبان کا تشہیر کردہ ۲۰۰۶ کا جارحانہ ظہور جلد ہی دم توڑ جائے گا، جاری مزاحمت موسمِ گرما سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی اور جہادیوں کے پیدا کردہ طالبان طاقِ نسیاں کی زینت بن جائیں گے۔

مئی ۲۰۰۶ کے آخر میں طالبان سنٹرل کمانڈ کی طرف سے بظاہر ایک غیر اہم اور معمولی سفیر کے وزیرستان دورے سے طاقت کا توازن یکسر بدل گیا۔ یہ سفیر ایک ٹانگ والے فوجی کمانڈر تھے جو اپنی سفارتی مہارتوں کی وجہ سے بہت معروف تھے۔ علاقے میں ان کی موجودگی نے طالبان کی تقدیر کا رخ بدل دیا۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ ملا داداللہ تھے اور جنوب مغربی علاقے کے فوجی کمانڈروں میں ان کا نام اب بھی بڑی تعظیم سے لیا جاتا ہے۔ طالبان کے ۲۰۰۶ کے جارحانہ ظہور کی تیاریاں ایک سال قبل شروع ہو چکی تھیں۔ طالبان نے کابل کی سیاسی قیادت کے مختلف عناصر سے تعلقات بحال کرنے پر توجہ دی قطع نظر اس بات کے کہ وہ امریکی حامی تھے یا مخالف۔ پورے افغانستان کے نیم خود مختار جنگی سرداروں کی جانب بھی سفیر بھیجے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجاہدین کے عسکری گروپوں میں دو اہم ترین گروپوں سے سٹریٹجک تعلقات کا آغاز کیا گیا۔ ان میں سے ایک گلبدین حکمت یار کا حزبِ اسلامی افغانستان اور دوسرا مولوی یونس خالص (یونس خالص القاعدہ اور طالبان سے قریبی تعلق رکھتے تھے، ان کے بیٹے طالبان کے اہم عہدیدار تھے جو اب پاکستانی افواج کی قید میں ہیں) کا حزب گروپ تھا۔ ان دونوں گروپوں کو افغانستان سے روس کی بے دخلی کا اعزاز حاصل تھا۔ چونکہ حکمت یار اور خالص گروپ کے درمیان معاندانہ رویہ تھا اس لیے مجاہدین کے ان

طاقتور گروپوں کو مشترکہ کرزئی مخالف گروپ میں جمع کرنا طالبان کی قابلِ ذکر سفارتی فتح ہوتی۔ سابق پشتون کمانڈروں اور ان کے ازبک اور تاجک حریفوں کو کرزئی مخالف محاذ پر اکٹھا کرنا بھی ایک اہم سفارتی ہدف تھا۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں طالبان گروپوں کی آپس میں مخاصمت اس وسیع حکمتِ عملی کے لیے الگ سے مسئلہ تھا۔ ممکنہ بھرتیوں والے یہ علاقے ایک وحدت بننے اور طالبان کی واپسی کے لیے لازمی عوامی ہمدردی اور افرادی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس پس منظر میں ملا داداللہ کے وزیرستان دورے کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ جنوب مغرب میں طالبان کے ناکام ظہور کا مطلب مستقبل میں طالبان کی کامیاب واپسی کے امکان کا خاتمہ تھا۔ اس لیے ملا داداللہ نے اس جارحانہ واپسی کی کامیابی کو یقینی بنانے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔

اس وقت ملا داداللہ چالیس سال کے تھے۔ گھنی داڑھی اور تیکھے قندھاری نقوش والے اس طالبان کمانڈر کی علاقے میں بہت دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جارحانہ واپسی سے طالبان کی تقدیر میں نمایاں تبدیلی متوقع تھی اس لیے ناراض گروپوں کے درمیان کامیاب مصالحت ملا داداللہ کے عسکری اور سفارتی اعزازات میں ایک اور اضافہ ہوتا۔ ان کا تعلق قندھار سے متصلہ ہلمند صوبے سے تھا۔ ۱۹۹۴ میں آپ کوئٹہ کے ایک مدرسے میں زیرِ تعلیم تھے لیکن طالبان کی دعوتِ جہاد پر لبیک کہتے ہوئے تحریک کے آغاز میں ہی آپ تعلیم چھوڑ کر طالبان سے جا ملے۔ کابل کے قریب میدان شہر کے محاذ پر زخمی ہوئے اور آپ کی ایک ٹانگ کاٹنا پڑی۔ آپ کی خدمات کے صلے میں آپ کو شمالی محاذ پر بارہ ہزار کی طاقتور سپاہ کا امیر بنا دیا گیا۔

۱۹۹۰ کے آخر میں ملا داداللہ نے قندوز میں حکمت یار کی حزبِ اسلامی کے کہنہ مشق بہادروں کو حیران کن اور فیصلہ کن شکست سے دوچار کیا۔ ماضی میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ملا داداللہ پنجشیری جنگجو احمد شاہ مسعود کے حمایتی ہیں لیکن طالبان حکومت کے آخری سال

میں آپ کی مسعود کے خلاف کامیاب جنگ نے ان اندازوں کو غلط ثابت کر دیا۔ دسمبر ۲۰۰۱ میں شمالی اتحاد اور مغربی اتحادی فوجوں نے چڑھائی کی تو ملا داداللہ قندوز میں محصور ہو گئے۔ مقامی طالبان کمانڈروں نے جنرل رشید دوستم سے مذاکرات کیے کہ شمال میں پھنسی ان کی فوجوں کو محفوظ راستہ دیا جائے۔ رشید دوستم نے ان کمانڈروں کو دغا دیا اور سرنڈر کرنے والوں کو امریکہ کے حوالے کر دیا۔ ان میں سے بعض اب بھی گوانتاناموبے میں قید ہیں۔ داداللہ جس طریقے سے فرار ہوئے اس سے آپ کی جنگی بہادری اور فطری زیرکی اور ذہانت سامنے آتی ہے۔ قندوز کی فصیلوں سے باہر جرأت مندانہ عسکری کارروائی کرتے ہوئے آپ نے دوستم کے ایک مرکزی کمانڈر کو اغوا کر کے اسے ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور قندھار کے ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر اسے چھوڑ دیا۔ اگلے تین سالوں میں آپ نے جنوب مغربی افغانستان میں تھکا دینے والی جنگ میں خوفناک کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۲۰۰۶ میں وزیرستان میں ملا عمر کے سفیرِ خاص کی ذمہ داری نبھانے سے ملا داداللہ بہت جلد طالبان صفوں میں اعلیٰ مقام تک پہنچ گئے۔ جب ان کی شہرت پھیلی تو یہ واضح ہو گیا کہ واقعی وہ ایسی شخصیت تھے جیسا کہ ان کے بارے میں گمان کیا جاتا تھا۔

کیا وجہ تھی کہ گوشہ نشین ملا عمر نے اس حساس مشن کے لیے اس تجربہ کار لنگڑے کمانڈر کا انتخاب کیا؟ کیا یہ انتخاب ملا عمر کا محض ان پر اعتماد تھا یا طالبان قیادت کے پاس کوئی ٹھوس شواہد تھے کہ اس پُر خطر مشن کے لیے ملا داداللہ بطورِ خاص موزوں ہیں؟ یا محض اتنی سی بات تھی کہ بس وہ دستیاب تھے؟ وجہ کچھ بھی ہو نتائج ملا عمر کے اعتماد کی تصدیق کرتے ہیں کہ وسیع تر مہارتوں کے حامل اس سفیر پر بھروسا ٹھیک ہی تھا۔

۲۰۰۲ اور ۲۰۰۶ میں طالبان کے جارحانہ ظہور کے درمیانی عرصے میں طالبان کی طاقت میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اسی عرصے میں کرزئی حکومت کی قومی مفاہمت اور

متنوع نسلی اتحاد پیدا کرنے کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ عین اسی دوران اسلام آباد کی فوجی قیادت میں یہ سوچ پختہ ہوئی کہ وزیرستان میں طالبان کے اڈے وزیرستان کی فضا کو کلیتاً تبدیل کر رہے ہیں اور ڈیورنڈ لائن کے آر پار طاقت کے اتار چڑھاؤ کو طالبان اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ افغانستان میں طالبان کی سنٹرل کمانڈ نے ببانگِ دہل دعویٰ کیا تھا کہ تین لاکھ جنگجو ملا عمر کے اشارے کے منتظر بیٹھے ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ گمنام تین لاکھ نظریاتی جنگجو کرزئی حکومت میں دوبارہ شہری اور دیہی آبادی میں جذب ہو چکے تھے۔ طالبان کی آئندہ عسکری کامیابی چند ہزار طالبان جنگجو محافظ دستوں اور وزیرستان کے چار ہزار غیر ملکی جنگجوؤں پر منحصر تھی۔ یہی لوگ تھے جو طالبان کے سیاسی اور عسکری اہداف کے حصول کے لیے ہمدرد قبائلی آبادی کو متحرک کر کے طالبان کی واپسی میں مرکزی کردار ادا کر سکتے تھے۔

وزیری قبائل دل و جان سے طالبان کے حامی تھے۔ سو سال قبل "گریٹ گیم" کے عسکری تجزیہ نگاروں نے انہیں "بھیڑیوں" کا لقب دیا تھا۔ ان کے روایتی حریف محسود "چیتے" تھے جن کی وفاداریاں پاکستان آرمی کے ساتھ تھیں۔ اس طرح ایک سٹریٹجک توازن قائم تھا۔ جب ۲۰۰۴ میں جنوبی وزیرستان میں آرمی کے خونیں حملوں میں بہت سے محسود مارے گئے تو ان کی وفاداریاں پاکستان آرمی کی بجائے طالبان کے ساتھ ہو گئیں۔ کاروباری مندے حال کی وجہ سے کاروباری ذہن رکھنے والا داور قبیلہ بھی آرمی کے خلاف ہو جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح ۲۰۰۵ کے آغاز تک وزیرستان کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو طالبان کے ساتھ نہ ہو۔ اسی عرصے میں بہت سے (روس دور سے مقیم) عرب خاندان تو اپنے اپنے وطن واپس چلے گئے لیکن القاعدۃ کے دوسرے غیر ملکی جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد نے پاکستان کے بندوبستی علاقوں کے گنجان آباد شہروں کا رخ کیا جہاں رہ کر وہ مغرب اور اس کے پاکستانی

اتحادیوں کے خلاف جنگ جاری رکھ سکتے تھے۔ ان میں سے بعض کارندے اب بھی گوانتا ناموبے کے زنداں میں اسیر ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، جارحانہ ظہور سے پہلے کے برسوں میں دو تنظیمیں ابھریں جنھوں نے طالبان کی صف آرائی، نقل و حرکت اور تربیتی تکنیکوں کی تبلیغ میں مرکزی کردار ادا کیا۔ پہلی تنظیم "جیش القبہ الجہاد العالمی السیری" تھی جس نے جہادیوں کی نئی نسل کی تربیت اور نظریاتی تلقین پر توجہ دی۔ جیش القبہ علاقے میں پہلے سے موجود افغان اور غیر ملکی جنگجوؤں کے ساتھ ساتھ وزیرستان کے قبائلی رہائشیوں کی تربیت کی ذمہ دار تھی۔ دوسری انقلابی تنظیم "جند اللہ" تھی جسے وزیرستان اور پاکستان کے بندوبستی علاقوں کے افراد کی تربیت کی ذمہ داری دی گئی۔ تاہم جند اللہ کا مستقبل اس وقت تاریک ہو گیا جب اس نے کراچی میں ایک جرنیل پر قاتلانہ حملے کی منصوبہ بندی کی۔ صبح کے وقت کیا جانے والا حملہ ادھورا رہ گیا اور جند اللہ کی ہائی کمانڈ بے نقاب ہو کر گرفتار ہوئی۔ انقلابی مہم جوئی کی تاریخ میں یہ اس کی مختصر زندگی کے خاتمے کا اشارہ تھا۔ اگرچہ یہ دونوں تنظیمیں وزیرستان میں بڑی جلدی زوال پذیر ہو گئیں تاہم نئی جہادی نسل میں مطلوبہ عسکری تربیت، عسکری نظریات اور عسکری نظم وضبط پیدا کرنے میں کامیاب رہیں۔ ان تنظیموں کے تربیت یافتہ افراد نے اگلے ایک برس تک اس علاقے میں طالبان کے اوسط درجے کے گروہ کی رہنمائی میں مؤثر کردار ادا کیا۔

اس دوران اگست ۲۰۰۳ میں سی آئی اے کی زیرِ نگرانی گن شپ ہیلی کاپٹروں اور زمینی دستوں نے ایک بھاری آپریشن شروع کیا۔ آپریشن سے مختلف علاقوں میں موجود القاعدۃ اور طالبان ارکان کا آپس میں رابطہ منقطع ہو گیا اور القاعدۃ کے درجنوں ارکان جو وانا میں بڑے آرام سے بیٹھے تھے، پاکستانی شہروں کی طرف فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس

آپریشن نے طالبان پر ایک تباہی مچادی۔ نیک محمد جیسے کمانڈر مارے گئے اور القاعدۃ کے تربیتی مراکز تباہ ہو گئے۔ طالبان اور القاعدۃ ڈیڑھ سال تک پہاڑوں میں چھپے رہے۔ اس دورانیے میں افغان طالبان اور وزیرستان میں موجود طالبان اور القاعدۃ کے ارکان کا رابطہ ختم ہو گیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں القاعدۃ دو گروپوں میں بٹ گئی اور بعد میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ ایک گروپ کی رہنمائی اسامہ بن لادن کر رہے تھے اور دوسرے گروپ کے سربراہ ایمن الظواہری تھے۔ دونوں گروپ شوال کے دوردراز مقام پر پناہ گزیں تھے۔ اسامہ اور الظواہری چند سوجاں نثاروں کے ساتھ مختلف علاقوں میں تھے۔ دونوں رہنما دفاعی پوزیشن میں تھے۔ دوسری جگہوں پر اپنے لوگوں اور طالبان قیادت کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔

شیخ عیسیٰ انتہائی درجے کے نظریہ ساز تھے۔ آپ شمالی وزیرستان میں چند آدمیوں کے ساتھ مقیم رہے اور مقامی علماء کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ عبدالخالق اور صادق نور شمالی وزیرستان کے دو نمایاں علماء تھے جو آپ کے پیروکار بنے۔ شیخ عیسیٰ نے پاکستان کے خلاف جنگ کی تبلیغ کی کیونکہ ان کا یقین تھا کہ امریکہ کی افغانستان میں طالبان کے خلاف کامیابی صرف اور صرف پاکستانی فوج کی وجہ سے ہے۔ آپ نے وزیرستان کے نامساعد حالات کا ذمہ دار بھی پاکستان کو ٹھہرایا۔ آپ نے یہاں تک کہہ دیا کہ جو لوگ صرف امریکہ کے خلاف جنگ لڑنے افغانستان جاتے ہیں (اوراس کی اتحادی پاکستانی فوج کو چھوڑ دیتے ہیں) وہ غلط ہیں کیونکہ اصل جنگ تو پاکستان کی فوجی قیادت کے خلاف ہے۔ شیخ عیسیٰ اور ان کے پیروکاروں نے قوت حاصل کرتے ہی پاکستانی فوج کے خلاف ہتھیار اٹھالیے۔ فی الحقیقت یہ القاعدۃ کے مشن سے انحراف تھا لیکن اتنا حیران کن نہیں تھا کیونکہ بہت سے تجربہ کار کمانڈر، نظریاتی مبلغ اور گروپ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ القاعدۃ کا اصل ہدف افغانستان

میں نیٹو افواج کو شکست دینا تھا۔ یہاں یہ بات پھر دہرائی جارہی ہے کہ القاعدۃ کی پاکستان میں کارروائیوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں پاکستان کی حمایت کم سے کم ہو۔

یہاں پر یہ بھی اہم ہے کہ جنگجوؤں کے اس طاقتور گروپ پر توجہ کی جائے جس کی قیادت ازبکستان کے طاہر یلدوشف کر رہے تھے۔ طاہر یلدوشف القاعدۃ اور طالبان کے اصولوں کے لحاظ سے بھی ایک انتہا پسند تھے۔ ان کی زیرِ کمان چند سو ازبک تھے لیکن ان میں سے زیادہ تر ان کی سخت گیری سے حیران تھے۔ یلدوشف خود جنوبی وزیرستان میں تھے لیکن ان کے کئی آدمی شمالی وزیرستان کے قصبے میر علی میں تھے۔ جو شمالی وزیرستان میں مقیم تھے انہوں نے فیصلہ کیا کہ یلدوشف سے تعلقات ختم کر لیے جائیں کیونکہ یلدوشف کی زیادہ تر توجہ افغانستان کی بجائے ازبکستان کے مسائل پر تھی۔ تاہم اس دوران یلدوشف کو جنوبی وزیرستان میں عبداللہ محسود جیسے نمایاں کمانڈر کی حمایت حاصل ہو چکی تھی۔ محسود امریکی حملے کے دوران افغانستان میں گرفتار ہوئے تھے اور ۲۰۰۴ میں رہا ہوئے تھے۔ نوے کی دہائی کے آخر میں ان کی ایک ٹانگ ضائع ہو چکی تھی۔ عبداللہ محسود نے نیک محمد کی وفات کے بعد جنوبی وزیرستان میں پاکستان آرمی کے خلاف کامیابی سے طالبان کو کمانڈ کیا۔ نیک محمد کی آخری لڑائی میں محسود بمشکل گرفتاری سے بچے، بری طرح زخمی ہوئے اور ان کے مرنے کی خبر جاری کر دی گئی۔ لیکن وہ جنوبی وزیرستان میں طاہر جان (طاہر یلدوشف) کے ساتھ دوبارہ منظرِ عام پر آ گئے۔

افغان کمانڈر جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی شمالی وزیرستان میں تھے اور بیت اللہ محسود جنوبی وزیرستان میں تھے۔ جن لوگوں کو یہ کمانڈ کر رہے تھے وہ صرف افغان مزاحمت کے حامی تھے۔ وزیرستان کے کونوں کھدروں میں بکھرے طالبان کے یہ

گروپ برمال، شوال، شکئی اور انگوراڈا میں چھپے ہوئے تھے۔ یوں کہیے یہاں کے پہاڑ عالمی جہادیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ پاکستان کی سکیورٹی فورسز کے خلاف لڑائی میں اس قدرتی خطے نے ان کے لیے بہت آسانی پیدا کی۔ آنکھ مچولی کے کھیل نے پاکستانی دستوں کو تھکا کے رکھ دیا۔ عراقی مزاحمت سے صرف دو ہتھیار؛ ریموٹ کنٹرول بم اور IEDs حاصل کیے گئے جو وزیرستان میں پاکستانی دستوں کے خلاف استعمال ہوئے لیکن پاکستانی دستوں کو ان کے ہیڈ کوارٹرز تک محدود کرنے کے لیے یہی کافی ثابت ہوئے۔

پاکستانی فورسز کی شکست جہادیوں کی پہلی فتح تھی اور اس فتح سے پر عزم نظریاتی جنگجوؤں کو سنہرا موقع مل گیا کہ ان علاقوں سے پاکستانی حکومت کے تمام تعلقات کا خاتمہ کر دیں۔ انہوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ کہ ۲۰۰۵ کے آخر تک شمالی اور جنوبی وزیرستان کے گلی کوچوں میں لڑکے بالے حکمرانی کر رہے تھے۔ ۲۰۰۵ کے آخر میں صرف ایک واقعے نے حالات کی بساط الٹ دی۔ ہوا یوں کہ افغان رہزن حکیم خان زردان کے ایک مقامی ٹھگ ٹولے کا شمالی وزیرستان میں طالبان کے ایک گروپ سے سامنا ہو گیا۔ اس خون ریز معرکے میں طالبان چھا گئے اور بچ جانے والے ٹھگوں کو پھانسی دے دی گئی۔ سر کٹی لاشیں اور بریدہ سر شمالی وزیرستان میں ڈانڈے درپہ خیل کے گردونواح میں لٹکا دیے گئے تاکہ پاکستانی طالبان کی دہشت ہو جائے۔ علماء اور قبائلی عمائدین پر مشتمل قبائلی جرگے کا صدیوں پرانا ادارہ طالبان کے شمالی وزیرستان میں اسلامی ریاست کے اعلان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ پھر شمالی وزیرستان میں پاکستانی طالبان کا ساتھ دینے کے لیے بندوبستی علاقوں سے اپیل کی گئی اور دنوں کے اندر ہی وہ جہادی جو کشمیر میں کیمپ بند ہونے کے بعد فارغ بیٹھے تھے، طالبان کا ساتھ دینے کے لیے سیکڑوں کی تعداد میں آن جمع ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد پاکستانی طالبان نے میران شاہ کا رخ کیا تو پاکستانی سکیورٹی فورسز ایک بھی گولی چلائے بغیر فرار ہو گئیں۔ انہوں

نے پشاور دستوں کو اطلاع دی کہ بغیر فضائی کوَر کے وہ ہر گز نہیں لڑیں گے۔ پاکستانی فوج پورے زور شور سے پاکستانی طالبان کو تباہ کرنے آئی تو وہ پہاڑوں میں غائب ہو چکے تھے۔ لیکن اس سے پہلے طالبان جنوبی وزیرستان میں عدالتیں، نظام پولیس اور چندے کا نظام قائم کر چکے تھے جبکہ پاکستانی سکیورٹی فورسز اپنے ہیڈکوارٹرز میں بیٹھی رہیں۔ اور پاکستانی طالبان نے بڑی ہوشیاری سے ان ہیڈکوارٹرز کے آس پاس کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

شمالی اور جنوبی وزیرستان کی اسلامی ریاستوں کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پاکستان کے شہروں کراچی، لاہور، کوئٹہ، پشاور، بنوں، مردان اور دیر سے دس ہزار سے زائد جہادی شمالی وزیرستان پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ تقریباً بارہ ہزار سے زائد مقامی قبائلی سرگرم تھے جن میں سے تین ہزار سے زائد افغان اور دو ہزار کے قریب ازبک، چیچن اور عرب جنگجو تھے۔

جنوبی وزیرستان میں طالبان کے زیادہ تر گروپ مقامی تھے لیکن چند سو ازبک اور کچھ درجن عربوں کو ملا کر کل تعداد تیرہ ہزار تھی۔ اس طرح ستائیس ہزار شمالی وزیرستان میں اور تیرہ ہزار جنوبی وزیرستان میں یعنی کل چالیس ہزار جنگجو تھے جنہیں ملا عمر نے جارحانہ ظہور کے لیے صف آرا کرنا تھا۔ چونکہ انہیں ناکافی خیال کیا گیا اس لیے ملا داداللہ کو ملا عمر کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا کہ وزیرستان میں دوسری تمام سرگرمیاں ترک کر کے تمام گروہ افغانستان میں طالبان کا ساتھ دیں۔ ملا عمر کے سفیر کی آمد کا پیغام پورے وزیرستان میں بھیجا گیا۔ طاہر جان، شیخ عیسیٰ، عبداللہ محسود اور عبدالخالق حقانی جیسے مقامی علماء وجہادی کمانڈروں کو جنوبی وزیرستان میں جمع ہونے کی درخواست کی گئی۔ داداللہ نے ملا عمر کے خط کی نقول تقسیم کیں اور بعض جگہوں پر خود پڑھ کر سنایا۔

خط میں لکھا تھا:

فی الحال پاکستانی سکیورٹی فورسز پر حملے فوراً بند کیے جائیں۔ اس سے فساد پیدا
ہو گا جسے اسلامی جہاد نہیں کہا جا سکتا۔ افغانستان میں جہاد ہو رہا ہے لہٰذا اپنی
جگہیں چھوڑیں اور امریکہ اور اس کے کافر اتحادیوں کے خلاف جہاد میں
شمولیت کے لیے افغانستان پہنچیں۔

گوشہ نشین یک چشم ملا عمر تمام طالبان کمانڈروں کے لیے ذاتی اختلافات کے باوجود ہمیشہ کرشماتی قوتِ اتحاد رہے ہیں۔ اس خاص سفیر کے ذریعے بھیجے جانے والے پیغام کا جادوئی اثر ہوا۔ آنے والے دنوں میں وزیرستان کے جنگجو گروپوں اور پاکستانی فوج کے درمیان راضی نامے کے لیے آپ کی کوششیں ثمر آور ثابت ہوئیں۔ چالیس ہزار کے لشکر میں سے زیادہ تر نے پاکستانی سکیورٹی فورسز کے خلاف ہتھیار رکھ دیے اور وزیرستان کے طالبان گروپ افغانستان جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سے پہلے یہ سب شوال، برمال اور شکئی کے پہاڑوں میں جمع تھے۔ جب داداللہ دورے پر آئے تو ان کی آمد سے ان سرگرمیوں کو مہمیز ملی۔

داداللہ نے عراقی مزاحمت سے حاصل شدہ آڈیو اور ویڈیو سی ڈیز دکھائیں۔ ابو مصعب الزرقاوی کے نمائندے کی حیثیت سے عراقی مزاحمت کا ایک تین رکنی وفد مارچ ۲۰۰۶ میں افغانستان اور وزیرستان میں اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری اور ملا عمر سے ملاقات کے لیے آیا۔ اس وفد نے الزرقاوی کی طرف سے ملا عمر کی بیعت کی۔ یہی وفد اپنے ساتھ درجنوں ترغیبی اور خودکش (فدائی) حملوں کے لیے تربیتی ویڈیو سی ڈیز بھی لایا تھا۔ ملا داداللہ جب وزیرستان آئے تو ان کے پاس ایسا ہی مواد تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے پاس ایسی تقاریر اور پیغامات بھی تھے جن میں سرکردہ عرب علماء نے اس بات کو واضح کیا تھا کہ کیسے اور کیوں خودکش حملے اسلام میں جائز ہیں۔ اس سے پہلے افغان تاریخ میں خودکش حملوں کی کوئی روایت نہیں تھی کیوں کہ اب تک خودکش حملے اسلام میں ممنوع تصور کیے جاتے

تھے۔ اس لیے کٹر افغان معاشرے کو خود کش حملوں کو بطور جنگی حربہ استعمال کرنے پر راضی کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ماضی قریب میں افغانستان میں چند ایک خود کش حملے ہوئے تھے لیکن یہ انفرادی واقعات تھے۔ داداللہ نے خود کش حملوں کو حملے کی ایک جائز صورت کے طور پر نمایاں کیا اور آڈیو اور ویڈیو پیغامات پھیلائے کہ کس طرح عراقی مزاحمت خود کش حملوں کو ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔

فنِ حرب کے موازنے اور جائزے کے لیے طالبان اور عراقی مزاحمت کے وفود کا تبادلہ ۲۰۰۵ میں ہو چکا تھا۔ بہت سے طالبان کمانڈروں کے علاوہ عراقی مزاحمت کے تربیت یافتہ ملا محمود اللہ حق یار بھی تھے جو جانتے تھے کہ خود کشی کو کس طرح ایک حملے کی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے اگرچہ طالبان کو علم تھا کہ دوسروں نے خود کش حملے کیے ہیں لیکن ان کے پاس ایسے افراد کی کمی تھی جو اس کام کے لیے خود کو پیش کریں۔ ملا داداللہ کا مشن اس محاذ پر بھی کامیاب رہا۔ آپ ازبکستان، تاجکستان، وزیرستان اور پاکستان کے مختلف شہروں سے آنے والے گروپوں پر خود کش حملوں کی اہمیت واضح کرنے میں کامیاب رہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ممکنہ بمباروں کا پہلا دستہ تربیت کے لیے کنڑ وادی میں پہنچ چکا تھا۔ داداللہ نے بشمول ستر خواتین کے ساڑھے چار سو خود کش حملہ آوروں کا گروپ تیار کر لیا۔ افغانستان میں حملہ آوروں سے جنگ کی صدیوں پرانی روایت ہے لیکن خواتین کے لیے جنگ میں کوئی کردار نہیں تھا۔ خود کش بمباروں کے خواتین دستے میں زیادہ تر افغانستان اور وزیرستان میں مارے جانے والے عرب اور وسط ایشیائی ریاستوں کے جنگجوؤں کی بیوائیں شامل تھیں لیکن وزیرستان سے بھی بعض خواتین اپنے خاوندوں اور والدین کی ترغیب پر اس دستے میں شامل ہوئیں (لیکن علماء اور جہادی کمانڈروں کی مخالفت کی وجہ سے ابھی تک طالبان اور القاعدہ کی جانب سے کسی خاتون نے خود کش حملہ نہیں کیا۔ مترجم)۔ خود کش بمباروں کا یہ

پہلا دستہ تو صرف ایک نمونہ تھا۔ آنے والے دنوں میں خود کش بمباروں کی مسلسل دستیابی وزیرستان میں طالبان سفیر کی واضح کامیابی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

جب یہ پیش رفتیں ہو رہی تھی تو طالبان چند ہزار جنگجوؤں اور مقامی جنگی سرداروں کی مدد سے افغانستان کے مختلف علاقوں میں اپنا ظہور شروع کر چکے تھے۔ اگر وہ وزیرستان میں موجود چالیس ہزار کے لشکر کو بھی ساتھ ملا لیتے تو بہت زبردست مہم جوئی کر سکتے تھے۔ طالبان نے اس آپریشن کا سپریم کمانڈر تجربہ کار جلال الدین حقانی کو بنایا۔ حقانی کو سپریم کمانڈر مقرر کرنے کا فیصلہ طالبان کی ایسی حکمتِ عملی تھی جس سے جنوب مغربی افغانستان میں کنٹرول سنبھالنے سے پہلے ہی شمال میں کابل حکومت کو غیر مستحکم کر سکتے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ پہلے جنوب مشرقی صوبوں میں اپنی قوت کو فعال کیا جائے پھر کابل کی طرف پیش قدمی کی جائے۔

اس دوران مختلف علاقوں کے ذمہ دار دس کمانڈروں کی ایک کمانڈ کونسل بنائی گئی۔ ملا عمر کے سابق وزیر دفاع ملا عبید اللہ اخوند کو سفیر مقرر کیا گیا کہ وہ براہِ راست ملا عمر سے ہدایات وصول کر کے تمام کمانڈروں کو پہنچائیں اور ان کے تاثرات ملا عمر تک پہنچائیں تا کہ حتمی فیصلہ کیا جائے۔ تمام کمانڈروں خاص طور پر ملا داداللہ کی بنیادی ذمہ داری یہ تھی کہ افغانستان کے جنوب مغرب اور جنوب مشرق سے حکومتی رٹ ختم کریں۔ جلال الدین حقانی کی ذمہ داری تھی کہ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دشمن کو بھرپور دہشت سے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں دھکیل دیں تا کہ طالبان دستوں کی آمد سے پہلے ہی کرزئی انتظامیہ جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

عمر رسیدہ، دبلے پتلے اور چھوٹے قد کے کمانڈر جلال الدین حقانی نے سوویت آرمی کے خلاف اپنی ہر فتح کا ریکارڈ رکھا ہوا تھا۔ آپ کی پہلی فتح وہ تھی جس میں مجاہدین نے ۱۹۹۱

میں کمیونسٹ حکومت کو شکست دے کر اس وقت کے افغان صدر ڈاکٹر نجیب کے آبائی علاقے خوست کا انتظام سنبھالا تھا۔ خوست اور کابل کی فتح کا اہم سنگِ میل تھی۔ جب طالبان آئے تو افغانستان کے دوسرے رہنماؤں اور کمانڈروں کے برعکس جلال الدین حقانی واحد کمانڈر تھے جنہوں نے غیر مشروط طور پر ان کا ساتھ دیا۔

حقانی کوئی طالب نہیں تھے اور نہ ہی ماضی میں کبھی وہ اس تحریک کا حصہ رہے تھے اس لیے طالبان نے (شروع میں) انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی۔ آپ سرحدی معاملات کے وزیر تھے لیکن پالیسی معاملات پر ان سے کبھی مشاورت نہ کی گئی۔ اس کے باوجود جب طالبان نے دسمبر ۲۰۰۱ میں پسپائی کا فیصلہ کیا تو اس تجربہ کار کمانڈر نے انہیں مشورہ دیا کہ خوست، پکتیا، اور پکتیکا کے صوبوں کا کنٹرول نہ چھوڑیں اور امریکی فوجوں کے خلاف گردیز کو اپنا اگلا مورچہ بنائیں۔ تاہم طالبان قیادت نے ان کی نصیحت پر کان نہ دھرے اور تمام صوبے خالی کر دیے۔ پھر بھی جلال الدین حقانی ملا عمر کے وفادار رہے۔ اس وقت بھی (آپ وفادار رہے) جب پاکستان اور امریکہ نے انہیں حملے سے پہلے اسلام آباد بلا کر معتدل طالبان کا ایک گروہ تیار کر کے اس کا سربراہ بننے اور ملا عمر کے خلاف بغاوت کرنے کی صلاح دی تھی۔

تمام غیر ملکی جنگجو جو تورا بورا، کابل اور لڑائی کی دوسری جگہوں سے فرار ہوئے، سب نے حقانی کے پاس پناہ لی۔ حقانی نے ان سب کو شمالی وزیرستان میں اپنے گھر میں پناہ دی۔ جنہوں نے آپ کے ساتھ رہنا چاہا، انہیں رہائش فراہم کی اور جنہوں نے واپس جانا چاہا، ان کے لیے محفوظ راستے فراہم کیے۔ حقانی ۲۰۰۶ میں ایک مرتبہ پھر بامِ شہرت پر نظر آئے جب ملا عمر نے ان کی صحیح قدر و منزلت پہچانی۔ آپ کو رقم، آدمی اور تمام مطلوبہ وسائل فراہم کیے گئے اور افغانستان کے کسی بھی علاقے میں کارروائی کرنے کے اختیارات عطا کیے گئے۔ آج طالبان حلقوں میں ملا عمر کے بعد آپ دوسری محترم ترین شخصیت ہیں۔

جلال الدین حقانی جوان نظر آنے کے لیے داڑھی اور بالوں میں خضاب لگاتے ہیں، افغانستان کے تمام طالبان کمانڈروں سے ان کے تعلقات ہیں چاہے وہ ازبک ہو، تاجک ہوں یا پشتون۔ سارے خود کش دستے (فدائین) ان کے زیرِ کمان ہیں جن کی مدد سے آپ افغان سیاست کے مراکز، ہرات، کابل، قندھار، قندوز اور جلال آباد کو غیر مستحکم کر رہے ہیں۔ جب جنوب مغربی افغانستان میں طالبان مزاحمت کا آغاز ہوا تو اس وقت آپ خود کش حملوں کے لیے افراد کی دستیابی بارے سوویت دور کے تجربہ کار کمانڈروں سے روابط کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ۲۰۰۶ کے جارحانہ ظہور کے لیے طالبان کمانڈروں کی تنظیمِ نو کے نتیجے میں درج ذیل افراد افغانستان سرزمین پر ظاہر ہوئے:

ملاداداللہ

ملاداداللہ وزیرستان میں کامیابی سے پہلے بھی جنوب مغربی افغانستان کے کمانڈران چیف کی حیثیت سے ملا عمر کا انتخاب تھے، جہاں انہیں تمام شہروں اور قصبوں کا کنٹرول سنبھالنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لنگڑے ہونے کے باوجود آپ میڈیا فرینڈلی تھے اور دوسروں کے برعکس اپنی تصاویر چھپنے پر خوش ہوتے۔ آپ نے جب چاہا افغان فورسز کو کامیابی سے شکست دی اور اتحادی فوجوں کے خلاف طویل لڑائیاں لڑیں۔ داداللہ مئی ۲۰۰۷ میں ہلمند میں ایک فضائی حملے میں شہید ہوئے۔

مولوی عبدالکبیر

طالبان دور کے ننگرہار صوبے کے گورنر کبیر نے خود کو روپوش رکھا۔ داداللہ اور حقانی کے برعکس ان کے پاس کوئی مضبوط اڈا نہیں تھا۔ طالبان دور میں یا اس سے پہلے آپ کا کوئی بڑا کردار نہیں رہا لیکن ملا عمر کے بااعتماد پیروکار کی حیثیت سے پکتیا صوبے میں طالبان کے ایک گروپ کی کمانڈ کرتے ہیں۔

کمانڈر محمد اسماعیل

آپ صوبہ کنڑ کے چیف کمانڈر ہیں۔ کنڑ کا صوبہ طالبان کے لیے کبھی بھی پر سکون جگہ نہیں رہا کیونکہ کنڑ اور اس سے ملحقہ نورستان کی آبادی کی اکثریت سلفی ہے۔ اس لیے اسماعیل کے پاس محدود اڈا ہے اور اسی وجہ سے آپ نے کنڑ میں پیچ درہ کو اپنا مرکز بنایا ہوا ہے۔ آپ عرب اور چیچن جنگجوؤں کے شانہ بشانہ لڑتے ہیں اور خودکش حملوں اور آئی ای ڈی کو اہم ہتھیاروں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

کشمیر خان

نائن الیون کے حملے کے بعد حکمت یار اور طالبان کی فوجوں کے ایک ہونے سے پہلے کشمیر خان حکمت یار کے وفادار کمانڈر کی حیثیت طالبان کے خلاف لڑتے رہے۔ کشمیر خان ایک آزاد کمانڈر کی حیثیت سے شیگل کی پہاڑی چوٹیوں پر امریکہ کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

ملا گل محمد جھنگوی

ملا گل محمد، جن سے مصنف نے ۲۰۰۶ میں پاک افغان سرحد پر انٹرویو کیا، کی عمر چالیس سال کے قریب ہے۔ طالبان دور حکومت میں آپ پل خمری کے کمانڈر تھے اور اب ارگون، قلات اور قندھار میں طالبان فوجوں کی کمانڈ کرتے ہیں۔ ۲۰۰۳ میں امریکی فوج نے انہیں گرفتار کر کے کابل کے نزدیک بگرام بیس منتقل کر دیا، جہاں ان پر تشدد کیا گیا اور زبردستی جیش المسلم میں شامل کر دیا گیا۔ جیش المسلم ایک فرضی گروپ تھا جسے امریکہ نے طالبان کے درمیان اس لیے قائم کیا تھا کہ ملا عمر کو طالبان کی قیادت سے ہٹایا جائے۔ جب گل محمد رہا ہوئے تو جیش المسلم غائب ہو چکی تھی۔ آپ سولہ سو آدمیوں کے ساتھ دوبارہ طالبان

سے مل گئے۔ اب آپ قلات (یہ ایک افغان علاقہ ہے) میں طالبان کے اہم کمانڈر ہیں اور طالبان تحریک کی نمایاں ترین شخصیت۔

طالبان کی نئی حکمتِ عملی

طالبان کی نئی حکمتِ عملی نے واضح امتیاز حاصل کیا ہے خاص طور پر صحیح جگہ پر صحیح آدمی کا تقرر کرنے میں۔ آج طالبان کی گوریلا کارروائیاں ماضی کی نسبت کئی گنا مؤثر ہیں۔ نیٹو فورسز نے جنوبی اور مشرقی افغانستان میں ان کے خلاف بہت سے آپریشن کیے لیکن طالبان نے دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ روز بروز اپنے قدم بھی جمائے۔ نائن الیون کے بعد القاعدۃ اور طالبان کی تشکیلِ نو کا منصوبہ ۲۰۰۵ میں مکمل ہوا جب القاعدۃ وزیرستان میں اسلامی ریاست قائم کرنے اور ہزاروں قبائلی نوجوانوں ، افغانوں، پاکستانی جہادیوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کو باہم متحد کرنے میں کامیاب ہوئی۔

پاکستانی قبائلی علاقہ جات کو افغان جنگ کے لیے عسکری اڈا بنایا گیا اور طالبان نے کنڑ، ننگرہار، خوست ، پکتیکا، پکتیا، گردیز، ارزگان، زابل اور قندھار میں کامیابیاں حاصل کیں۔ تاہم ان کی کامیاب ترین کارروائی جنوبی وزیرستان پر قبضہ تھا۔ اس سے وہ اس قابل ہوئے کہ یہاں سے ہلمند میں کامیاب کارروائیاں کر سکیں۔ ہلمند میں القاعدۃ اور طالبان کی نیٹو اتحادیوں کے خلاف شدید ترین لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ ۲۰۰۶ کے جارحانہ ظہور سے ہلمند کے بہت سے علاقے طالبان کے کنٹرول میں آ گئے۔ میں جب نومبر ۲۰۰۶ میں ہلمند گیا تو اس وقت تک ہلمند کے اہم ترین سٹریٹجک علاقے طالبان کے زیرِ اثر تھے۔ ہلمند میں پاکستانی سرحد کے ساتھ ضلع گرام سر واقع ہے جہاں سے جنوبی وزیرستان سے آنے والے ہزاروں جہادی ہلمند میں داخل ہو کر نیٹو کے خلاف لڑے۔ گریشخ اور لشکر گاہ کے قصبوں کے علاوہ پورا شمالی ہلمند طالبان کے قبضے میں تھا جس سے انہیں بدغیس، فراح، ہرات اور نمروز کے صوبوں میں

آمدورفت کا محفوظ راستہ مل گیا تھا۔ وہ حکمتِ عملی جو جنوبی وزیرستان میں شروع ہوکر ہلمند تک پھیلی، اس نے طالبان فوجوں کو پورے افغانستان میں پھیلا دیا۔

اڈے پر واپسی

جب نیٹو فوجیوں کی باقیات والے تھیلے واپس ان کے ملکوں میں پہنچے تو طالبان اور القاعدۃ کے احیا کی خبروں نے براہِ راست وزیرستان کو طالبان کا بنیادی اڈا قرار دیا جہاں سے طالبان دوبارہ ابھرے اور افغانستان میں امریکی اور نیٹو فوجوں پر تباہی مسلط کی۔ اب امریکہ کو طالبان کی پاکستان میں پیش قدمی کو روکنے کا منصوبہ بنانا پڑا۔ جب یہ خبر آئی کہ قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن کرنے کے لیے پاکستان پر امریکی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے تو میران شاہ میں ایک بڑا قبائلی جرگہ بلایا گیا۔ اس بات پر اتفاق تھا کہ جنگجو تمام محاذوں پر بیک وقت نہیں لڑ سکتے۔ اگلے منصوبے کے حتمی ہونے تک پاکستان سے عارضی صلح ان کی مجبوری تھی۔

آٹھویں صدی کے ظالم حکمران حجاج بن یوسف نے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کے ایک مجمعے سے مخاطب ہوکر کہا تھا کہ ”میں ان عماموں اور داڑھیوں کے نیچے کٹے ہوئے گلے دیکھ رہا ہوں۔“ ایسا ہی خیال اگست ۲۰۰۶ میں راقم کے ذہن میں آیا جب میں نے میران شاہ میں پاکستانی طالبان، قبائلی عمائدین اور سیاستدانوں کے سب سے بڑے تاریخی اجتماع میں شرکت کی۔ ان اہم لمحات میں فضا میں آگ اور خون کی بُو رچی ہوئی تھی۔ جنگجوؤں نے پاکستانی حکومت کے ساتھ امن معاہدے کا جو فیصلہ کیا تھا اس سے فی الحقیقت (مطلق) امن کے عمل کو فروغ دینا مقصود نہیں تھا۔ بلکہ اگلے جنگی منصوبے کے حتمی ہونے تک یہ صرف ایک عارضی حکمتِ عملی تھی۔ فوری خطرے سے نبٹنے کے لیے جنگجوؤں کو ایک حکمتِ عملی کے تحت پس پردہ رہنے کی ہدایت کی گئی اور جمعیت علمائے اسلام سے تعلق رکھنے والے مقامی سیاسی رہنماؤں کو سامنے کیا گیا۔ قبائلی جرگے میں جنگجوؤں نے خاموش سامعین کی حیثیت

سے شرکت کی۔ جنگجو پاکستانی فوج کے خلاف تمام کارروائیاں روکنے پر راضی ہو گئے اور ستمبر ۲۰۰۶ میں امن معاہدے پر دستخط کر دیے۔ تاہم سابقہ چالوں کی طرح یہ بھی طوفان کو روکنے کا ایک حربہ تھا۔ اس دفعہ یہ معاہدہ پاکستانی حکومت کے سیاسی ایجنٹ، عثمان زئی قبائل اور قبائلی عمائدین اور شمالی وزیرستان کے مذہبی رہنماؤں کے مابین طے پایا تھا۔ اس کی سولہ بڑی اور چار ذیلی شقیں تھیں۔ اہم نکات یہ تھے:

أ. عثمان زئی وزیری بشمول مقامی طالبان، مذہبی رہنما، عمائدین اور قبائلی عوام وعدہ کرتے ہیں کہ:

الف} قانون نافذ کرنے والے اداروں اور حکومتی املاک پر کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا۔ کوئی ٹارگٹ کلنگ نہیں ہو گی۔

ب} کوئی متوازی انتظامیہ نہیں بنائی جائے گی اور حکومتی رٹ بحال رہے گی۔ اگر کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو سیاسی انتظامیہ عثمان زئی قبائل کی مشاورت سے قبائلی رسم ورواج اور ایف سی آر آرڈیننس کے مطابق حل کرے گی۔

ج} افغانستان میں سرحد پار کوئی عسکری کارروائی نہیں کی جائے گی۔ تاہم مقامی رواج کے مطابق کاروبار اور رشتہ داروں سے میل ملاقات کے لیے سرحد پار جانے پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔

د} شمالی وزیرستان سے ملحقہ علاقوں میں کسی قسم کی دہشت گردانہ سرگرمی نہیں کی جائے گی۔

ہ} شمالی وزیرستان میں موجود غیر ملکی یا تو پاکستان چھوڑ دیں یا پھر مروجہ قوانین اور اس معاہدے کی رو سے پر امن طور پر رہیں۔ مذکورہ بالا شقیں بلا تفریق تمام غیر ملکیوں پر لاگو ہیں۔

و} آپریشن کے دوران قبضے میں لی گئی تمام حکومتی املاک (گاڑیاں، ہتھیار، وائرلیس وغیرہ) واپس کی جائیں گی۔

ب۔ حکومت وعدہ کرتی ہے کہ:

الف} آپریشن کے دوران گرفتار کیے گئے تمام افراد رہا کر دیے جائیں گے اور سابقہ الزامات کی بنیاد پر انہیں دوبارہ گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

ب} حکومت تمام سیاسی مفادات ترک کر دے گی۔

ج} حکومت سڑکوں پر قائم کردہ تمام نئی چیک پوسٹیں ختم کر دے گی اور حسبِ سابق پرانی چیک پوسٹوں پر لیویز اور خاصہ دار تعینات کرے گی۔

د} حکومت آپریشن کے دوران قبضے میں لیے گئے تمام ہتھیار اور گاڑیاں واپس کرے گی۔

ہ} اس معاہدے کے بعد حکومت تمام زمینی اور فضائی آپریشن روک دے گی اور رسم ورواج کے مطابق مسائل حل کیے جائیں گے۔

و} حکومت متاثرین کو ضمنی نقصان کا ہرجانہ ادا کرے گی۔

ز} قبائلی روایت کے مطابق ہتھیار رکھنے پر پابندی نہیں ہو گی۔ تاہم بھاری اسلحے پر پابندی ہو گی۔

ح} اس معاہدے کے نفاذ کا آغاز آرمی کے چیک پوسٹوں سے بیرکوں میں واپس چلے جانے سے ہو گا۔

ج۔ متفرق:

الف} معاہدے کے مطابق دس رکنی کمیٹی تشکیل دی جائے گی جس میں علماء اور سیاسی انتظامیہ کے نمائندے شامل ہوں گے۔ کمیٹی کی ذمہ داری ہو گی کہ:

الف} حکومت اور عثمان زئی قبائل میں تعلقات پیدا کرے۔
ب} اس معاہدے پر نظر ثانی کرے اور اس کے نفاذ کو یقینی بنائے۔
ب} اگر کوئی فرد یا گروہ (غیر ملکی یا مقامی) اس معاہدے کی پاسداری نہیں کرتا اور وزیرستان میں امن میں خلل پیدا کرتا ہے تو اس کے خلاف ایکشن لیا جائے گا۔

سابقہ معاہدوں کے برعکس اس معاہدے میں طالبان یا مجاہدین جیسے الفاظ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اگرچہ معاہدے پر پاکستان کے سرکردہ فوجی کمانڈروں، حافظ گل بہادر، مولانا صادق نور اور مولانا عبد الخالق نے دستخط کیے تھے تاہم بنیادی طور پر یہ معاہدہ حکومت اور عثمان زئی قبائل کے مابین تھا۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ جنگجو امریکہ کو دکھانا چاہتے تھے کہ خطے میں کسی نئے فوجی آپریشن کی ضرورت نہیں کیونکہ قبائلی رہنما امن و امان کی ذمہ داری لے چکے ہیں۔ اس امن معاہدے کے نتیجے میں حکومت کی جانب سے جنگجوؤں کو نامعلوم رقم فراہم کی گئی۔ معاہدے میں مذکور غیر ملکیوں سے مراد القاعدۃ اور دوسرے غیر ملکی جنگجو تھے ۔ پاکستان نے سو کے قریب طالبان اور القاعدۃ ارکان اور کمانڈر رہا کر دیے۔ میران شاہ کے فٹ بال سٹیڈیم میں معاہدے کی تقریبِ دستخط میں جنگجوؤں نے سکیورٹی کوَر فراہم کیا اور سٹیڈیم کے سکور بورڈ پر القاعدۃ کا سیاہ پرچم لہرا رہا تھا۔

یہ امن معاہدہ بیس مئی ۲۰۰۷ کو ختم ہو گیا کیونکہ امریکا جنگجوؤں کے خلاف آپریشن کرنے کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈال رہا تھا اور مذہبی جنگجو نئے جنگی منصوبے کو حتمی شکل دے رہے تھے۔ نائن الیون کے بعد جنم لینے والی حکمتِ عملی جنوبی وزیرستان اور ہلمند میں پھیلنے کے بعد اب جنگ کے اگلے درجے پر تھی۔ امریکہ اور پاکستان قبائلی علاقوں میں آپریشن کا سوچ رہے تھے اور جنگجوؤں کی نظریں پاکستانی شہروں پر تھیں۔ ۲۰۰۷ کے اختتام تک میدانِ جنگ کراچی تا پشاور پھیل چکا تھا۔

امریکا کا غصہ

۲۶ فروری ۲۰۰۷ کو پریشان ڈک چینی اسلام آباد پہنچا اور طالبان کے جارحانہ ظہور پر واشنگٹن کے غم و غصے کی کیفیت بیان کی کیونکہ امریکہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ امریکا کو ۲۰۰۶ کے آخر میں احساس ہوا کہ القاعدۃ اور طالبان پاکستانی قبائلی علاقوں میں دوبارہ منظم ہو رہے ہیں لیکن اسے تازہ ترین پیش رفتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ جنوب مغربی افغانستان اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ہلمند صوبے اور قندھار کے اہم اضلاع پر طالبان کی حکومت تھی اور ارزگان اور زابل میں صورتحال بہت ابتر تھی۔ اتحادی فوجوں کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ طالبان بہت بڑا خطرہ ہیں اس لیے ڈک چینی نے مشرف کو خبردار کیا کہ اگر پاکستانی قبائلی علاقوں میں جنگجوؤں کے خلاف مکمل جنگ شروع نہ کی گئی تو نتائج کا ذمہ دار پاکستان ہو گا۔

ڈک چینی نے اپنے دورے میں حکومتِ پاکستان اور طالبان کے مابین ہونے والے تمام سابقہ معاہدے دیکھے جن میں طالبان جنگجوؤں کو رقم (ہرجانے) دیے جانے کا ذکر تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ پاکستان حقانی نیٹ ورک سے تعلقات بنا رہا ہے۔ اگلے دن جب چینی نے کابل کا دورہ کیا تو صورتحال اور گھمبیر ہو گئی جب بگرام ایئربیس پر اس کی موجودگی میں ایک خودکش حملے میں ۲۳ (اتحادی) ہلاک اور ۲۰ زخمی ہو گئے۔ بعد میں سی آئی اے نے رپورٹ دی کہ اس حملے کی منصوبہ بندی شمالی وزیرستان میں ابو لیث اللیبی نے کی تھی جن کا تعلق القاعدۃ سے ابتداء میں اتنا زیادہ نہیں تھا۔ (بعد میں ابو لیث اللیبی القاعدۃ کے باقاعدۃ رکن بنے اور پاکستان اور افغانستان میں کارروائیاں کروائیں۔)

جنوبی ایشیا کے آئندہ حالات میں چینی کا دورہ بہت اہم ثابت ہوا۔ وہ جان گیا کہ پاکستانی قبائلی علاقہ جات مکمل طور پر القاعدۃ کے کنٹرول میں اور طالبان کی طاقت کا مرکز ہیں۔ اس نئے نظریے نے مغرب کی سوچ کا زاویہ بدل دیا۔ پہلے مغرب کا خیال تھا کہ پاکستان

القاعدۃ اور طالبان کے بھگوڑوں کے لیے محفوظ ٹھکانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن اب انہیں احساس ہوا کہ مسئلے کی اصل جڑ ہی پاکستان ہے۔ اگر مسئلہ حل کرنا ہے تو شروعات پاکستان سے کی جائیں۔ اس نئے ادراک نے پاکستان میں جمہوریت لانے کے لیے مشرف حکومت پر دباؤ ڈالنے کی امریکی کوششوں کو تیز کر دیا۔

امریکہ پاکستان کی حمایت جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا نظام چاہتا تھا کہ اس کے سٹریٹجک مفادات پر زد نہ پڑے۔ سوچ بچار کی یہ نہج دراصل طالبان کے ۲۰۰۶ کے جارحانہ ظہور کے بعد پروان چڑھی۔ آخر کار ۲۰۰۸ میں اسے ایف پاک (Af-Pak) پالیسی کا نام دیا گیا جس میں افغانستان اور پاکستان کو ایک ہی میدانِ جنگ کے طور پر لیا گیا اور قبائلی علاقہ جات کو تمام مسائل کی جڑ قرار دیا گیا۔ وسیع تناظر میں امریکہ ۲۰۰۴ کے آغاز سے ہی پس پردہ رہ کر وار آن ٹیرر کو عام کرنے کی پالیسی سوچتا رہا۔ امریکہ کا خیال تھا کہ جمہوری اصلاحات مطلوبہ فضا پیدا کر دیں گی۔ چینی کا افغانستان اور پاکستان کا دورہ فکری تبدیلی لانے میں اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ افغانستان اور پاکستان کو ایک ہی جنگی میدان کے طور پر شناخت کرنے کے بعد جمہوریت کا فروغ امریکہ کی اولین سٹریٹجی تھی۔

۲۰۰۶ کے اختتام تک مشرف الیکشن کروانے کے امریکی فارمولے پر راضی ہو گیا اور ۲۰۰۸ کے شروع میں اقتدار پیپلز پارٹی کی نمائندگی میں سیکولر اور لبرل سیاسی پارٹیوں کو منتقل ہو گیا۔ دوسری اتحادی پارٹیوں میں پشتون نسل پرست سیکولر اے این پی، ایم کیو ایم، جے یو آئی (ف) اور مسلم لیگ (ق) شامل تھیں۔ اقتدار منتقل کرنے کے بعد مشرف وردی اتارنے، امریکی منظور کردہ چیف آف آرمی سٹاف بنانے، ملک کے سول صدر کے طور پر رہنے اور وار آن ٹیرر کے پورے عمل کی دیکھ بھال کرنے پر راضی ہو گیا۔ بینظیر بھٹو کا کردار بہت اہم خیال کیا گیا تھا۔ اس کی حکومت میں پارلیمنٹ میں اسلامی مدارس کے خلاف آسانی

سے قوانین پاس ہو جاتے اور ملک میں دہشت گردی کے خلاف مہم شروع کرنا بھی آسان ہو تا۔ اے این پی اور ایم کیو ایم اس کے دستِ راست بنتے اور جے یو آئی(ف)اس پر ایک مذہبی رنگ چڑھاتی۔

اگلے مرحلے میں امریکہ اور برطانیہ نے مشرف اور بینظیر میں ڈیل کروائی جس کے نتیجے میں ۲۰۰۷ کا بدنام زمانہ این آر او عمل میں آیا۔ اس این آر او سے بینظیر بھٹو اور آصف زرداری پر بدعنوانی کے تمام الزامات ختم ہو گئے اور انہیں آزاد شہری کی حیثیت سے وطن واپس آکر قومی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی۔ یہ منصوبہ فروری ۲۰۰۶ میں بنا اور اپریل ۲۰۰۷ میں سامنے آیا۔ نتیجتاً حافظ گل بہادر، مولانا صادق نور اور مولانا عبد الخالق کے ساتھ کیا جانے والا ستمبر ۲۰۰۶ کا معاہدہ ۲۰ مئی ۲۰۰۷ کو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پاکستانی تاریخ کا خونیں ترین باب ہے۔

افغانستان پر امریکی چڑھائی کے بعد ہونے والے واقعات کا جائزہ لیں تو انٹیلی جنس کی ناکامی کھل کر سامنے آتی ہے۔ القاعدۃ کی تنظیمِ نو اور حربی بصیرت سے متعلق انٹیلی جنس ادارے ناکام رہے۔ القاعدۃ نے اس خطے میں امریکی چالوں کا کامیابی سے دفاع کیا اور پاکستان کو طالبان کے خلاف کوئی فاتحانہ قدم اٹھانے سے روکے رکھا۔ اس کا نتیجہ ۲۰۰۶ کا جارحانہ ظہور تھا جس نے افغانستان میں طالبان کو ایک نیا عروج بخشا۔ القاعدۃ نے اس دوران جنوب ایشیائی میدانِ کارزار میں ہونے والی پیش رفتوں کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا اور اس بات کا تجزیہ کیا کہ پاکستان اور افغانستان میں اس کے نیٹ ورک کے خلاف امریکہ کس قسم کی سیاسی اور عسکری چالیں چل رہا ہے۔

یہاں سے القاعدۃ کی داستان الف لیلۃ کی ایک اور سچی کہانی شروع ہوتی ہے۔ القاعدۃ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ افغانستان میں کامیابی حاصل کرنے اور ہلمند صوبے کو پورے

ملک کے عسکری مرکز کے طور پر استعمال کرنے کے لیے پاکستانی قبائلی علاقوں میں قدم جمائے جائیں۔ لیکن اسے ۲۰۰۷ میں امریکی ردعمل کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت تک امریکہ نے القاعدۃ کے ٹھکانوں کی درست نشاندہی کرلی تھی اور اب انہیں تباہ کرنے کا طریقہ ڈھونڈ رہا تھا۔ القاعدۃ ہر قیمت پر اپنے ٹھکانے بچانا چاہتی تھی۔ اس طرح امریکہ اور القاعدۃ کے درمیان ایک سٹریٹجک کھیل شروع ہو گیا۔ اگلے مرحلے میں القاعدۃ نے پاکستانی شہروں میں کارروائیاں کرکے ایک انتشار پیدا کرنا تھا تاکہ اپنے ٹھکانوں کو امریکی و پاکستانی حملے سے بچایا جائے۔ ۲۰۰۷ میں امریکہ نے پاکستانی باجوڑ ایجنسی سے چند سو میٹر دور کنڑ میں ایک بیس تعمیر کرنا شروع کردیا۔

افغانستان میں پاکستانی قبائلی علاقوں کے پاس اس طرح کے مزید کئی امریکی اڈوں اور چوکیوں کی تعمیر بیک وقت جاری تھی۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ نے پاکستان سے خفیہ معاہدہ کیا کہ قبائلی علاقوں میں جنگجوؤں کے ٹھکانوں پر ڈرون حملے کرنے کے لیے پاکستانی فضائی اڈے استعمال کیے جائیں گے۔ لیکن جب امریکہ افغانستان اور پاکستان میں اپنی فوجوں کو طاقتور کرنے کے لیے کھربوں ڈالر خرچ کر رہا تھا، القاعدۃ یہ جنگ پاکستانی شہروں میں لے آئی۔ (پاکستان میں سیاسی تعلقات قائم کرنے کے تناظر میں القاعدۃ امریکہ سے ہمیشہ ایک قدم آگے رہی ہے)۔ درحقیقت جنگ کو پاکستانی شہروں میں لانے کا القاعدۃ منصوبہ بہت پہلے کا تھا لیکن یہ منصوبہ ۲۰۰۷ میں ہی عمل میں لایا جاسکتا تھا۔

اس خطے میں امریکی مشن کی نگرانی ڈک چینی کے ذمے تھی۔ دوسری طرف پاکستان میں ڈاکٹر ایمن الظواہری کی ہدایات کے مطابق شیخ عیسیٰ القاعدۃ کے ماسٹر پلان کے سربراہ تھے۔ شیخ عیسیٰ کو ۲۰۰۳ کے بعد پاکستان کے اسلامی سیاستدانوں اور سیاسی تنظیموں سے ملنے کے لیے سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ آپ کا ارادہ یہ تھا کہ القاعدۃ کی مضبوط حمایت کے لیے پاکستان

کے شہری علاقوں میں ایک اسلامی سیاسی اتحاد قائم کیا جائے۔ جن لوگوں سے شیخ عیسیٰ ملے ان کے نام یہ ہیں:

- پاکستان کی سرکردہ اسلامی پارٹی جماعت اسلامی، جسے اخوان المسلمون کا ایشیائی ورژن سمجھا جاتا ہے، کے سربراہ قاضی حسین احمد
- سلفی اور وہابی مذہبی رجحان والی کالعدم عسکری تنظیم جماعت الدعوۃ اور سابقہ لشکر طیبہ کے سربراہ حافظ محمد سعید
- طالبان کی حامی دیوبندی مکتبۂ فکر پر مشتمل بااثر سیاسی جماعت اور مسلمان علماء کے گروپ جے یو آئی کے سربراہ مولانا فضل الرحمان
- احیائے خلافت اسلامی کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد

تاہم القاعدۃ کی دعوت پر جن لوگوں نے سچے دل سے لبیک کہا ان میں نمایاں اسلام آباد کی لال مسجد کے پیش امام مولانا عبد العزیز اور عبد الرشید غازی تھے۔ لال مسجد کے زیر انتظام اسلام آباد میں دو مدارس تھے۔ مسجد سے ملحق جامعہ حفصہ طالبات کا مدرسہ تھا اور ای سیون میں واقع جامعہ فریدیہ طلبا کا مدرسہ تھا۔ دونوں مدارس میں سات ہزار سے زائد طلبا و طالبات تھے۔ مسجد کے بانی مولانا عبد اللہ تھے جو روس کے خلاف افغان جہاد میں شامل رہے تھے اس لیے اس ادارے کے ملا عمر، ڈاکٹر ایمن الظواہری، طاہر یلدوشف اور اسامہ بن لادن سے گہرے روابط تھے۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں مولانا عبد اللہ کی شہادت کے بعد ان کے دونوں بیٹے مولانا عبد العزیز اور غازی عبد الرشید بالترتیب مسجد کے امام اور نائب امام مقرر ہوئے۔ دونوں بھائی اپنے والد کی طرح فرضِ جہاد سے وابستہ تھے۔

پاکستان آرمی نے ۲۰۰۳ کے وسط سے جہادیوں کے خلاف اپنی کارروائیاں بہت تیز کر دی تھیں۔ یہ آپریشن شروع سے ہی پسند نہیں کیے گئے۔ یہاں تک کہ سیکولر جماعتیں بھی ان

کے حق میں بولنے پر تیار نہیں تھیں۔ عوام کے خیال میں طالبان استعماریت کے خلاف مزاحم تھے لہٰذا عوام نے طالبان کے خلاف فوجی کارروائیوں کو پاکستان کی نو استعماریت کی حمایت تصور کیا۔ قاضی حسین احمد، عمران خان اور نواز شریف جیسے سیاستدانوں نے صدر مشرف کو موردِ الزام ٹھہرایا کہ وہ بطور صدر اپنی مدت کو طول دینے اور اپنی فوجی آمریت کے لیے مغربی حکومتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے معصوم قبائلی مسلمانوں کا خون بہا رہا ہے۔ امریکہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ کشمیر میں اپنے عسکری کیمپ بند کر دے۔ اس سے پاکستان میں امریکی مخالفت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ القاعدۃ کو اس صورتحال کا فائدہ اٹھانے کے لیے بس تھوڑی سی کوشش درکار تھی۔

القاعدۃ کی ہدایت پر مولانا عبدالعزیز نے (پانچ سو مفتیانِ کرام سمیت) ۲۰۰۴ میں ایک فتویٰ جاری کیا کہ جنوبی وزیرستان میں جاری فوجی آپریشن غیر اسلامی ہے۔ فتوے میں کہا گیا کہ فوجیوں کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں نہ دفنایا جائے۔ جنوبی وزیرستان میں مسلمان جنگجوؤں کے خلاف حملے میں مارے جانے والوں کی نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے۔ یہ فتویٰ پورے ملک میں بانٹا گیا اور اس پر پانچ سو مفتیانِ کرام کے دستخط موجود تھے۔ اس فتوے نے پاکستان میں امریکہ مخالف جذبات کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ پاکستان آرمی کی تذلیل کرنے میں جنگجوؤں کے سارے ہتھیار بھی اتنا کام نہ کرتے جتنا کہ اس ایک فتوے نے کر دکھایا۔

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ میڈیا نے کئی واقعات رپورٹ کیے کہ اس فتوے کے بعد بہت سے والدین نے پاکستان آرمی کی جانب سے لڑنے والے اپنے بیٹوں کی لاشیں وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ مذہبی علماء نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان آرمی کے ہر سپاہی اور جرنیل کا حوصلہ پست ہو گیا۔ نچلے درجوں سے تعلق رکھنے والے درجنوں نان کمیشنڈ افسروں نے اپنے افسروں کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا اور ان کا

کورٹ مارشل کر دیا گیا۔ تقریباً اتنی ہی تعداد میں افسروں نے جنوبی وزیرستان میں اپنی تعیناتی کے احکام ملنے پر استعفیٰ دے دیا۔ پاکستان آرمی ۲۰۰۴ میں جنگجوؤں کو شکست دینے کے لیے بالکل تیار تھی لیکن القاعدۃ نے بروقت لال مسجد کی چال چل کر اس کے پر کاٹ دیے۔ لال مسجد کے دونوں بھائی طاہر یلدوشف اور شیخ عیسیٰ سمیت القاعدۃ کے بڑے رہنماؤں سے باقاعدۃ رابطے میں تھے (جہادی رہنماؤں سے یہ روابط مولانا عبدالعزیز کے والد مولانا عبداللہ کے دور سے تھے [1]) اور حکمتِ عملی کی ہدایات ان تک پہنچتی رہتی تھیں۔

۲۰۰۷ میں لال مسجد اسلام آباد میں آئی ایس آئی اور راولپنڈی میں ملٹری ہیڈ کوارٹر کی عین ناک کے نیچے القاعدۃ کا پاور ہاؤس بن چکی تھی۔ اس دوران پورے ملک میں جنگجوؤں کی طاقت بڑھتی رہی۔ ان کا اثرورسوخ جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان، پھر باجوڑ، مہمند اور اور کزئی ایجنسیوں تک پھیل گیا۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ان کی کل تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر گئی اور تحریک آزادیٔ کشمیر پر پابندی کی وجہ سے اس تحریک کے جہادیوں نے وزیرستان ہجرت کر کے اس تعداد میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس ہجرت میں تحریک آزادیٔ کشمیر کے بہادر کمانڈر الیاس کشمیری اور عبدالجبار بھی شامل تھے۔

امریکی سی آئی اے اور پاکستانی آئی ایس آئی نے جنگجوؤں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے بارے میں رپورٹ پر رپورٹ پیش کی اور مزید نقصان سے بچنے کے لیے پاکستانی حکومت کو بروقت اقدامات کرنے کی ہدایت کی۔ پاکستان نے پہلے سے بڑا آپریشن کرنے کی کوشش کی لیکن القاعدۃ کے پاس لال مسجد کی صورت میں ترپ کا پتا موجود تھا۔ وہ جنگ نہیں کر سکتے تھے

1۔ غازی عبدالرشید نے ایک انٹرویو میں اپنے والد مولانا عبداللہ سمیت اسامہ بن لادن سے ملاقات کا تذکرہ کیا، جس کی وجہ سے بعد میں خفیہ ایجنسیوں کی جانب سے مولانا عبداللہ کو قتل کیا گیا۔ مترجم

اور پاکستان سیز فائر کے معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مشرف اور اس کے حواریوں نے لال مسجد لابی کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا پلان کئی مرتبہ بنایا لیکن ملٹری انٹیلی جنس نے ہر دفعہ مخالفت کی۔ وجہ یہ تھی کہ ملکی فضا پہلے ہی امریکا مخالف جذبات سے بھری ہوئی تھی اور ان حالات میں لال مسجد اور اس کے حامیوں کے خلاف کارروائی کرنے کا مطلب معاملات کو بڑھاوا دینا تھا۔ پاکستان کی مسلح افواج کے لوگوں، بااثر تاجروں اور بیوروکریٹس کی درجنوں بیٹیاں لال مسجد کے مدرسے میں زیرِ تعلیم تھیں۔ قبائلی علاقوں میں کارروائیوں سے سپاہیوں کی ممکنہ بغاوت سے پریشان مشرف حکومت وفاقی دارالحکومت میں کسی سیاسی بحران کا سامنا کرنے کی متحمل نہیں تھی۔ لال مسجد کے معاملے میں یہ تاخیر خوفناک ثابت ہوئی۔

یہ جاننا کوئی حیرت کی بات نہیں کہ امریکہ اور برطانیہ پاکستان پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ایسی حکمتِ عملی وضع کی جائے کہ جنگجوؤں کو فیصلہ کن شکست ہو۔ یہی وہ وقت تھا جب امریکہ نے مشرف کو بینظیر سے ڈیل کرنے پر دباؤ ڈالا اور جہادیوں کے لیے بڑھتی ہوئی عوامی حمایت کم کرنے کے لیے سیکولر اور لبرل جماعتوں کا اتحاد قائم کیا۔ اور اسی دوران ہی مغربی انٹیلی جنس نے پاکستان میں القاعدۃ کے اثاثوں کا مکمل نقشہ تیار کیا۔ یہ اثاثے اسلام آباد میں لال مسجد سے شروع ہو کر وادی سوات سے ہوتے ہوئے مالاکنڈ میں ملافضل اللہ کی صورت میں تھے۔ مزید برآں، تحریک نفاذِ شریعتِ محمدی بھی باجوڑ، شمالی اور جنوبی وزیرستان کے جنگجوؤں سے جڑی ہوئی تھی۔ اس صورتحال میں امریکی اور برطانوی اہلکاروں نے پاکستان کا دورہ کیا اور یکے بعد دیگرے پاکستان پر زور دیا کہ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے جامع حکمتِ عملی وضع کرے۔

یہ سارا کھیل القاعدۃ کے علم میں تھا۔ اس نے اس کی تکمیل سے پہلے ہی اس پر وار کر دیا۔ جنوری ۲۰۰۷ میں پاکستانی طالبان نے جنوبی وزیرستان میں پاکستانی سکیورٹی فورسز کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ختم کر کے ان کے ٹھکانوں پر اچانک حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ راولپنڈی میں پاکستانی جی ایچ کیو اس چال سے حیران پریشان تھا اور ابھی اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لال مسجد کے طالب علم بازاروں میں نکل آئے۔ ایشو کے طور پر انہوں نے چند ایک مساجد کی مسماری کا معاملہ اٹھایا جو غیر قانونی مقبوضہ زمین پر تعمیر کی گئی تھیں۔ حالات قابو میں رکھنے کے لیے حکومت نے فوراً طالب علموں کا مطالبہ مان لیا کہ مزید مساجد مسمار نہیں کی جائیں گی۔ انتظامیہ نے مسمار کی گئی مساجد کے اجتماعات کے لیے متبادل زمین دینے کا وعدہ بھی کیا۔ تاہم لال مسجد کے انقلابی اس بات پر ڈٹ گئے کہ مساجد دوبارہ اسی زمین پر تعمیر کی جائیں گی جہاں وہ پہلے تعمیر تھیں۔

مولانا عبد العزیز اور غازی عبد الرشید کے رویے پر بڑبڑاتی پاکستانی حکومت کو بالکل یہ علم نہیں تھا کہ دونوں بھائی دراصل امریکی مفادات کو سبوتاژ کرنے کی القاعدۃ کی وسیع حکمتِ عملی کے لیے یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ مسجد سے ملحقہ چلڈرن لائبریری پر لال مسجد کی طالبات کے قبضے نے پوری دنیا کی توجہ حاصل کی۔ طالبات نے اعلان کیا کہ وہ لائبریری اس وقت تک خالی نہیں کریں گی جب تک پورے ملک میں شریعت کا نفاذ نہیں ہو جاتا۔

پاکستان اور پاکستان سے باہر مسلم علماء لال مسجد کے معاملے پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ لال مسجد برادران کے روحانی پیشوا اور معزز اسلامی معیشت دان مفتی تقی عثمانی صاحب، ان بھائیوں کے متشدد اسلامی ایجنڈے پر ان سے تفصیلی بات چیت کرنے کے لیے کراچی سے اسلام آباد پہنچے۔ عبد العزیز، تقی عثمانی صاحب کے سوالات کے جواب نہ دے پائے اور قرآن و سنت اور سلف کی روشنی میں جواب دینے کی بجائے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکے

کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے یہ اقدام ضروری ہیں۔ مفتی تقی عثمانی صاحب اس قدر مایوس اور لال مسجد کے علماء کے رویے پر اس قدر غصہ ہوئے کہ انہوں نے مولانا عبدالعزیز کو اپنے حلقہ ارادت سے نکال دیا۔ عثمانی صاحب نے واضح اعلان کر دیا کہ اب ان کے درمیان کوئی روحانی تعلق باقی نہیں رہا۔ عبدالعزیز کی اس سے زیادہ تذلیل نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ جس راستے پر چل نکلے تھے اس سے ہٹنا انہیں گوارا نہیں تھا۔

میڈیا پر جب مشرف اور بینظیر کی خفیہ میٹنگ کی خبر چلی تو لال مسجد کے احتجاج میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جامعہ حفصہ کی طالبات نے ایک دلال عورت (آنٹی شمیم) کو اغوا کر لیا جس سے لال مسجد بحران مزید شدت اختیار کر گیا۔

۹ مارچ ۲۰۰۷ کو صدر مشرف نے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو برطرف کر دیا۔ اس سے وکلاء کی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند ہفتوں میں میڈیا، سول سوسائٹی اور کئی سیاسی جماعتیں وکلاء تحریک کی حمایت میں شامل ہو گئیں۔ لال مسجد ایشو کے ساتھ اس نئی مصیبت نے مشرف حکومت کو وزیرستان میں مؤثر آپریشن کرنے کے قابل ہی نہ چھوڑا۔ جیسے جیسے وکلاء تحریک نے زور پکڑا، لال مسجد کی (انقلابی) کارروائیوں میں تیزی آتی گئی۔ اسلام آباد کے مرکز میں لال مسجد کے نگرانوں نے ویڈیو اور میوزک دکانیں زبردستی بند کرا دیں۔ جب قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ان کے طلباء کو گرفتار کیا تو ان کے ساتھی طلباء نے ان (گرفتار طلباء) کو حکومتی تحویل سے تبادلے کے طور پر چھڑوانے کے لیے ان اداروں کے آدمی اغوا کر لیے۔ وزارتِ داخلہ نے عبدالعزیز اور عبدالرشید کو مطلوب افراد کی فہرست میں ڈال دیا اور پولیس نے لال مسجد کو گھیرے میں لے لیا۔ لیکن لال مسجد کے طلبا نے ایسا خوف پیدا کیا کہ پولیس فاصلے پر ہی رہی۔ ان حالات میں عبدالعزیز کے شعلہ بیان

خطباتِ جمعہ عوام کو غیرت دلاتے رہے جن میں مسجد کے باہر تعینات پولیس کے اہل کار بھی شامل تھے۔

شمالی وزیرستان میں القاعدۃ قیادت اس بات سے واقف تھی کہ جلد ہی لال مسجد کا کردار ختم ہو جائے گا۔ حکومت کی حدِ برداشت ختم ہونا ہی تھی اور لال مسجد کے علماء کے خلاف سخت کارروائی بالکل واضح نظر آرہی تھی۔ شمالی وزیرستان میں القاعدۃ کی شوریٰ کا اجلاس ہوا اور طویل بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ جب لال مسجد کے خلاف متوقع کارروائی شروع ہو گی تو پاکستان میں القاعدۃ کی جدوجہد آخری نکتے پر ہو گی، اس لیے جواباً القاعدہ کی پاکستان اور امریکہ کے خلاف کھلی جنگ اب ناگزیر ہو چکی تھی۔

جولائی ۲۰۰۷ میں فوج نے لال مسجد کے خلاف آپریشن شروع کر دیا اور کئی دنوں کے محاصرے کے بعد فوجی دستے مسجد کے اندر داخل ہو گئے۔ مولانا عبدالعزیز نے برقعہ پہن کر نکلنے کی کوشش کی لیکن گرفتار ہو گئے۔ عبدالرشید غازی، ان کی والدہ، اور عبدالعزیز کے بیٹے کو سکیورٹی فورسز نے بلا توقف شہید کر دیا۔ طلبا و طالبات کی بڑی تعداد بھی ماری گئی۔ امریکہ کا پہلا مقصد حاصل ہو گیا۔ اسلام آباد میں القاعدۃ کا اہم اثاثہ ختم کر دیا گیا۔ پاکستان امریکہ اتحاد اب القاعدۃ کے خلاف بھرپور جنگ کے لیے تیار تھا۔

سیاسی منظر نامے میں مشرف بینظیر ڈیل پنپ چکی تھی اور بینظیر بھٹو اکتوبر میں وطن واپس آرہی تھی۔ عسکری محاذ پر سوات اور وزیرستان میں فوجی آپریشن کی مکمل تیاری تھی۔ لیکن مشرف دورِ حکومت کے لیے معاملات اتنے سیدھے نہیں رہے۔ لال مسجد میں قتلِ عام پر زبردست ردِ عمل سامنے آیا۔ مشرف کی برسرِ اقتدار جماعت قاف لیگ اس آپریشن کی ذمہ داری لینے پر تیار نہیں تھی۔ سول سوسائٹی کی تحریک تیز ہو رہی تھی، سپریم کورٹ نے چیف جسٹس کو بحال کر دیا تھا اور اپوزیشن لیڈر نواز شریف وطن واپسی پر غور کر رہا

تھا۔ لیکن لال مسجد کی داستان ختم ہو چکی تھی۔ عبد الرشید غازی شہید ہو چکے تھے اور مولانا عبد العزیز گرفتار کر لیے گئے تھے۔ کہانی اپنے انجام کو پہنچی۔ پھر القاعدۃ نے ایک ویڈیو جاری کی جس میں عبد الرشید غازی کو امامِ برحق کہا گیا اور اس بات کا عہد کیا گیا کہ لال مسجد کے قتلِ عام کا بدلہ لیا جائے گا (اس ویڈیو میں اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، یحییٰ اللیبی سمیت اہم القاعدہ رہنماؤں کے پیغامات اور پاکستانی افواج کے خلاف کھلی جنگ شروع کرنے کا اعلان بھی شامل تھا)۔ اس سے القاعدۃ کی الف لیلۃ میں ایک اور باب کا اضافہ ہوتا ہے۔

لال مسجد آپریشن کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے پاکستان پر زور دیا کہ القاعدۃ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے جلد از جلد آپریشن شروع کیا جائے۔ لیکن القاعدۃ نے بڑی سرعت کے ساتھ کسی بھی نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو دوبارہ منظم کر لیا۔ اگرچہ القاعدۃ جنوبی ایشیا کے لیے امریکی منصوبے کو مکمل تباہ کرنے کے قابل نہیں تھی لیکن اس منصوبے پر کاری ضرب لگانے میں کامیاب رہی۔ اگلی دفعہ جب مستقبل کی حکمتِ عملی کے بارے میں شمالی وزیرستان میں القاعدۃ شوریٰ کا اجلاس ہوا تو اس بات پر اتفاق ہوا کہ پاکستان امریکہ اتحاد اس قدر مضبوط ہو چکا ہے کہ چھوٹے موٹے حربوں سے کام نہیں چلے گا۔ ریاست پاکستان (یعنی امریکی اتحاد میں شامل اور اس کے براہ راست معاون اداروں، پاک فوج اور سیاسی حکمرانوں) کی تکفیر پر پوری شوریٰ ہم آواز تھی اور ریاست پاکستان کے خلاف خروج پر سب ارکان متفق تھے۔ لال مسجد کے علماء نے اگلی لڑائی کے لیے میدان بنا دیا تھا اور القاعدۃ کو لال مسجد آپریشن کی غیر مقبولیت سے فائدہ اٹھانا تھا۔

اسلامی فقہ میں ایک مسلم ریاست کے خلاف خروج اسی وقت جائز ہے جب حکمران اور انتظامیہ تمام حدود پامال کر دے۔ پہلا خروج نواسۂ رسول ﷺ حسین ابن علیؓ نے کیا تھا، جب اموی حکمران یزید بن معاویہؓ کو موروثی طریقے سے خلیفہ بنایا گیا۔ یہ

اسلامی روایت کی خلاف ورزی تھی۔ اسلامی روایت میں مسلمان آبادی کی رضا مندی سے ایک مسلمان حکمران کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

القاعدۃ نے امام ابن تیمیہؒ جیسی حکمتِ عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ منگولوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے ابن تیمیہؒ کو بھی ایسے ہی حالات درپیش تھے۔ منگول ایک غیر ملکی طاقت تھے جو اسلام قبول کر چکے تھے لیکن اسلامی شریعت کو واحد ماٰخذ قانون نہیں مانتے تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے ایسے قوانین متعارف کروائے جو اسلام اور منگول روایات کے اختلاط سے بنے تھے۔ اس طرح سلطنت میں دو متوازی قانونی نظام بن گئے تھے۔ منگول بغداد پر پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے اور اب ان کی نظریں دوسرے اسلامی شہروں پر تھیں۔ شام اور مصر کے مسلمان حکمران ناصر الدین بے یقینی کی کیفیت میں تھے کہ ان کی فوجیں منگول حملے کے خلاف ملک کا دفاع کرنے کی اہل نہیں ہیں۔ چنانچہ انہوں نے منگولوں کو اپنی غیر جانبداری کا یقین دلایا کہ اگر منگول دوبارہ بغداد پر حملہ کرنا چاہیں تو وہ ان کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ ابن تیمیہؒ کے نزدیک ایک مسلم ریاست کے دفاع میں جہاد سے انکار کرنا ایک مسلمان حکمران کا ارتداد تھا۔ ابن تیمیہؒ نے اس دلیل کو حکمران کے خلاف بغاوت کے لیے کافی سمجھا۔ پھر آپ نے ناصر الدین کو خبردار کیا کہ اگر بغداد پر قبضے کی صورت میں اس نے منگولوں سے معاہدہ نہ توڑا تو آپ تاتاریوں کے خلاف جہاد روک کر اس کے خلاف خروج کریں گے۔ آپ نے ناصر الدین کو دھمکی دی کہ آپ پہلے اس سے تخت چھینیں گے اور پھر منگولوں کے خلاف آزادانہ طور پر لڑائی کریں گے۔ ابنِ تیمیہؒ کی تنبیہ کی وجہ سے ناصر الدین مزاحم فوجوں سے ملنے پر مجبور ہو گیا اور اسے منگولوں کے خلاف لڑنا پڑا۔

القاعدۃ نے لال مسجد آپریشن کے بعد اسی اصول کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اسامہ بن لادن نے عبد الحمید یعنی ابو عبیدہ المصری کو پاکستان میں امامِ خروج مقرر کیا۔ آپ کی آمد سے نئی حکمتِ عملی کا آغاز ہوا اور القاعدۃ کی الف لیلۃ میں کچھ نئے کردار سامنے آئے۔

Af-Pak میدانِ جنگ

لال مسجد بغاوت کے خاتمے سے واقعات میں ایک اہم موڑ آیا۔ پاکستان کے لیے امریکی عزائم مزید واضح ہو گئے۔ اس نے القاعدۃ کے خلاف مشن کامیاب بنانے کے لیے ایک تگڑم بنایا۔ اس تگڑم میں ملٹری چیف تھا جو وار آن ٹیرر میں مکمل طور پر امریکہ کے ساتھ تھا، لبرل اور سیکولر طاقتوں پر مشتمل امریکی حمایتی پارلیمنٹ تھی جو اس جنگ کو مقبول بنانے کے لیے ڈھول پیٹ رہی تھی، ایک طاقتور سول صدر تھا جو تمام معاملات پر نظر رکھ کر امریکی سیاسی انتظامیہ کو رپورٹ دیتا۔ ملٹری اور سول امداد کے امریکی پیکج صدر کے ذریعے ہی آنا تھے۔ ان تیاریوں کے ساتھ مغرب نواز جنرل اشفاق پرویز کیانی، جو امریکی ملٹری کمانڈ کے بہت قریب تھا، کو اکتوبر میں وائس چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا اور مستقبل کا چیف آف آرمی سٹاف نامزد کر دیا گیا۔ کیانی، مشرف کا پسندیدہ جانشین نہیں تھا۔ مشرف چاہتا تھا کہ جنرل طارق مجید آرمی چیف بنے، لیکن کیانی امریکی انتخاب تھا۔ اس کی تقرری مسلح افواج کی روایت کے خلاف تھی کیونکہ پاکستانی فوجی تاریخ میں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کو آرمی چیف کبھی نہیں بنایا گیا۔ اس کی توجیہہ یہ تھی کہ ڈی جی آئی ایس آئی کا تعلق انٹیلی جنس سے ہوتا ہے جسے سیاستدانوں سے رفاقت رکھنا پڑتی ہے اور یہ سیاستدان اسے ملٹری نقطۂ نظر سے ملکی و غیر ملکی پالیسی ایشوز سے دور کرنے میں اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ انٹیلی جنس سربراہوں کو دوسرے ملکوں کی انٹیلی جنس سے قریبی رابطہ اور بعض اوقات دوستانہ تعلقات رکھنا پڑتے

ہیں لہٰذا اگر کسی انٹیلی جنس چیف کو آرمی چیف بنادیا جائے تو ہمیشہ یہ خطرہ موجود رہے گا کہیں قومی دفاعی مفادات پر سمجھوتہ نہ ہو جائے۔

کیانی کے ریکارڈ سے ظاہر تھا کہ وہ بے رحم ثابت ہو گا۔ اکتوبر ۲۰۰۷ میں بطور وائس چیف آف آرمی سٹاف اس نے پاکستانی فضائیہ کو میر علی اور سوات میں بلا تفریق بمباری کرنے کے لیے استعمال کیا۔ سیکڑوں سویلین مارے گئے۔ مشرف کے برعکس کیانی کو ضمنی نقصانات کی بھی کوئی پروانہیں تھی۔ اسی طرح شمالی وزیرستان، جنوبی وزیرستان، باجوڑ، مہمند اور سوات میں ۲۰۰۸ اور ۲۰۰۹ کے ملٹری آپریشن کے دوران لاکھوں لوگوں کو بے گھر کرنے کے معاملے میں بھی کیانی بے حس رہا تھا۔

بینظیر بھٹو کی سیاست میں واپسی کے بعد ملک میں موجود القاعدۃ کے تمام سٹریٹجک اثاثے ختم کرنے کے لیے پاکستان سے فوجی آپریشن کروائے جانے تھے۔ آغاز وادی سوات سے ہونا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ ملٹری سوات میں پوزیشنیں سنبھالتی، جنگجوؤں نے ۲۰۰۶ کا میران شاہ معاہدہ ختم کر دیا اور لال مسجد کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی شمالی اور جنوبی وزیرستان میں پاکستانی سکیورٹی فورسز کے ٹھکانوں پر حملے شروع کر دیے۔ ۲۴ جولائی سے ۲۴ اگست ۲۰۰۷ تک (سرکاری اعداد و شمار کے مطابق) ۲۵۰ جنگجو اور ۶۰ فوجی مارے جا چکے تھے۔ ۲ ستمبر ۲۰۰۷ کو بیت اللہ محسود کی قیادت میں چند درجن جنگجوؤں نے گھات لگا کر سترہ گاڑیوں اور ۲۴۷ فوجیوں پر مشتمل فوجی کانوائے بغیر کوئی گولی چلائے پکڑ لیا۔ اس واقعے نے قوم کو حیران کر کے رکھ دیا۔ پکڑے جانے والوں میں کئی افسران بھی شامل تھے۔ زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے جنگجوؤں نے بی بی سی کو مدعو کیا کہ ان افسروں کو جنگجوؤں کی حمایت میں بولتا سنے۔ اس کے بعد فوج وزیرستان کے ملٹری ہیڈ کوارٹرز میں واپس پلٹ آئی اور جگہ جگہ ناکے لگا کر علاقے کو چھاؤنی میں بدل دیا۔ اس سے جنگجوؤں کے حوصلے پست نہ ہوئے۔

وسط ستمبر میں طالبان نے پورے وزیرستان میں فوجی چوکیوں پر حملے کیے۔ یہ حملے علاقے میں پاکستانی طالبان اور سکیورٹی فورسز کے درمیان شدید ترین لڑائی کا باعث بنے۔ پاکستانی طالبان نے چوکیوں پر پہلا حملہ ۱۲ ستمبر ۲۰۰۷ کو کیا اور بارہ فوجی پکڑ لیے۔ اس سے اگلے دن ایک خود کش حملہ آور نے غازی تربیلا میں آرمی میس پر حملہ کر کے مرکزی میس ہال تباہ کر دیا۔ اس حملے میں ایس ایس جی کے بیس اہلکار مارے گئے اور ۲۹ زخمی ہوئے۔ حملوں کے اس سلسلے میں ۲۰ ستمبر ۲۰۰۷ تک پاکستان آرمی کی مزید پانچ چوکیاں تباہ اور مزید پچیس فوجی پکڑے گئے۔ کل ملا کر ۶۵ سے زائد فوجی مرے اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ جنگجوؤں کے زیادہ تر حملے لال مسجد کے قتلِ عام کا فوری ردعمل تھے جس میں حکومت کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا گیا۔

تقریباً دو ہفتوں بعد آرمی نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے گن شپ ہیلی کاپٹروں، جیٹ فائٹروں اور زمینی دستوں کی مدد سے جنگجوؤں کے ٹھکانے تباہ کرنے کے لیے میر علی پر حملہ کر دیا۔ ۷ اکتوبر سے ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۷ تک ۲۵۷ لوگ مارے گئے جن میں ۱۷۵ جنگجو، ۴۷ فوجی اور ۳۵ عام شہری تھے۔ پھر القاعدۃ نے خطے میں امریکی عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے منصوبوں میں بہتری لانے کا فیصلہ کیا۔ ایک طرف پاکستانی شہروں کو میدانِ جنگ بنایا جا رہا تھا اور دوسری طرف مشرف نے آئی ایس آئی کو سیکولر اور لبرل جماعتوں کی سیاسی فتح کا کام سونپ دیا تھا۔ آئی ایس آئی نے اے این پی، جے یو آئی (ف)، ایم کیو ایم اور مسلم لیگ (ق) میں گٹھ جوڑ کرایا۔ مشرف نے ۵ اکتوبر ۲۰۰۷ کو این آر او کا اعلان کر دیا۔ اس کی رو سے ان تمام سیاستدانوں، سیاسی ورکروں اور بیوروکریٹس کو عام معافی مل گئی جن پر یکم جنوری ۱۹۸۶ سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ تک بد عنوانی، غبن، منی لانڈرنگ، قتل اور دہشت گردی کے الزامات تھے۔ یہ ایک امتیازی قانون تھا جس کا اصل مقصد بینظیر بھٹو اور آصف زرداری کے

خلاف بدعنوانی کے مقدمات ختم کرنا تھا۔ جیسے ہی این آر او کا اعلان ہوا، بینظیر نے پاکستان واپسی کا اعلان کر دیا۔

القاعدۃ کے لیے جرأت دکھانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ بینظیر بھٹو ایک مقبول سیاستدان تھی اور اپنی مقبولیت کی وجہ سے جب وہ کھلے حلقوں میں آتی تو آسان ہدف بنتی۔ القاعدۃ نے اس کے قتل کے فوائد اور نقصانات پر غوروخوض کیا۔ اس بات پر اتفاق ہوا کہ اس کے قتل سے سیاسی فضا تبدیل ہو جائے گی۔ القاعدۃ کو معلوم تھا کہ بینظیر کے قتل کا فائدہ صرف اسے ہی نہیں ہو گا بلکہ جنوبی ایشیا میں امریکی عزائم پر بھی کاری ضرب لگے گی۔ بینظیر کے قتل کا منصوبہ ۲۰۰۸ کے امریکی انتخابات سے پہلے بن چکا تھا۔ القاعدۃ نے بھانپ لیا تھا کہ ڈیموکریٹ پارٹی کا امیدوار باراک اوباما جیت جائے گا اور اس بات کا یقین تھا کہ اگر انتقالِ اقتدار کے اس مرحلے پر بینظیر کو قتل کیا جائے تو پاکستان میں امریکی منصوبوں کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ ملک بھر میں القاعدۃ سے منسلک کئی گروپ فعال کر دیے گئے۔ بینظیر جب کراچی ایئر پورٹ پر اتری تو ہزاروں لوگ اس کا استقبال کرنے اور گھر تک پہنچانے کے امڈ آئے۔ ابھی یہ جلوس راستے میں ہی تھا کہ خودکش بمباروں نے حملہ کر دیا۔ بینظیر بھٹو تو محفوظ رہی لیکن ۱۳۶ لوگ جاں بحق اور ۴۵۰ زخمی ہو گئے۔ اس حملے نے مشرف اور بینظیر اتحاد میں واضح دراڑ ڈال دی۔ سکیورٹی خامیوں پر مشرف حکومت کے خوب لتّے لیے گئے اور بینظیر بھی ڈٹی رہی۔ اس نے خیبر پختونخوا سمیت سارے ملک میں جلسے کیے اور ہر جگہ جنگجوؤں کے خلاف بولا۔ یہ واحد پاکستانی سیاستدان تھی جس نے لال مسجد آپریشن کی کھلے عام حمایت کی تھی۔

اپنے سیاسی کیریئر میں پہلی (اور آخری) دفعہ بینظیر نے اپنی انتخابی مہم میں قومی سیاست پر توجہ نہ دی۔ اس کی تمام تقریریں دہشت گردوں اور القاعدۃ کے خلاف تھیں۔ نتیجہ یہ کہ دہشت گردوں نے اس کے تمام سیاسی جلسوں میں اس کا تعاقب کیا لیکن ان کو

موقع ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ کو راولپنڈی کے جلسے میں ملا۔ بینظیر کے قتل کے ساتھ ہی چند گھنٹوں کے اندر اندر پورا ملک حالتِ انتشار میں تھا۔ پورے ملک میں (پیپلز پارٹی کے جیالے) انتشار پسند بپھرے ہوئے تھے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا نام ونشان نہیں تھا۔ سندھ میں درجنوں ٹرینوں پر حملے ہوئے اور ملک میں سرکاری اور نجی املاک تباہ کر دی گئیں۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ کے واقعے سے پہلی بار پاکستان کی اندرونی سکیورٹی کی کمزوریاں سامنے آئیں۔ القاعدۃ پاکستان کے شہری علاقوں میں بحرانی صورتحال پیدا کرنے میں کامیاب رہی۔ یہ صورتحال پیدا کرنے کا مقصد اس انقلابی اسلامی طاقت کے خلاف امریکی عزائم کی تکمیل میں پاکستانی حمایت ختم کرنا تھا۔ تاہم القاعدۃ خود بھی بحران کا شکار ہوئی اور اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہی۔ دراصل امیرِ خروج عبیدۃ المصری ہیپاٹائٹس سی میں مبتلا تھے۔ اس بیماری سے وہ اتنے نحیف ہو چکے تھے کہ ۲۷ دسمبر کے بعد کے حالات سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ بینظیر کے قتل کے چند دنوں بعد عبیدۃ المصری بھی فوت ہو گئے اور ان کی جگہ خالد حبیب کو پاکستان میں کارروائیوں کا امیر مقرر کیا گیا۔ چند مہینوں بعد خالد حبیب بھی ڈرون حملے میں مارے گئے۔

جنوری اور فروری ۲۰۰۸ میں پاکستان میں خودکش حملوں کی تعداد افغانستان اور عراق میں ہونے والے حملوں سے زیادہ تھی۔ لیکن چونکہ عبیدۃ المصری کی غیر متوقع وفات کی وجہ سے القاعدۃ کی صفوں میں کوئی ربط نہیں رہا تھا اس لیے ان حملوں سے خاص سٹریٹجک فوائد حاصل نہیں ہوئے۔ تاہم القاعدۃ ایک اہم مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ 8 جنوری ۲۰۰۸ کے مجوزہ انتخابات سے پہلے بینظیر کے قتل سے سیکولر اور لبرل جماعتوں اور سکیورٹی فورسز کو القاعدۃ کے خلاف متحد کرنے کا امریکی منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اس سے امریکہ، پاکستانی فوج اور مشرف ایک کونے میں دھکیل دیے گئے۔ اس خطے کے بارے میں سارا

امریکی روڈ میپ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ الیکشن ملتوی ہو گئے۔ اگرچہ بینظیر کے قتل سے پیپلز پارٹی کو ہمدردی کے بہت زیادہ ووٹ ملے اور ۱۸ جنوری ۲۰۰۸ کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی لیکن مغرب میں بیٹھے سیاسی پنڈتوں کی نظروں میں بینظیر کی اچانک موت سے پاکستان کا سیاسی توازن بگڑ گیا تھا۔ مشرف نے ۲۷ نومبر ۲۰۰۷ کو وردی اتار دی۔ بینظیر اور اس کے درمیان ہونے والا مفاہمتی معاہدہ اب باقی نہیں رہا تھا۔ امریکی ری پبلکن صدر جارج بش کی انتظامیہ اس معاہدے کی ضامن تھی لیکن اب بش جا رہا تھا اور نئی انتظامیہ ابھی آئی نہیں تھی۔ اس چوراہے پر مؤثر سیاسی فیصلے کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس سے پہلے سعودی عرب کے دباؤ کے نتیجے میں مشرف، نواز شریف اور شہباز شریف کو ملک واپسی کی اجازت دینے پر مجبور ہو چکا تھا۔ لال مسجد قتلِ عام اور عدلیہ بحران کی وجہ سے مشرف کی زبردست حمایتی قاف لیگ کے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ نواز شریف کی جماعت توقع سے زیادہ نشستیں جیت کر پارلیمنٹ میں پہنچ گئی لہٰذا اسے شامل کیے بغیر اتحادی حکومت بنانا ناممکن ہو گیا تھا۔ مشرف مسائل میں پھنس گیا۔ نئے آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی کا پہلا ہدف عوام میں پاکستان آرمی کا تاثر بحال کرنا تھا۔ یہ تاثر فوج کی سیاست میں بار بار مداخلت، عدلیہ بحران اور لال مسجد آپریشن کی وجہ سے بہت حد تک خراب ہو چکا تھا۔ ان حالات میں ریٹائرڈ شدہ جنرل مشرف ایک بوجھ تھا۔ ملٹری نے سیاست سے دور ہٹنا شروع کر دیا اور سول عہدوں سے فوجیوں کو ہٹانے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا۔ کیانی خود بھی مشرف سے دور رہا اور اپنے ساتھیوں کو بھی یہی مشورہ دیا۔

مشرف نے بطور صدر اور مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے دوبار آرمی چیف کو ہٹانے اور جنرل طارق مجید کو لانے کی کوشش کی۔ لیکن جنرل مجید نے انکار کر دیا کہ یہ فوجی نظم و ضبط کے خلاف ہے۔ جنرل مجید کے خیال میں اس طرح کے اقدام سے فوج میں

بحران پیدا ہو گا۔ بطور پروفیشنل فوجی وہ اس طرح کی حرکت کے خلاف تھا۔ کیانی کو آرمی چیف کے عہدے سے ہٹانے میں ناکامی کا مطلب مشرف کا مزید زوال تھا۔ پاکستانی سیاستدانوں نے یہ منظر غور سے دیکھا اور نئے عہدوں کے لیے جوڑ توڑ شروع کر دیا۔ مشرف کے بڑے اتحادیوں مسلم لیگ (ق) اور ایم کیو ایم نے دوسری راہیں دیکھنا شروع کر دیں۔ مشرف کے سابقہ حمایتیوں جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمان گروپ اور اے این پی نے اپنی وفاداریاں ابھرتے ہوئے سیاسی اتحاد سے جوڑ لیں۔ مشرف کی سخت دشمن نواز لیگ نے اسے اقتدار سے باہر کرنے کی مہم شروع کر دی۔ پیپلز پارٹی نئی ملٹری اسٹیبلشمنٹ اور امریکہ کی خوشنودی کے حصول کی کوششوں میں لگ گئی۔ واشنگٹن میں پاکستانی سفیر حسین حقانی اور اسلام آباد میں امریکی سفیر پیٹرسن نے واشنگٹن پر واضح کیا کہ مشرف کا ہٹایا جانا کیوں ضروری ہے۔ اگست ۲۰۰۸ میں مشرف بغاوت کی تحریک سے بمشکل بچا اور صدارت چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اگلے ہفتوں میں زرداری پاکستان کا صدر منتخب ہو گیا۔ زرداری، امریکہ اور پاکستانی فوجی اسٹیبلشمنٹ دونوں کا ناپسندیدہ تھا۔ صدر پاکستان بننے کی وجہ سے زرداری بلاشبہ پاکستانی فوج کا سپریم کمانڈر بن چکا تھا۔ اس سے بدتر یہ کہ فاٹا میں ترقیاتی پروگراموں کے لیے تمام امریکی مالی امداد کرپشن کے الزامات کے باوجود صدر زرداری کے پاس آنا تھی۔

اپنی بیوی کی موت کے بعد زرداری پی پی پی کا سربراہ بن گیا جو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اتحادی حکومت کی برسر اقتدار جماعت تھی۔ مزید یہ کہ حزبِ اختلاف کی بڑی جماعتوں خاص طور پر ن لیگ کے ساتھ اس کی ذاتی دشمنیاں تھیں۔ بینظیر کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ جیسے اخبارات نے زرداری کی بدعنوانی کی تفصیلی خبریں شائع کیں اس سے مغربی مراکز میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔

بینظیر کی موت اور مشرف کے استعفیٰ کے درمیانی عرصے میں جنگجوؤں نے بڑی شدت سے کارروائیاں کیں۔۲۰۰۷ میں تھوڑے سے توقف کے بعد جنگجو۲۰۰۸ میں سوات میں دوبارہ ابھرنے لگے۔ سوات کا میدانِ جنگ القاعدۃ اور طالبان کے علاقائی اہداف کے لیے محض توجہ ہٹاؤ عمل تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پاک افغان سرحد پر مصروف پاکستانی فوج کو وہاں سے ہٹا کر اس محاذ پر نیٹو فوج کو غیر محفوظ کیا جائے۔ وادیٔ سوات میں جاری فوجی آپریشن سے بہتر کوئی اور القاعدۃ کے اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ القاعدۃ اس دوران خیبر ایجنسی، اورکزئی اور درہ خیل میں منظم ہوئی اور پشاور کو حصار میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ القاعدۃ قبائلی علاقوں میں منظم ہوئی، افغانستان میں طاقت کا مظاہرہ کیا اور پاکستانی شہروں میں سرایت کرتی گئی۔ پھر پاکستان کی قبائلی ایجنسیوں کے قدرتی قلعوں میں اپنے ٹھکانے مضبوط کرنے کے لیے القاعدۃ نے ایک متوازی گروپ تحریکِ طالبان پاکستان کے نام سے قائم کیا۔

تحریکِ طالبان پاکستان: القاعدۃ کی جھول

القاعدۃ عالمِ اسلام کی تمام مزاحمتی تحریکوں پر نظریاتی غلبے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ القاعدۃ چاہتی ہے کہ یہ تمام تحریکیں القاعدۃ کی نظریاتی حدود کے اندر رہ کر اپنی لڑائی لڑیں اور اس بات کو سمجھیں کہ امریکہ ہی تمام مسائل کی جڑ ہے۔ القاعدۃ کا نظریہ ہے کہ امن قائم کرنے کے لیے تمام محاذوں پر امریکہ کا ناکام ہونا ضروری ہے۔ القاعدۃ نے افغان طالبان میں یہ نظریہ مکمل طور پر پھیلا دیا ہے لیکن نافرمانی کا خطرہ اب بھی موجود ہے۔ عراق میں القاعدۃ کا تجربہ بہت تلخ رہا حالانکہ عراقی مزاحمت میں اس نے غیر مشروط امداد کی تھی۔

امریکی کمانڈر جنرل ڈیوڈ پیٹریاس نے ۲۰۰۷ میں عراقی قبائلی مزاحمت کاروں کو مذاکرات کا لالچ دیا اور عراقی مزاحمت کے قائدین نے القاعدۃ کو نظر انداز کرتے ہوئے

اپنے بدترین دشمن امریکہ سے مذاکرات کر کے القاعدۃ کو اس کے ٹھکانوں سے نکال باہر کیا۔ اس سے القاعدۃ کے پاس کوئی راستہ نہ بچا سوائے اس کے کہ عراق سے یمن، صومالیہ اور پاکستانی قبائلی علاقوں میں ہجرت کر جائے۔ القاعدۃ کا خیال ہے کہ عراق کی نسبت پاکستانی قبائلی علاقوں میں اس کی جڑیں زیادۃ مضبوط ہیں۔ القاعدۃ تسلیم کرتی ہے کہ اس وقت اس کی قیادت ناتجربہ کار تھی لیکن عراق میں چلی گئی امریکی چال سے اب بھی ڈرتی ہے۔ اسی امریکی چال کے اثرات کی وجہ سے القاعدۃ پاکستان میں بھی ڈوبنے لگی تھی جب ۲۰۰۷ کے آغاز میں وانا میں طالبان کمانڈر ملا نذیر کے وفاداروں اور غیر ملکی ازبک جنگجوؤں میں تنازع پیدا ہوا تھا۔

ملا نذیر ۱۹۷۵ میں پیدا ہوئے۔ طالبان سے ملنے سے پہلے سوویت جنگ میں آپ گلبدین حکمت یار کی حزبِ اسلامی سے وابستہ رہے۔ آپ افغانستان اور پاکستان کی دہری شہریت رکھنے والے احمد زئی وزیری تھے۔ ملا نذیر القاعدۃ کے ہمدرد تو تھے لیکن آپ کی اصل وفاداری ملا عمر کے ساتھ تھی۔ آپ اتنے زیادہ نظریاتی نہیں تھے اور قبائلی روایات پر زیادہ زور دیتے تھے۔ آپ کے خیال میں القاعدۃ ارکان قبائلی علاقوں میں مہمان تھے اور قبائلیوں کا فرض بنتا تھا کہ قبائلی قوانین کے تحت اسی حیثیت سے ان کی حفاظت کریں۔ آپ القاعدۃ ارکان کو نظریاتی رہبر نہیں سمجھتے تھے۔ نظریاتی اور عسکری محاذوں پر آپ صرف اور صرف ملا عمر کے پیروکار تھے۔

اگرچہ القاعدۃ اور طالبان میں، کم از کم ظاہری طور پر، بہت اچھے تعلقات تھے لیکن وزیرستان کی موجودہ پیش رفتوں سے طالبان مطمئن نہیں تھے۔ ۲۰۰۶ میں تقریباً چالیس ہزار چیچن، ازبک، عرب اور پاکستانی جہادی وزیرستان میں تھے لیکن ازبکستان کی تحریک اسلامی کے طاہر یلدوشف نے ایک بیان میں افغانستان میں مغربی اتحاد کے خلاف جنگ لڑنے کے بجائے پاکستان آرمی کے خلاف جنگ لڑنے کو اولین ترجیح دی۔ اس سے افغان طالبان

بہت حیران ہوئے۔ اگرچہ القاعدۃ نے پاکستانی طالبان کو افغان مزاحمت میں مدد کے لیے مضبوط کیا تھا لیکن اس کا دوسرا ہدف یہ بھی تھا کہ اس طاقت کو پاکستان آرمی کے خلاف استعمال کیا جائے تاکہ وار آن ٹیرر کی امریکی جنگ میں پاکستان کی حمایت ختم کی جائے، جس طریقے سے بھی یہ ممکن ہو۔ القاعدۃ کا اصل میدانِ جنگ افغانستان ہی تھا اور پاکستان کی امریکی حمایت کو روکا جانا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ افغان طالبان یہ نہج اپنانے پر تیار نہیں تھے۔ وہ فی الحال پاکستان آرمی کے خلاف نہیں لڑنا چاہتے تھے۔

القاعدۃ مستقبل کے تناظر میں اپنی حکمتِ عملی ترتیب دے رہی تھی لیکن افغان طالبان اپنی حکمتِ عملی کو افغانستان میں مغربی اتحادیوں کے خلاف جنگ تک ہی محدود کیے ہوئے تھے۔ باہمی روابط کا فقدان اور ابلاغی ناکامیاں بھی تھیں۔ ملا عمر کے سفیر ملا داد اللہ نے لڑائی کی تمام توجہ افغانستان پر مرکوز رکھنے کے لیے ۲۰۰۶ میں قبائلی علاقوں کا دورہ کیا۔ لیکن اس پر اختلافِ رائے پیدا ہوا اور شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ ملا نذیر نے جنوبی وزیرستان میں ازبک ملیشیا کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ ازبکوں نے افغان مہم میں تو کم حصہ لیا تھا لیکن پاکستان آرمی کے خلاف جنگ میں بڑے فعال تھے۔ پاکستانی فوجی اسٹیبلشمنٹ نے ان اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ ملا نذیر واحد طالبان کمانڈر ہیں جنہوں نے القاعدۃ کو پناہ دینے کے باوجود اس کے نظریات قبول نہیں کیے۔ پھر پاکستانی فوج نے ازبکوں کو ختم کرنے کے لیے ملا نذیر کو سرمایہ اور ہتھیار فراہم کیے۔ نتیجہ یہ کہ ۲۰۰۷ کے آغاز میں ملا نذیر گروپ اور ازبکوں میں شدید نزاعی کیفیت پیدا ہوئی اور سیکڑوں ازبک قتل کر دیے گئے۔ جو بچ گئے انہوں نے بیت اللہ محسود کے پاس پناہ لی۔ لیکن اس کہانی میں کچھ اور بھی ہے۔

ملا نذیر کا تعلق جنوبی وزیرستان کے وزیر قبیلے سے تھا جو محسود قبیلے کا روایتی حریف تھا۔ مشترکہ نظریاتی شناخت کے باوجود ملا نذیر اور بیت اللہ، مخالف گروپوں کے کمانڈر تھے۔ ملا نذیر ازبکوں سے حسد کرتے تھے کیونکہ ازبک بیت اللہ محسود کے حامی تھے۔ القاعدۃ نے اس معاملے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ازبک باقاعدہ طور پر القاعدۃ کے تنظیمی نیٹ ورک سے وابستہ نہیں تھے۔ وہ صرف القاعدۃ کے وسیع اہداف سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم القاعدۃ کو خطرہ پیدا ہوا کہ اس کے نظریاتی پرچم تلے فعال گروپوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر دشمن کسی بھی وقت اس کی ساری محنت پر پانی پھیر سکتا ہے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر ۲۰۰۸ میں تحریکِ طالبان پاکستان وجود میں آئی۔ القاعدۃ نے تمام پاکستانی گروپوں کو تحریکِ طالبان پاکستان کے پرچم تلے جمع کر دیا۔ بیت اللہ محسود کو اس کا سربراہ اور حافظ گل بہادر اور مولوی فقیر محمد کو نائبین مقرر کیا گیا۔ تمام شکوک رفع کرنے کے لیے ملا عمر کو اس کا سرپرستِ اعلیٰ بنایا گیا۔ لیکن تحریکِ طالبان پاکستان نے افغان طالبان کو ان کے دائرہ اثر سے مزید دور کرنے میں عمل انگیز (catalyst) کا کام کیا۔

کمانڈر ملا نذیر اور گل بہادر شروع سے ہی محسود کی کمانڈرشپ کے خلاف تھے لیکن القاعدۃ نے تحریکِ طالبان پاکستان کو خیبر سے کراچی تک وسعت دینے کے لیے محسود کو مضبوط کیا۔ اگرچہ افغان طالبان نے تحریک طالبان پاکستان سے دوری رکھنے کی کوشش کی تاہم وہ کھل کر اس کی مذمت نہیں کر سکے کیونکہ تحریکِ طالبان پاکستان اب بھی افغانستان میں مغربی اتحاد کے خلاف جنگ میں اپنے بہت سے جنگجو بھیج رہی تھی۔ اکیلے بیت اللہ محسود نے ۲۰۰۸ میں ہلمند میں افغان طالبان کی مدد کے لیے اڑھائی سو کے قریب دستے روانہ کیے۔ ۲۰۰۸ کے آخر تک تحریکِ طالبان پاکستان تمام قبائلی ایجنسیوں اور بلوچستان میں پھیلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس طرح تحریکِ طالبان پاکستان قبائلی علاقوں میں پاکستان کے تعلقات ختم

کرنے اور یہاں پر ملا عمر کا اثرورسوخ کم کرنے کے قابل ہوگئی۔ ۲۰۰۸ کے بعد ملا عمر نے تحریکِ طالبان پاکستان کو پاکستانی سکیورٹی فورسز کے خلاف کارروائیاں بند کرنے کا حکم دیا لیکن تحریکِ طالبان پاکستان نے اس پر کان نہ دھرے۔

اب تحریکِ طالبان پاکستان کے پاس ہندوکش کے پہاڑی سلسلوں کا ایک فطری بنکر تھا جہاں سے وہ امریکی جنگی عزائم کے خلاف بند باندھ سکتی تھی۔ لہٰذا القاعدۃ نے آگے بڑھنے اور اپنے عالمی آپریشن دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پیشتر پاکستانی شہروں میں سکیورٹی کی وجہ سے یہ آپریشن رکے ہوئے تھے کیونکہ بیرونی دنیا کے لیے ان کے پاس یہی واحد راستہ تھا۔ ایرانی جنداللہ نے ان کے مسائل کا حل تلاش کر لیا۔ القاعدۃ نے ایرانی جنداللہ کے ساتھ ۲۰۰۹ میں روابط قائم کیے۔

ایرانی جنداللہ: القاعدۃ کا نیا اتحاد

نائن الیون کے بعد پاکستان سے مشرقِ وسطیٰ تک جانے کے لیے القاعدۃ کے پاس ایران ایک سادہ ترین اور آسان ترین راستہ تھا۔ ایک معاہدے کے تحت ایرانی حکومت نے اس کے ممبران کے ایران میں سے سفر کرنے پر آنکھیں بند کر لیں۔ ابو حفص الموریطانی ایران کے ساتھ القاعدۃ کے رابطہ افسر تھے۔ تاہم عراق میں ابو مصعب الزرقاوی کا ظہور ایران القاعدۃ تعلقات کے لیے بری خبر ثابت ہوا۔ الزرقاوی ۱۹۶۶ میں اردن میں پیدا ہوئے تھے اور افغانستان میں ایک تربیتی معسکر چلا رہے تھے۔ آپ عراق جا کر بہت معروف ہوئے اور عراق جنگ میں بم دھماکوں اور حملوں کے ذمہ دار رہے۔

رابطۂ علمائے اسلام کے سرکردہ رہنما اور امریکہ کے خلاف عراقی مزاحمت کے رکن ڈاکٹر محمد بشیر الفیضی نے مجھے ۲۰۰۷ میں عمان میں بتایا کہ اگرچہ عراقی مزاحمت کو غیر ملکی امداد کی ضرورت نہیں تھی لیکن انہوں نے الزرقاوی جیسے غیر ملکی جنگجوؤں کو برداشت

کیا کیونکہ ان کی کارروائیوں سے خود الزرقاوی اور عراقی مزاحمت کو بہت زیادہ عروج حاصل ہوا۔ لیکن الزرقاوی نے شیعوں کو مارنا شروع کر دیا جو عراقی سنی تحریکِ مزاحمت اور القاعدۃ دونوں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ الزرقاوی کا خیال تھا کہ یہ القاعدۃ کی سوچ کے عین مطابق ہے جبکہ ایسا نہیں تھا۔ القاعدۃ نے الزرقاوی کو ترک کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ ایسا کرنے کے قابل نہ تھی جب تک ایران اور عراق ایک دوسرے کے خلاف نہ ہو جاتے۔

امریکی اخبار یو ایس اے ٹوڈے میں شائع ہونے والی ایک دستاویز کے مطابق شیعہ دشمن لڑائی شروع کرنے سے الزرقاوی کا مقصد یہ تھا کہ ایران کو بھی جنگ میں گھسیٹا جائے۔ اس حکمتِ عملی سے ایران مکمل طور القاعدۃ قیادت کے خلاف ہو گیا اور مشرقِ وسطیٰ میں مغربی موجودگی کے خلاف القاعدۃ کے وسیع منصوبے پر زد پڑی۔ ایران نے القاعدۃ کارکنان کی آمدورفت روکنے کے لیے اپنے داخلی اور خارجی راستوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ ایران نے القاعدۃ کے کارکنان کو گرفتار کر کے سعودی اور مصری حکومت کے حوالے کیا۔ الزرقاوی نے اس قدر نقصان پہنچایا کہ ان کی موت کے بعد بھی ایران القاعدۃ کے لیے محفوظ راستہ نہ رہا۔ تاہم اس مسئلے کا حل ۲۰۰۹ میں ایرانی جند اللہ کے رہنما عبد المالک ریگی کی صورت میں سامنے آیا۔

ریگی ایک بلوچ قوم پرست اور سابقہ منشیات سمگلر تھا۔ وہ کچے راستوں پر گاڑیوں میں سفر کرتا اور بیس سے پچیس جوانوں کا ایک گینگ ہر وقت اس کے ہمراہ ہوتا۔ ۲۰۰۸ میں وہ ڈی ایچ اے کراچی کے پاس ایک گندی سی کچی بستی محمود آباد میں تھا۔ یہاں پر ایک مخالف گینگ کے ساتھ اس کی لڑائی ہو گئی اور وہ زخمی ہو گیا۔ ریگی گینگ کے ایک سابقہ ممبر نے بتایا کہ ابتدا میں وہ بلوچ لبریشن آرمی سے منسلک تھا اور ہیروئن لے کر لیاری سے ترکی تک کھلے عام سفر کرتا۔

پاکستان اور ایران کے بدعنوان سکیورٹی افراد سے قریبی تعلقات کی وجہ سے ریگی کبھی نہیں پکڑا گیا۔ بلوچ آرمی کے کمانڈر کی حیثیت سے وہ ایران کے خلاف تھا اور گرفتاری سے بچنے کے لیے کئی بھیس بدلتا۔ ریگی کے بہت سے علاقائی اور عالمی حساس اداروں سے تعلقات تھے لیکن ایرانی بلوچستان میں بغاوت پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ چند سال پہلے لیاری میں کالعدم سپاہِ صحابہ سے ملاقات کے بعد ریگی میں تبدیلی آگئی۔ بطور بلوچی اس کا ایران مخالف مؤقف شیعہ دشمنی میں بدل گیا۔ جلد ہی اس نے سپاہِ صحابہ کے لشکر جھنگوی گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔ اسی تعلق کو استعمال کرتے ہوئے ریگی افغان صوبے زابل میں گیا لیکن طالبان نے امریکی انٹیلی جنس سے تعلقات کے شبہ کی وجہ سے اسے اپنی صفوں میں جگہ نہ دی۔ ریگی کو افغانستان سے نکال دیا گیا۔ تاہم ۲۰۰۹ میں اس کے لشکر جھنگوی تعلقات نے تربت میں القاعدۃ کے ساتھ ایک ملاقات کا انتظام کیا اور اس کی وفاداری کی ذمہ داری لی۔ القاعدۃ، ریگی کے ایرانی بلوچستان میں بغاوت کی حمایت پر متفق ہوگئی۔ بدلے میں ریگی نے ترکی اور عراق کے سفر میں القاعدۃ ممبران کو ایرانی راستوں کی سہولت فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ جند اللہ کے ذریعے ریگی اور القاعدۃ کے تعلق کی وجہ سے ۲۰۰۹ کا سال ایرانی حکومت کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوا۔ ایرانی بلوچستان میں اہم شخصیات پر حملے ہوئے اور ایرانی انقلابی گارڈز کا اہم کمانڈر قتل ہوا۔

القاعدۃ کو ریگی کے سمگلنگ راستوں کی صورت میں محفوظ راستہ مل گیا تاہم فروری ۲۰۱۰ میں پاکستانی اطلاع پر ایرانی حکام نے ریگی کو گرفتار کرلیا۔ مگر ریگی کی گرفتاری سے القاعدۃ پر زیادہ برا اثر نہیں پڑا۔ چند ایک واقعات ایسے ہوئے کہ القاعدۃ ایران تعلقات معمول پر آگئے۔ ان واقعات میں ایرانی سفیر حشمت اللہ کا پشاور سے اغوا ہونا شاید سب سے زیادہ اہم ہے۔ تہران نے سفیر کی وطن واپسی کے لیے پاکستان کے سرکاری ذرائع سے رابطہ کیا

۔ دفتر خارجہ اور آئی ایس آئی سے استدعا کی گئی۔ نتیجہ صفر۔ پھر ایران نے زابل میں اپنے افغان ذرائع سے رابطہ کیا اور ان ذرائع نے قبائلی تعلقات استعمال کرتے ہوئے طالبان کمانڈر سراج الدین حقانی سے رابطہ کیا۔ سراج الدین حقانی کے ذریعے تہران نے سفیر کی رہائی کے لیے مذاکرات کیے۔ سفیر کی رہائی کے بدلے میں ایران میں قید اہم شخصیات کو رہا کیا جانا تھا۔ ان قیدیوں میں ابو حفص الموریطانی، سلیمان ابو غیث، اسامہ کی صاحبزادی ایمان بن لادن اور مصری القاعدۃ کے رہنما سیف العادل[1] شامل تھے۔ مذاکرات کئی ماہ جاری رہے اور اس دوران القاعدۃ اور ایران تعلقات معمول پر آ گئے۔ ایران نے ایک بار پھر القاعدۃ کے ممبران کے لیے محفوظ راستوں کی اجازت دے دی۔

اس دوران القاعدۃ نے جنوبی ایشیا میں امریکہ کے خلاف لڑائی بند کر دی۔ ایک طرف تو اس نے مختلف مقامات تک پہنچنے کے لیے ایران میں نئے راستے کھولے اور دوسری طرف پاکستان کے راستے افغانستان جانے والی نیٹو سپلائی لائن کو کاٹنے کی منصوبہ بندی کی۔

نیٹو کے واٹر لو کی منصوبہ بندی

۲۰۰۲ سے ۲۰۰۹ کے عرصے میں القاعدۃ کی الف لیلۃ میں کئی کہانیاں آئیں جن میں اس تنظیم نے کئی بحرانوں کا مقابلہ کیا اور اپنے مختلف کرداروں کے ذریعے افغانستان کو نیٹو کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بنا دیا۔ لیکن حتمی فتح سے پہلے القاعدۃ کے پاس ایک اور منصوبہ بھی تھا۔ اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری ان تجربہ کار عرب افغان جنگجوؤں میں سے تھے جنہوں نے سابق سوویت یونین کی شکست میں حصہ لیا تھا۔ جنگجوؤں نے مجاہدین کی فتح کے ایک اہم پہلو کو ہمیشہ مد نظر رکھا: شمالی افغانستان میں روسی سپلائی لائن کاٹنے میں کامیابی۔

1۔ القاعدہ رہنما سیف العدل کو کچھ عرصہ قبل یمنی القاعدہ نے اغواشدہ ایرانی سفارتکار کے بدلے 5 اہم القاعدہ رہنماؤں سمیت چھڑوالیا۔ مترجم

۲۰۰۶ کا جارحانہ ظہور بھی اسی کوشش کا حصہ تھا۔ القاعدۃ کسی ایسی سٹریٹجی کی تلاش میں تھی جو افغانستان میں نیٹو کی شکست کا پیش خیمہ بن جائے۔ بحث مباحثے کے بعد خیبر ایجنسی کو میدانِ جنگ بنانے کا فیصلہ ہوا۔

۲۰۰۲ کے بعد سے درہ خیبر نیٹو سپلائی کا اہم راستہ بن چکا تھا۔ تقریباً اسی فیصد سپلائی درہ خیبر سے ہی ہوتی تھی۔ باقی بیس فیصد قندھار سے اور تھوڑی بہت فضائی صورت میں گرائی جاتی تھی۔ نیٹو کی خوش بختی تھی کہ خیبر ایجنسی میں القاعدۃ کے خیر خواہ بہت کم تھے۔ یہ علاقہ ہمیشہ سے ایک اہم تجارتی راستہ رہا ہے اور یہاں کی آبادی کی اکثریت بریلوی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتی ہے جو صوفی اسلام کے پیروکار ہیں۔ اس علاقے سے طالبان مخالف ایک بریلوی عالم پاکستانی پارلیمنٹ کے رکن بھی ہیں۔ ان حالات میں خیبر ایجنسی میں محاذ کھولنا القاعدۃ کے لیے ایک بڑا چیلنج تھا۔ اس مسئلے پر قابو اس وقت پایا گیا جب القاعدۃ نے افغان طالبان کو راضی کیا کہ افغانستان میں مغربی اتحاد کی شکست کے لیے نیٹو کی سپلائی لائنیں کاٹنا بہت ضروری ہیں۔ ملا عمر کی رضامندی سے استاد یاسر کو خیبر ایجنسی کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ حکیم اللہ محسود کے ساتھ طالبان کا ایک چھوٹا سا گروپ "مارو اور بھاگو" گوریلا کارروائیوں کے لیے خیبر ایجنسی روانہ کیا گیا۔ مقامی قبائلیوں کا ایک گروپ ان کی سہولت کے لیے ہمراہ تھا۔ یہ نئے جنگی محاذ کا آغاز تھا۔ جنوری ۲۰۰۸ میں نیٹو سپلائی پر منظم حملے شروع ہوئے اور اپریل ۲۰۰۸ تک نیٹو کو نوشتہ دیوار نظر آنے لگا۔ حملوں میں شدت آ گئی اور نیٹو کے لیے حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ طالبان نے کچھ ایئر کرافٹ اور ہموی گاڑیاں پکڑ لیں۔

نیٹو کمانڈر اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ نئی نئی حکمتِ عملیاں طالبان کا خاصہ ہیں اور وہ اس بارے میں پریشان تھے۔ ایرانی بندرگاہ چابہار واحد متبادل راستہ تھا لیکن اسے استعمال کرنے کے لیے افغانستان میں ایک ہائی وے ضروری تھی۔ اس پر فوراً کام شروع

ہو گیا اور طالبان کے حملوں کے باوجود بالآخر ۲۰۰۸ میں یہ شاہراہ مکمل ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد یہ مشکل مرحلہ آ گیا کہ نیٹو سپلائی گزارنے کے لیے ایران کو کیسے راضی کیا جائے۔ ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ یہ یورپ اور روس سے ہوتے ہوئے وسط ایشیائی ریاستوں تک آتا ہے۔ اور پھر شمالی افغانستان سے گزرتے ہوئے بگرام اور قندھار تک آتا ہے۔ یہ راستہ بہت طویل ہے اور بہت زیادہ خرچ کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔ مزید یہ کہ یہ راستہ دو ایسے خطوں میں سے گزرتا ہے جو خشکی میں گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن نیٹو کے لیے حالات اس حد تک بدتر ہو گئے کہ روس اور وسط ایشیائی ریاستوں سے متبادل راستے کے لیے معاہدے پر مذاکرات شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ فروری ۲۰۰۹ میں واشنگٹن ایران کے ساتھ بیک چینل سفارت شروع کرنے پر مجبور ہو گیا اور تمام سابقہ دعووں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ایران چابہار کی بندرگاہ سے نیٹو سپلائی گزرنے کی اجازت دے دے۔

آخر کار ایران نے غیر فوجی رسد کے لیے اجازت دی لیکن یہ اجازت نیٹو کی حیثیت سے نہیں بلکہ چند یورپی ملکوں کے لیے انفرادی حیثیت سے تھی۔ یہ کوئی اطمینان بخش حل نہیں تھا اس لیے امریکا اور برطانیہ اپنے سپلائی راستوں کی حفاظت کے لیے اسلام آباد پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن پاکستان میں دہشت گردی کے عفریت نے پاکستان کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ اس مسئلے پر مناسب توجہ دے۔ اس کی فوجیں کئی محاذوں پر مصروف تھیں اور ان حالات میں پاکستان نیٹو سپلائی کو سکیورٹی فراہم کرنے سے معذرت کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نیٹو سپلائی کاٹنے کی حکمتِ عملی نے طالبان کے حوصلے بڑھا دیے اور انہوں نے پشاور ٹرک اڈے پر تابڑ توڑ حملے کیے جہاں نیٹو قافلے درہ خیبر جانے کے لیے رات کو رکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کراچی میں نیٹو کی بحری رسد پر بھی توجہ دی۔ انہوں نے نیٹو کے ٹھیکیداروں کو اغوا کیا جو اس کی سپلائی کو آگے لے کر جاتے تھے اور ڈرائیوروں کو

خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیں۔ نتیجہ یہ کی دسمبر ۲۰۰۸ تک نیٹو سپلائی بالکل رک گئی اور برطانوی اخبارات کے مطابق ہلمند اور غزنی جیسے صوبوں میں نیٹو کے ذخائر بالکل ختم ہو گئے۔

القاعدۃ اور طالبان کی کامیابی نے مغرب کے لیے پریشانی پیدا کر دی۔ مغرب کو احساس ہونا شروع ہو گیا کہ اسے دلدل میں پھنسا لیا گیا ہے۔ پھر مغرب نے القاعدۃ اور انتہا پسند طالبان کے خلاف لڑنے کے لیے یہ حکمتِ عملی اپنائی کہ معتدل قسم کے طالبان سے معاملہ کر کے انہیں توڑا جائے۔ یہ دیر آید درست آید قسم کی مایوس کن حکمتِ عملی تھی۔ امریکی اور برطانوی تھنک ٹینک افغانستان میں طالبان کی کامیابی پر بہت جزبز تھے اور بتا رہے تھے کہ ۲۰۰۶ کے بعد جنوبی افغانستان ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ اس پر مغرب نے متبادل حکمتِ عملیوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اگست ۲۰۰۷ میں کابل میں ایک بڑا جرگہ بلایا گیا جس میں پاکستان اور افغانستان کے وفود شریک ہوئے۔ صدر مشرف نے پاکستان کی طرف سے نمائندگی کی۔ اس جرگے میں فیصلہ ہوا کہ علاقائی طالبان کمانڈروں کو راغب کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے جرگے بلانے کی ضرورت ہے۔ ان جرگوں کا مقصد القاعدۃ اور طالبان میں سے معتدل طالبان کو الگ کرنا تھا۔ اس جرگے کے بعد پاکستان، امریکہ اور برطانیہ نے مشترکہ طور پر اس حکمتِ عملی پر کام کیا۔ مولانا فضل الرحمان نے کوئٹہ کے خفیہ دورے کیے اور درمیانے درجے کے طالبان سے گفت و شنید کی۔ یہ نئی امریکی چال فائدہ بخش دکھائی دینے لگی۔ سابقہ طالبان کمانڈر ملا عبد السلام نے برطانوی فوجی دستوں سے معاہدہ کر لیا اور ہلمند کے ضلع موسیٰ قلعہ کے منتظم کا چارج سنبھال لیا۔

اس دوران برطانوی ایم آئی سکس کے ایجنٹ نئے برطانوی سفیر شیرارڈ کاؤپر کے ساتھ پرانی افغانی روایت اربکائی پر کام کرنے میں کنڑ، پکتیا اور پکتیکا کے علاقوں میں بہت فعال تھے۔ ان تینوں صوبوں میں جرگوں کے حق میں فضا بہتر ہوتی جا رہی تھی اور امکان تھا

کہ اگر علاقائی جرگے منعقد ہوتے رہے تو طالبان میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ تاہم یہ کوشش اسی صورت کامیاب ہو سکتی تھی اگر پاکستانی فوج کو سکون کا سانس لینا نصیب ہوتا۔ القاعدۃ نے ایسا موقع ہی نہیں دیا۔

ایف پاک حکمتِ عملی کی غرقابی کے لیے سوات کا گرداب

امریکہ کی اختتامی حکمتِ عملی میں مذاکراتی عمل ایک اہم جزو ضرور تھا لیکن واحد جزو نہیں تھا۔ ۲۰۰۷ میں جنوب مشرقی افغانستان اور کنڑ باجوڑ سرحد کی پہاڑی چوٹیوں پر امریکی اڈوں کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری تھا۔ پاکستان کے ساتھ معاہدے کیے گئے جن کی رو سے پاکستان نے ڈرون حملوں کے لیے اپنے اڈے فراہم کیے اور امریکی سکیورٹی ٹھیکیداروں کو پاکستان میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ مغربی حکومتیں ایک طرف تو طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہی تھیں اور دوسری طرف قبائلی علاقوں سے القاعدۃ کے وجود کو مٹانے کے ایجنڈے پر کام کر رہی تھیں۔ پاکستان اس لڑائی میں برابر کا حصے دار بننے جا رہا تھا۔

اندرونی مخبروں نے القاعدۃ کو پہلے ہی ان حقائق سے آگاہ کر دیا تھا اور اخباری رپورٹیں بھی اس بات کی تصدیق کر رہی تھیں کہ بہت جلد ایک نیا کھیل شروع ہونے جا رہا ہے۔ القاعدۃ کے پاس صرف ایک ہی توڑ تھا کہ سوات میں جنگ کی شدت میں اضافہ کر دیا جائے۔ لال مسجد آپریشن کے فوراً بعد سوات میں طالبان سکیورٹی فورسز کے خلاف کھڑے ہوئے تھے لیکن فوجی کارروائی کے پہلے مرحلے میں مار کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بلاشبہ پاکستانی حکومت جنگ بندی کا معاہدہ کرنے پر تیار تھی اور مالاکنڈ ڈویژن میں اسلامی عدالتوں کے قیام کے مطالبے سے بھی راضی تھی مگر القاعدۃ کے خیالات کچھ اور تھے۔ اس نے قبائلی جنگی سرداروں کو تحریکِ طالبان پاکستان کے زیر سایہ منظم کرنے کی حکمتِ عملی پہلے ہی وضع کر لی تھی۔ بیت اللہ محسود کو اس نئی تنظیم کا سربراہ بنایا گیا اور سوات طالبان اس کی ایک شاخ تھی۔

پھر القاعدۃ نے تحریکِ طالبان پاکستان کو ہدایت کی کہ سوات وادی میں خود کش حملہ آوروں کی ایک ٹیم بھیجی جائے۔ جب دوبارہ جنگ چھڑی تو قاری حسین احمد محسود جیسے زیرک کمانڈر نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ محسود ایک خطرناک پاکستانی طالبان کمانڈر تھے جنہوں نے خود کش حملہ آوروں کی تربیت یافتہ ٹیم بنا رکھی تھی۔ ان کے آدمیوں نے سوات میں مقامی انتظامیہ پر تباہی مچا دی اور سارے پولیس تھانے تباہ کر دیے۔ محسود اور اس کے ازبک ساتھیوں نے دشمن کے گلے کاٹ کر دہشت کی فضا میں اضافہ کر دیا۔

پاکستان میں اسلامی انقلاب لانے کے لیے تحریکِ طالبان پاکستان کو افغان طالبان کی طرز پر منظم کرنا القاعدۃ کا طویل المدتی منصوبہ تھا۔ لیکن اب القاعدۃ نے عسکری اہداف حاصل کرنے کے لیے تیز رفتاری سے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک طرف تو اسے طالبان کے ساتھ مذاکرات والی امریکی چال کا توڑ کرنا تھا اور دوسری طرف پاکستان شہروں میں بغاوت پیدا کرنا تھی۔ یہ حکمتِ عملی ملا عمر کے ایجنڈے کے خلاف تھی کیونکہ طالبان کی اصل لڑائی تو افغانستان میں مغربی اتحادیوں کے خلاف تھی۔ پاکستانی جنگجوؤں کو اب ایک اور جنگ لڑنا تھی ہر چند کہ وہ ملا عمر کے ماتحت تھے۔ اس کا مطلب بظاہر یہ تھا کہ اب مقصد ایک نہیں رہا۔ ملا عمر اور افغان طالبان نے اس خیال کو پسند نہیں کیا لیکن تحریکِ طالبان پاکستان نے ملا عمر کی بیعت کی تھی اور افغان مزاحمت میں ان کے ساتھ شریک تھے اس لیے اس نئے جہادی محاذ پر ان پاکستانی جنگجوؤں کے اکٹھ کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی اخلاقی توجیہہ بھی نہیں تھی۔ پاکستانی فوجی قیادت نے اسے ایک انحراف اور گمراہی تصور کیا کیونکہ اپنے تئیں اس نے فعال طور پر افغان طالبان کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ ان کی شاخیں پاکستان میں بھی پھیل جائیں۔

تاہم القاعدۃ کے لیے تو یہ الگ کہانی تھی۔ خطے میں اسلامی مزاحمت کا اب ایک نیا پہلو سامنے آچکا تھا۔ یہاں پر دنیا کی پہلی مقبول عام اور مکمل قبائلی حمایت والی مقامی القاعدۃ شاخ قائم ہو چکی تھی۔ یوں مستقبل میں اگر افغان طالبان اور پاکستانی فوج مغرب کے ساتھ رضامندی کا منصوبہ بناتے ہیں تو طالبان (القاعدۃ) کی یہ نئی شاخ ان کی مخالفت کے لیے موجود ہو گی اور اس اپنے افغان ساتھیوں کو یاددہانی کرائے گی کہ جہادی جدوجہد صرف افغانستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ پوری دنیا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران القاعدۃ پاکستانی حکومت کی طرف سے کھڑی کی گئی رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے تحریکِ طالبان پاکستان کو صف آرا کر دے گی۔

سوات میں طالبان کی صف آرائی سے القاعدۃ کو کم از کم مختصر مدت میں تو بہت فائدہ ہوا۔ تحریکِ طالبان پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی شمالی اور جنوبی وزیرستان کے تجربہ کار ازبک اور پنجابی کمانڈر وادی سوات میں بھیج دیے گئے۔ اس جہادی دستے نے سوات جنگ کی صورتحال بدل دی۔ شیعہ مخالف لشکر جھنگوی کے سابق رہنما قاری حسین نے پاکستان آرمی کے خلاف کارروائیوں کو ایک نئی جہت بخشی۔ مقامی کمانڈر بنیامین کے ساتھ مل کر آپ نے پاکستان آرمی کے گرفتار فوجیوں کو ذبح کیا اور ان کی تصاویر اور ویڈیو میڈیا پر ریلیز کر دیں۔ آپ نے ایسی خوفناک مہم شروع کی جس سے دشمنانِ طالبان کی ہوا اکھڑ گئی۔ آپ نے پولیس کے سپاہی اور ان کے رشتہ دار پکڑ کر ان کے سر قلم کر دیے۔ اے این پی کے طالبان مخالف رہنماؤں اور کارکنوں کو سرِعام پھانسی دی گئی۔ ان کے گھروں حتیٰ کہ جنازوں پر بھی بمباری کی گئی۔ اس مہم سے سوات میں مقامی انتظامیہ اور محکمہ پولیس کا صفایا ہو گیا۔ مقامی انتظامیہ اور پولیس کے بغیر پاکستانی فوج بے بس تھی۔ نتیجہ یہ کہ پاکستانی فوج جنگجوؤں کے خلاف کوئی بھی

مؤثر کارروائی کرنے کے قابل نہ رہی۔ جنوری ۲۰۰۸ تک طالبان نوے فیصد سوات پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستانی فوج کے پاس صرف چند چوکیاں اور پہاڑی چوٹیاں تھیں۔

فروری ۲۰۰۸ میں کالعدم پاکستانی عسکری گروپ تحریک نفاذِ شریعتِ محمدی کے سربراہ اور ملا فضل اللہ کے سسر نے خیبر پختونخوا حکومت کے ساتھ ایک امن معاہدہ کیا۔ اسی مہینے میں ایک اور معاہدہ ہوا جس میں سوات میں اسلامی قوانین کے نفاذ اور اسلامی عدالتوں کے قیام کا وعدہ کیا گیا۔ نئے طالبان کے سامنے پاکستانی حکومت کا یہ پہلا سرنڈر تھا۔ لیکن مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذِ شریعت کا معاہدہ محض پاکستانی فوج کی ساکھ بچانے کا ایک حربہ تھا جو یہاں سے نکلنے کے لیے بیتاب تھی۔ ڈیڑھ سال سے لڑائی میں مصروف پاکستانی طالبان کے لیے بھی بچاؤ کا یہی حربہ تھا۔

دلچسپ بات یہ کہ نئے طالبان نے کبھی بھی اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ نہیں کیا۔ سوات میں ۲۰۰۷ میں جنگ صرف اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ پاکستانی حکومت نے طالبان کے اسلامی قوانین کے نفاذ کے مطالبے پورے کرنے کے معاہدے پر عمل نہیں کیا۔ یہ تو خطے میں امریکی موجودگی ختم کرنے اور طالبان کے ساتھ مذاکراتی عمل کی سوچوں کی حوصلہ شکنی کرنے کی ایک چال تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی القاعدۃ نے اپنی عسکری کارروائیاں سرحد پار تک پھیلا دیں۔ فوجی کارروائیوں کے سارے سلسلے میں کبھی نہیں سنا گیا کہ پاکستانی طالبان نے مالاکنڈ میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے مطالبے کو فوجی قافلوں پر حملوں کا جواز بنایا ہو۔ دراصل سوات جنگ پاکستانی فوج کو افغان پاکستان سرحد سے ہٹانے کے لیے شروع کی گئی تھی تاکہ القاعدۃ کو افغانستان میں مغرب (امریکہ و نیٹو) کے خلاف جنگ میں آزادی مل جائے۔ پاکستان آرمی کی سوات میں موجودگی کی بدولت طالبان خیبر ایجنسی، اور کرزئی ایجنسی اور درہ آدم خیل میں دوبارہ منظم ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

سوات میں القاعدۃ کی جنگ کا مقصد یہ بھی تھا کہ علاقائی طالبان کمانڈروں کے ساتھ مذاکرات اور جرگوں کے انعقاد کے امریکی منصوبے کو ناکام بنایا جائے۔ ان جرگوں کے انعقاد میں پاکستانی فوج کی شرکت بہت اہم تھی لیکن اگر پاکستانی فوج طالبان کے خلاف جنگ میں مصروف ہوتی تو سرحد پار امریکہ اور نیٹو اتحادیوں کی مدد کرنے کے قابل نہ رہتی۔ ادھر افغانستان میں امریکہ نے سعودیوں کو یہ کام سونپا کہ سابق طالبان اور حزب اسلامی کے کمانڈروں کو رمضان المبارک ۲۰۰۸ میں سعودی عرب مدعو کریں۔ طالبان ترجمان طیب آغا کے ذریعے سعودی انٹیلی جنس سربراہ شہزادہ مقرن اور ملا عمر کے درمیان رابطہ کروایا گیا۔ لیکن یہ بات چیت افغان صدارتی انتخابات سے پہلے ہی ختم ہو گئی کیونکہ ملا عمر نے واضح طور پر شہزادہ مقرن کو بتادیا کہ وہ افغان حکومت سے بات چیت نہیں کریں گے۔

۲۰۰۹ میں صدارتی انتخابات کے بعد مذاکراتی عمل دوبارہ شروع کیا گیا مگر یہ یکطرفہ عمل رہا۔ امریکہ نے افغان حکومت کے توسط سے طالبان کو پرکشش مراعات کی پیش کش کی۔ سابق طالبان رہنما اور موجودہ افغان سینیٹر مولوی ارسلہ رحمانی نے راقم کو بتایا کہ ۲۰۰۹ کے صدارتی انتخابات میں امریکہ اور برطانیہ نے انہیں اور دیگر افغانوں کو بھاری مینڈیٹ کی پیش کش کی تھی کہ ہم طالبان کو انفراسٹرکچر پر حملوں سے باز رکھنے کے لیے سودے بازی کریں۔ رحمانی نے کہا کہ:

> اگر طالبان اس پہلی شرط کو مان لیتے ہیں تو انہیں سہولیات فراہم کرنے کا اگلا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر طالبان کو ترکی، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب میں اپنے دفاتر کھولنے کی اجازت مل جائے گی جہاں سے وہ افغان حکومت کے ساتھ باقاعدہ گفت و شنید کر سکیں گے۔ ان

مذاکرات میں فوجوں کی واپسی اور طالبان کی شراکت سے نئی سیاسی حکومت قائم کرنے جیسے ایشوز پر بات چیت ہو گی۔

طالبان نے اس عمل میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی۔ وہ بھلا ایسا کیوں کرتے؟ برطانیہ کے معتمد تھنک ٹینک کہہ رہے تھے کہ طالبان پہلے ہی ۷۳ فیصد افغانستان پر حکومت کر رہے تھے اور امریکہ اور نیٹو سرحدی ٹھکانوں اور نورستان جیسے سٹریٹجک صوبے سے پسپائی اختیار کر رہے تھے۔

نئی بوتل پرانی شراب

بینظیر کے قتل سے پاکستان کے لیے امریکی منصوبہ چوپٹ ہو گیا۔ واشنگٹن کو سارا روڈ میپ تبدیل کرنا پڑا۔ نئے معاہدے میں مشرف کباب میں ہڈی تھا اس لیے اسے رخصت کر دیا گیا۔ امریکہ نے آصف زرداری کو بطور صدر خوش آمدید کہا۔ تاہم امریکی اور پاکستانی فوجی قیادت کو اب بھی اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ بش مشرف کے سابقہ اتحاد کی طرح اب مولن کیانی اتحاد پاک امریکہ دوستی کے لیے مرکزی اہمیت رکھتا تھا۔ جن باتوں پر اتفاق ہوا وہ یہ تھیں:

اَ. پاکستان میں عسکری کاروائیاں صرف اور صرف پاکستانی فوج کرے گی۔ پارلیمنٹ اور انتظامیہ باہمی تعاون سے اخلاقی حمایت جاری رکھیں گے۔

ب. پاکستان میں امریکی موجودگی کو وسعت دینے کے لیے اسلام آباد میں ایک کھرب ڈالر کا منصوبہ بنایا گیا تاکہ امریکی سفارت خانے کو وسیع کیا جائے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے مشترکہ طور پر ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔

ج. امریکی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ اس خطے میں جنگ اور امن کے منصوبوں کو براہِ راست کنٹرول کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی اور پاکستانی فوجی قیادت میں پائیدار رشتہ قائم کیا جائے گا۔

د. معاہدے کے تحت نجی سکیورٹی کمپنیوں (بلیک واٹر) کو اسلام آباد میں دفاتر بنانے کی اجازت دی گئی۔ بلیک واٹر نے اسلام آباد میں پہلے ہی ۲۸۴ گھر کرائے پر لے رکھے تھے اور کوئٹہ میں اڈے اس کے علاوہ تھے۔ نیز پاکستان نے کارروائیوں کے لیے امریکہ کو تربیلا میں زمین فراہم کرنا تھی۔

ہ. آئی ایس آئی ایک مربوط نیٹ ورک بنائے گی جس کا کام قبائلی علاقوں میں القاعدۃ قیادت کو سی آئی اے کے ڈرون طیاروں کے ذریعے نشانہ بنانے کے لیے معلومات فراہم کرنا ہو گا۔

قصہ مختصر، ایک طرف تو معتدل طالبان سے امن مذاکرات کی کوششیں جاری تھیں اور دوسری طرف القاعدۃ اور طالبان کی گردن میں پھندا کسنے کی مربوط تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک جنگی منصوبہ ”آپریشن شیر دل“ کے نام سے بنایا گیا جس میں نیٹو اور پاکستانی فوجوں نے مل کر باجوڑ، مہمند، کنڑ اور نورستان کے علاقوں سے القاعدۃ کی عسکریت کو ختم کرنے کے لیے عملی خاکہ ترتیب دیا۔

القاعدۃ ۲۰۰۸ میں ہونے والی ان تمام پیش رفتوں کا مشاہد کر رہی تھی لیکن ان کا مقابلہ کرنے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ مکمل طور پر ایک نئی صورتحال تھی۔ ایک مضبوط سیاسی اتحاد دنیا کی مضبوط ترین جنگی مشینری کی پشت پناہی کر رہا تھا اور پاکستانی فوج پورا پورا تعاون کر رہی تھی۔ القاعدۃ کو باجوڑ، مہمند، نورستان اور کنڑ میں اپنی شاخوں کی بربادی واضح نظر آنے لگی۔ اس کے کئی اہم رہنما بشمول اسامہ الکینی، خالد حبیب، ابو لیث اللیبی، اور درجن سے زائد بہترین دماغ ڈرون حملوں میں مارے جا چکے تھے۔ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک بار پاکستانی فوج قبائلی علاقوں میں کامیاب ہو گئی تو یہ پوری طاقت سے سوات وادی اور مالاکنڈ میں جائے گی اور طالبان مزاحمت کے قابل نہیں ہوں گے۔ القاعدۃ مکمل طور پر پھنس

چکی تھی۔ مزید کھل کھیلنے کی اب کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ناگزیر طور پر نئے آرمی چیف کیانی کو ختم کرنے کا منصوبہ سوچا گیا۔

کیانی کے روزمرہ معمولات پہلے ہی القاعدۃ کی نظر میں تھے۔ وہ اکثر جِم جاتا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جِم کے اندر ایک آدمی تعینات کیا جائے جو کیانی سے "شہیدی معانقہ"[1] کرے۔ اگر مشن کامیاب ہوتا ہے تو پاکستان میں بدنظمی اور انتشار پیدا ہو جائے گا اور آرمی القاعدۃ کے خلاف گھیرا تنگ کرنے کے قابل نہ رہے گی۔ لیکن القاعدۃ کی شوریٰ نے منصوبہ رد کر دیا[2]۔ اس میں قباحت یہ تھی کہ اس سے امریکہ کو پاکستان میں براہِ راست مداخلت کا موقع ہاتھ آجاتا اور پاکستانی فوج مجبوراً القاعدۃ کے خلاف بھرپور جنگ میں امریکہ کے ساتھ ہوتی۔

ایسے نازک حالات میں کمانڈر الیاس کشمیری سامنے آئے۔ الیاس کشمیری آزاد کشمیر کی سماہنی وادی میں بھمبر میں ۱۰ فروری ۱۹۶۴ کو پیدا ہوئے۔ آپ نے اسلام آباد کی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن کا پہلا سال مکمل کیا اور جہادی سرگرمیوں کی وجہ سے مزید تعلیم جاری نہ رکھی۔ عسکری میدان میں آپ کی آمد تحریکِ آزادئ کشمیر سے ہوئی۔ پھر آپ حرکتہ الجہاد الاسلامی میں شامل ہوئے اور بالآخر ۳۱۳ بریگیڈ بنائی۔ یہ بریگیڈ جنوبی ایشیا کا طاقتور ترین گروپ بنی جس کا مضبوط نیٹ ورک پاکستان، افغانستان، کشمیر، انڈیا، نیپال اور بنگلہ دیش میں پھیلا ہوا ہے۔ سی آئی اے کے کچھ مراسلات کے مطابق ۳۱۳ بریگیڈ یورپ میں بھی موجود ہے اور ممبئی طرز کے حملے کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

1۔ شہیدی، استشہادی یا فدائی حملہ جہادی حلقوں میں خودکش حملے کے لیے استعمال ہونے والی مختلف اصطلاحات ہیں

2۔ سابقہ پاکستانی آرمی چیف جنرل (ر) پرویز کیانی پر حملہ کرنے کے لیے القاعدہ کے پاکستانی اراکین مکمل ورک کر چکے تھے لیکن اس کاروائی کے عمل درآمد کی صورت میں عام لوگ بھی زد میں آسکتے تھے جس کی وجہ سے اس کاروائی پر عمل درآمد روک دیا گیا۔ مترجم

الیاس کشمیری کی زندگی پر بہت کم لکھا گیا اور جو لکھا گیا اس میں بھی تضادات ہیں۔ لیکن دنیا کی تمام انٹیلی جنس ایجنسیاں متفقہ طور پر آپ کو نہایت فعال، خطرناک اور کامیاب ترین گوریلا لیڈر مانتی ہیں۔ آئی ایس آئی کی دوسری دفعہ حراست سے رہائی کے بعد ۲۰۰۵ میں آپ نے کشمیر چھوڑ دیا اور شمالی وزیرستان چلے گئے۔ ماضی میں انڈین فورسز نے آپ کو گرفتار کیا لیکن آپ جیل توڑ کر فرار ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کو آئی ایس آئی نے مشرف پر حملے کے ماسٹر مائنڈ ہونے کے شک میں گرفتار کیا لیکن رہا کر دیا۔ جب آپ نے کشمیر میں کارروائیاں بند کرنے سے انکار کیا تو آئی ایس آئی نے ۲۰۰۵ میں آپ کو دوبارہ گرفتار کر لیا۔ کشیدہ حالات والے سرحدی علاقوں میں آپ کی موجودگی نے واشنگٹن کی رگوں میں سرد لہر دوڑادی۔ انہیں احساس ہوا کہ اپنے وسیع تجربے سے آپ افغانستان کی روائتی لڑائی کو جدید گوریلا جنگ میں بدل سکتے ہیں۔ الیاس کشمیری کا سابقہ ریکارڈ اس کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

۱۹۹۴ میں آپ نے اپنے جہادی ساتھیوں کی رہائی کے لیے نئی دہلی میں الحدید آپریشن کیا۔ پچیس آدمیوں کے اس گروپ میں شیخ عمر سعید (جنہوں نے ۲۰۰۲ میں کراچی میں امریکی صحافی ڈینیئل پرل کو اغوا کیا) آپ کے نائب تھے۔ اس گروپ نے امریکی، برطانوی اور اسرائیلی سیاحوں کو اغوا کیا اور دہلی کے قریب غازی آباد لے گئے۔ پھر انڈین حکام سے اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کر دیا۔ اس کی بجائے انڈین حکام نے آپ کے ٹھکانے پر حملہ کر دیا۔ شیخ عمر زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔ (بعد میں آپ کو مغوی انڈین طیارے کے مسافروں کے بدلے میں رہا کروایا گیا)۔ الیاس کشمیری محفوظ رہے اور بچ نکلے۔

۲۵ فروری ۲۰۰۰ کو انڈین آرمی کے کمانڈوز نے لائن آف کنٹرول پار کر کے آزاد کشمیر کے گاؤں لنجوٹ میں چودہ شہریوں کو شہید کر دیا۔ یہ کمانڈوز پاکستانی لڑکیاں اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے اور میں سے تین کے سر قلم کر کے پاکستانی فوجیوں کی طرف پھینک دیے۔ اس

سے اگلے ہی روز الیاس کشمیری نے لائن آف کنٹرول پار کرکے نکیال سیکٹر میں ۳۱۳ بریگیڈ کے ۲۵ آدمیوں کے ساتھ انڈین آرمی کے خلاف گوریلا کارروائی کی۔ انڈین آرمی کے ایک افسر کو اغوا کیا اور اس کا سر قلم کر دیا۔ پھر اس افسر کے بریدہ سر کو کوٹلی کے بازاروں میں گھمایا گیا۔

الیاس کشمیری کا خطرناک ترین آپریشن مقبوضہ کشمیر کی انکور چھاؤنی انڈین آرمی کے خلاف تھا جب ۲۰۰۲ میں گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ اس آپریشن میں آپ نے ۳۱۳ بریگیڈ کے جنگجوؤں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حملے کے بعد انڈین جرنیل، بریگیڈیر اور دوسرے سینئر افسر جائے واردات پر اکٹھے ہو گئے۔ پھر دوسرے حملے میں دو جرنیل زخمی ہوئے اور کئی بریگیڈیر اور کرنل مارے گئے، جبکہ پاکستانی فوج تین جنگوں میں ایک بھی جرنیل زخمی نہ کر سکی۔ کشمیر میں طویل مدت سے جاری بھارتی جارحیت کے لیے یہ واضح ترین شکست تھی۔

ہندوستان میں کارروائیوں کا وسیع تجربہ رکھتے ہوئے آپ نے القاعدۃ رہنماؤں کو یہ تجویز پیش کرکے حیران کر دیا کہ موجودہ بند گلی سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ میدانِ جنگ کو پھیلا دیا جائے۔ آپ نے تجویز دی کہ انڈیا میں اس قدر بڑا آپریشن کیا جائے کہ انڈیا اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے۔ اس سے القاعدۃ کے خلاف جاری اور مجوزہ تمام آپریشن رک جائیں گے۔ القاعدۃ نے خوشی خوشی انڈیا پر حملے کی تجویز منظور کر لی۔ الیاس کشمیری نے یہ منصوبہ ایک لائق سابق آرمی میجر ہارون عاشق کو سونپا۔ ہارون عاشق بھی لشکرِ طیبہ کے سابق کمانڈر تھے اور اب بھی لشکرِ طیبہ کے کمانڈروں ذکی الرحمان لکھوی اور ابو حمزہ کے بہت قریب تھے۔ ہارون کو معلوم ہوا کہ آئی ایس آئی لشکرِ طیبہ کے ذریعے انڈیا میں محدود پیمانے پر معمول کا آپریشن کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔ یہ منصوبہ کئی ماہ سے زیرِ غور تھا لیکن

سرکاری پالیسی یہی تھی کہ ایسا نہ کیا جائے۔ سابق آرمی میجر نے انڈیا میں الیاس کشمیری کے آدمیوں کی مدد سے آئی ایس آئی کا یہ منصوبہ اڑا لیا۔ یوں یہ منصوبہ ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ کے خوفناک حملے میں بدل گیا جس نے انڈیا پاکستان کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔

تحقیقات کے مطابق حملہ آور کراچی سے روانہ ہوئے۔ بحیرۂ عرب میں سفر کرتے ہوئے بھارت کا ماہی گیری ٹرالر اغوا کیا، اس کے سارے عملے کو قتل کیا اور ربڑ کی کشتیوں کے ذریعے ممبئ میں داخل ہوئے۔ ہندوستانی وقت کے مطابق پہلا واقعہ رات ۸ بجے ہوا جب اردو بولنے والے دس آدمی ہوا بھری کشتیوں کے ذریعے کولابا کے ساحل پر دو مختلف جگہوں پر اترے۔ ان کے اہداف چھترا پتی شیواجی ٹرمینل، لیوپولڈ کیفے، تاج محل ہوٹل، اوبرائے ہوٹل اور نریمان ہاؤس کا یہودی مرکز تھے۔ انہوں نے پہلے لوگوں کو یرغمال بنایا پھر قتل کر دیا۔ آپریشن ۲۷ گھنٹے جاری رہا۔ ۲۶ نومبر کے واقعے نے پوری دنیا کو حیران کر دیا۔ یہ واقعہ نائن الیون جیسا ہی تھا جس کا مقصد انڈیا کو پاکستان پر جنگ مسلط کرنے پر اکسانا تھا بالکل اسی طرح جس طرح نائن الیون کے حملے میں امریکا کو افغانستان پر حملے کے لیے اکسایا گیا تھا۔ ۲۶ نومبر کے حملے کا مقصد پاکستان کی توجہ وار آن ٹیرر سے ہٹانا تھا تاکہ افغانستان میں نیٹو کے خلاف جنگ میں القاعدۃ اس صورتحال کا فائدہ اٹھا سکے۔

واشنگٹن میں بیٹھے فیصلہ سازوں نے بین السطور معاملے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ انڈیا اور پاکستان دوڑے اور جنگ ٹال دی۔ جب انڈیا اور پاکستان کی فوجیں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھیں تو پاکستانی فوج اور القاعدۃ کے جنگجوؤں میں مکمل جنگ بندی تھی۔ جب انڈیا کے حملے کی تلوار پاکستان کے سر پر لٹک رہی تھی تو جنگجو قنوتِ نازلہ پڑھ رہے تھے کہ انہیں ایک مسلمان فوج کے خلاف نہ لڑنا پڑ جائے۔ ان کی دعائیں تھیں کہ پاکستان اور القاعدۃ انڈیا کے خلاف جنگ میں متحد ہو جائیں۔ بروقت امریکی مداخلت سے جنگ تو ہوتے ہوتے رہ

گئی لیکن حالات کی کشیدگی کی وجہ سے جنگجوؤں کو موقع مل گیا کہ وہ خیبر ایجنسی میں نیٹو کی سپلائی پر تابڑ توڑ حملے کریں۔ اس سے ۲۰۰۸ میں پاک افغان سرحد پر چند دن کے لیے نقل و حمل بند رہی۔ افغانستان میں خاص طور پر غزنی، وردک اور ہلمند میں نیٹو فوج پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ نیٹو دستوں کو ایندھن نہ مل سکا اور آپریشن رک گئے۔ مشرقی سرحد پر انڈیا کے ساتھ کشیدگی کی وجہ سے آپریشن شیر دل میں پاکستان آرمی کی شمولیت ٹھنڈی پڑ گئی۔ فوج کو ۲۰۰۹ میں سوات میں طالبان کی شرائط قبول کرتے ہوئے ان سے معاہدہ کرنا پڑا۔

پھر کئی واقعات ہوئے۔ سوات میں نیا آپریشن ہوا، مہمند اور جنوبی وزیرستان میں آپریشن ہوئے اور (ڈرون حملے میں) بیت اللہ محسود شہید☆ ہوئے۔ لیکن ان واقعات سے جنگجوؤں کے حوصلوں میں کمی نہ آئی۔ ان کا ترکی بہ ترکی جواب ۱۰، اکتوبر ۲۰۰۹ کو جی ایچ کیو پر حملے اور ۴، دسمبر ۲۰۰۹ کو راولپنڈی کی فوجی مسجد میں فوجی افسروں کے قتل کی صورت میں آیا۔ ان واقعات کے پیچھے القاعدۃ الف لیلۃ کی ایک نئی کہانی جنم لے رہی تھی جس میں پریشان امریکی فوج کو تیس ہزار نئے فوجی افغان میدانِ جنگ میں اتارنا پڑے۔ اس دوران القاعدۃ جنگ کے اگلے مرحلے کے لیے نئی حد بندیاں وضع کر رہی تھی۔ الیاس کشمیری کو اس نئی حکمتِ عملی کے ساتھ القاعدۃ کی عسکری کمیٹی کا امیر بنایا گیا۔

آپ کی حکمتِ عملی کی بدولت صومالیہ اور یمن کے نئے میدانِ کارزار بنے جہاں سے مغربی تجارتی راستوں کو نشانہ بنایا گیا۔ آپ کا ہدف یہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ میں القاعدۃ کے آپریشن کے لیے یمن کو مرکز بنا کر عراقی مزاحمت کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ سعودی عرب میں بھی (امریکی مفادات پر) عسکری کارروائیاں شروع کی جائیں۔ کشمیری کے عسکری

☆ مصنف نے یہاں بیت اللہ محسود کے ساتھ شہید کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔ مترجم

منصوبوں میں

القاعدۃ کی پاک افغان جنگ کو انڈیا تک پھیلانا بھی شامل تھا۔ آئی ایس آئی اور سی آئی اے دونوں کو معلوم تھا کہ کشمیری کے ارادے کیا ہیں، اس لیے فروری ۲۰۰۹ سے ۱۴ ستمبر تک آئی ایس آئی کی فراہم کردہ معلومات پر ڈرون حملوں میں تین بار انہیں نشانہ بنایا گیا۔ آخری حملے میں ان کی موت کا اعلان کر دیا گیا اور واشنگٹن نے آپ کی شہادت کو سرکاری طور پر وار آن ٹیرر کے فیصلہ کن مرحلے کے طور پر منایا۔

تاہم ۳۱۳ بریگیڈ نے مجھے شمالی وزیرستان مدعو کیا اور انگوراڈا لے جایا گیا جہاں ۹، اکتوبر ۲۰۰۹ کو کشمیری نے مجھے انٹرویو دیتے ہوئے اپنی شہادت کی تمام افواہیں غلط ثابت کر دیں۔ آپ نے کہا:

القاعدۃ کی علاقائی عسکری چال جس میں انڈیا کو ہدف بنایا گیا دراصل امریکی طاقت کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

میں نے پوچھا "کیا دنیا کو ممبئی طرز کے اور حملوں کی توقع رکھنی چاہیے؟"

کشمیری کا جواب تھا:

مستقبل میں بھارت کے لیے جو منصوبے بنائے جا چکے ہیں ان کے مقابلے میں ممبئی واقعہ کچھ بھی نہیں تھا۔

نتیجہ یہ کہ بہت سے لوگ، جن میں سے کئی مبینہ طور پر کشمیری گروپ سے تھے، امریکہ میں گرفتار ہوئے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ انڈیا کے نیشنل ڈیفنس کالج پر حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے جس کا مقصد وہاں پر جمع انڈیا کے اعلیٰ افسران کو ختم کرنا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انڈیا میں محاذِ جنگ کھولنے کے لیے ممبئی اور دہلی کے علاوہ بھی کئی اہداف تھے۔ مقصد یہ تھا کہ انڈیا اور پاکستان معاندانہ رویوں میں مصروف رہیں اور القاعدۃ افغانستان میں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ یورپ میں بھی

وہ اسی طرح کی حکمتِ عملی پر غور کر رہے تھے اور کے ساتھ ساتھ ڈنمارک کے اخبار، جس نے نبی کریم ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کیے تھے، پر حملے کی منصوبہ بندی بھی کر رہے تھے۔

نائن الیون کے بعد القاعدۃ نے امن اور جنگ کی ایک سیاست وضع کی۔ اس نے جنگ میں قدم جمانے کے لیے پاکستان میں امن معاہدوں کی حربی چالیں چلیں ۔ جنگ کے ذریعے امن (مطلق امن) کے عمل کو سبوتاژ کیا۔ اور یہ عمل یوں ہی چلتا رہے گا جب تک کہ آخری فتح کا نقارہ نہیں بجتا۔

باب سوئم

تعمیرِ قیادت اور "ابنائے وطن" کی "حقیقی بھائیوں" میں تبدیلی

تعمیرِ قیادت اور "ابنائے وطن" کی "حقیقی بھائیوں" میں تبدیلی

ایک تصویر میں جوان ڈاکٹر ایمن الظواہری مغربی لباس میں نظر آرہے ہیں۔ بے ریش، سنہری مونچھیں اور دہری کمانی والی عینک لگائے ہوئے یہ ایک ابھرتے ہوئے سرجن کی تصویر ہے۔ تاہم یہ تصویر سب کچھ نہیں بتاتی۔ دراصل ایمن الظواہری کوئی معمولی انسان نہیں بلکہ نصف صدی پر محیط ایک تحریک ہیں۔ بہت سے مصنفین نے ان کے بارے میں حیران کن حقائق اکٹھے کیے ہیں۔ مثال کے طور پر دوسرے لڑکوں کے برعکس ایمن الظواہری بچپن میں ہی کھیل کود کی سرگرمیاں ناپسند کرتے تھے اور ایک جوان آدمی کی طرح شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے سرجن بننے کے لیے دنیاوی تعلیم حاصل کی تاہم سید قطب اور ان کی تحریریں آپ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ سید قطب اخوان المسلمون کے مبلغ تھے جنہیں ۱۹۶۰ کے وسط میں اشتعال انگیز ادب تخلیق کرنے کی پاداش میں پھانسی دے دی گئی۔

ایمن الظواہری پر سید قطب کا گہرا اثر ہے۔ اسلامی انقلاب ایمن الظواہری کا مقصدِ حیات بن گیا۔ آپ کے ایقان کے مطابق انسانوں کے وضع کردہ کسی بھی نظام کے خلاف بغاوت ناگزیر ہے کیونکہ یہ نظام جہالت ہیں، جیسا کہ سید قطب نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ سید قطب اور بعض دوسرے اسلام پسندوں نے مغربی سیاسی نظام کو جہالت قرار دیا ہے۔ الظواہری نے چودہ سال کی عمر میں اخوان میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۶۸ میں سید قطب کی شہادت کے بعد آپ نے ان کی سوچ اور نظریے کو پروان چڑھانے کے لیے اپنی حکمتِ عملیاں وضع کرنا شروع کر دیں۔ آنے والے برسوں میں آپ ایک سرجن بنے، شادی کی اور سرجن کے طور پر پریکٹس کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی خفیہ تنظیم بنائی تاکہ دوسری خفیہ تنظیموں کے ساتھ مل کر مصری حکومت کے خلاف کام کیا جائے۔ آپ کو

جیل ہوئی، رہائی ملی، ترکِ وطن کرنا پڑا، افغان جہاد پر گئے، مصر میں ایک اور انقلاب میں شریک ہوئے اور پھر ۱۹۹۰ کی دہائی میں امریکی جارحیت کے خلاف ایک طویل جنگ لڑنے کے لیے القاعدۃ میں شامل ہوئے۔ اس پچاس برس کے عرصے میں آپ نے اپنی زندگی کے ہر لمحے کو ایک تحریک کے طور پر لیا۔ چاہے یہ کلینک پر کام ہو یا خفیہ تنظیموں کی سرگرمیاں ہوں یا اپنی شادی ہو۔ اس سارے عرصے میں سید قطب آپ کے لیے مشعلِ راہ رہے۔ سید قطب کی تعلیمات کی روشنی میں الظواہری نے مسلم دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے جہاد کے ذریعے جہالت کو شکست دینے کے لیے کارروائیاں کیں۔

۱۹۷۹ میں جب سوویت یونین نے افغانستان پر چڑھائی کی تو پوری دنیا سے ہزاروں مسلمان افغان تحریکِ مزاحمت میں شمولیت کے لیے افغانستان آئے۔ ان کی اکثریت صدائے جہاد پر لبیک کہتے ہوئے اسلامی فتح کے لیے لڑنے آئی تھی۔ وہ اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ نبی کریم ﷺ کی اس حدیثِ مبارکہ پر ان کا ایمان تھا کہ آخر زمانہ کی جنگیں خراسان کی فتح سے شروع ہوں گی۔ ان جہادیوں کو جب عبد اللہ عزام جیسے علماء کے فتاویٰ کے ذریعے اس بات کا ثبوت مل گیا کہ روس کے خلاف افغان جنگ اصل میں ایک اسلامی تحریکِ مزاحمت ہے جس کا مقصد افغانستان میں امارتِ اسلامیہ قائم کر کے ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہے تو یہ لوگ افغانستان چل پڑے۔

افغانستان آنے والے ان نوجوان عربوں میں سے بہت سے الظواہری کی طرح پروفیشنل (پیشہ ورماہر) تھے۔ وہ بھی اسلامی انقلاب کے لیے وقف تھے اور فتح یقینی بنانے کے لیے اپنی زندگیاں قربان کرنے پر تیار تھے۔ یہ لوگ افغان مجاہدین کا ساتھ دینے ہی نہیں بلکہ ایک وسیع تر جدوجہد کا آغاز کرنے بھی آئے تھے۔ یہ لوگ جنوبی ایشیا میں ایک اسلامی مرکز

بنانا چاہتے تھے جو عالمی خلافت کے احیا کے لیے کام کرے۔ افغانستان سے روس کی پسپائی کے بعد یہ لوگ القاعدۃ کے نظریے سے متاثر ہوئے اور اس تحریک کے لشکر کا قلب بن گئے۔

یہ ان واقعات کی سادہ سی وضاحت ہے جو افغانستان پر روس کی چڑھائی سے لے کر گیارہ ستمبر تک رونما ہوئے۔ تاہم یہ کہانی بڑی گنجلک ہے۔ یہ الظواہری جیسے افراد کے ذریعے چلتی ہے جن سے اسامہ بن لادن متاثر ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے نظریات اگلی نسل تک منتقل کیے اور بھائیوں کی طرح مل کر لڑے۔ یہ عمل بلا رکاوٹ چلتا رہا اور عالمگیر لڑائی کے لیے القاعدۃ کی فوجیں تیار ہوتی رہیں۔ مگر اس کا مرکزی مقام افغانستان ہی رہا۔

اس سے پہلے القاعدۃ کی مکمل تصویر مغربی عوام کو کبھی نہیں دکھائی گئی۔ جو کچھ بھی دکھایا گیا وہ گمراہ کن تھا۔ لہٰذا گیارہ ستمبر کے بعد جو بھی فیصلے کیے گئے وہ مبنی بر غلط تھے۔ گیارہ ستمبر سے پہلے دنیا بھر کی انٹیلی جنس ایجنسیاں القاعدۃ کو محض قاتلوں کا ایک غیر منظم گروہ سمجھتی تھیں نہ کہ ایک تنظیم جو امریکا پر حملے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ جب القاعدۃ کی نئی صلاحیتوں کے بارے میں پتا چلا تو بھی اس کی اصل ماہیت و ہیئت اور عزائم ایک تجسس ہی رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی شکست القاعدۃ کا جنون ہے اور اس کے تمام منصوبے اسی سوچ کے عکاس ہیں۔ جنگوں میں نظریات کا بڑا کردار ہوتا ہے لیکن تنہا نظریات ثمر آور نہیں ہوتے۔ کامیابی کے لیے نظریات اور وسائل کا ملاپ ضروری ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی غیر موجودگی کی وجہ سے ناکامی ہی ملے گی۔ القاعدۃ ۱۹۸۰ کی دہائی میں وجود میں آئی لیکن اس کی اصل شکل ۱۹۹۰ کی دہائی میں بنی جب نظریات اور وسائل یکجا ہوگئے۔ یعنی الظواہری کے نظریات اور اسامہ بن لادن کے وسائل میں ادغام ہوگیا۔

چھے فٹ تین انچ لمبے، امیر اور شاہی خاندان کے اتنے قریب کہ خاندان کا فرد کہلائے جانے والے اسامہ بن لادن ایک ”ناراض نوجوان“ سمجھے جاتے تھے۔ چودہ سال قبل

اسامہ بن لادن پہلی خلیجی جنگ کے بعد مغربی فوجوں کو اپنی زمین استعمال کرنے کی اجازت دینے پر اپنے وطن سعودی عرب کے سلطان کی سلطنت کے خلاف بولے۔ بن لادن خاندان کا کاروباری دنیا میں بہت اثرورسوخ تھا اور شاہی خاندان اور کاروباری حلقوں میں انہیں بہت زیادہ عزت واحترام حاصل تھا۔ خاندان کے لوگوں نے بن لادن کو ترغیب دی کہ آپ ذاتی طور پر شاہ فہد سے ملیں اور ان سے معافی مانگ لیں۔ سعودی شاہی خاندان کے بہت سے اہم لوگوں، جن میں شہزادہ ترکی اور شہزادہ عبداللہ بھی شامل تھے، نے اس تنازع کو حل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اسامہ بن لادن اور آپ کے حامیوں کے متعلق غلط تاثرات اور غلط فہمیوں کا یہ نقطہ آغاز تھا۔ امریکی انٹیلی جنس نے آپ کو سعودی حکومت کا باغی کہا جو 1980 میں روس کے خلاف افغان جہاد میں بہادری سے لڑا لیکن سعودی عرب میں آپ کو محض ایک سیاسی مخالف سمجھا گیا۔ اصل میں اسامہ بن لادن دلی طور پر امریکا مخالف بن چکے تھے۔ جب سعودی حکومت نے پہلی خلیجی جنگ میں امریکی فوجوں کو دعوت دی تو آپ سعودی حکومت کے بھی خلاف ہوگئے۔ مگر اس وقت آپ کے پاس کوئی لائحہ عمل یا کوئی نظریہ نہیں تھا۔ زیادہ تر سیاسی تجزیہ نگاروں کا ماننا ہے کہ امریکا کے خلاف آپ کی ابتدائی نعرے بازی وہیں تک محدود رہتی اگر آپ کی ملاقات ۱۹۷۷ میں ایمن الظواہری سے نہ ہوتی۔ ایمن الظواہری نے بن لادن کو امریکا کے خلاف مسلح جدوجہد کی تلقین کی اور اسے اس قدر راسخ کر دیا کہ اسامہ بن لادن کی امریکا کو دی گئی غیر یقینی دھمکی ایک خوفناک حقیقت کا روپ دھار گئی۔

سعودی مخالف گروپ تحریکِ اصلاحاتِ اسلامی برائے عرب کے سربراہ سعد الفقیہہ کو القاعدۃ پر ماہر سمجھا جاتا ہے۔ ٹیررازم مانیٹر کے نمائندہ خصوصی ماہان عابدین نے لندن میں ۲۳ جنوری ۲۰۰۴ کو سعد سے انٹرویو کیا۔ اس انٹرویو میں سعد نے تفصیل سے بیان

کیا کہ کس طرح امریکا کے خلاف جنگ کے الظواہری نظریے کی قبولیت نے اسامہ بن لادن کی فکر و نظر تبدیل کر دی۔ سعد کے مطابق ۱۹۷۷ کے آخر میں الظواہری کے ساتھ اسامہ بن لادن کی ملاقات سے اسامہ بن لادن کی امریکا مخالف جدوجہد کا مقصد اور منہج تبدیل ہو گیا۔ آپ کی نئ حکمتِ عملی اب عالمگیر محاذ کی بنیاد پر تھی۔ سعد کے مطابق:

> عالمی سطح پر۔۔۔ الظواہری اور بن لادن نے اپنی کارروائیاں کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بارے میں محض اپنے وسائل پر نہیں بلکہ اپنے دشمنوں کے وسائل سے بھی تمتع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مختصر یہ کہ دشمن کے اثاثہ جات کو انھیں کے خلاف ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا۔

سعد وضاحت کرتے ہیں کہ:

> ہم آغاز کو لیتے ہیں۔ جب اسامہ بن لادن نے افغانستان میں جہاد شروع کیا تو وہ ایک سادہ نظریاتی مسلمان تھے جو اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ بلاشبہ آپ نے اس وقت عالمی سیاست اور امریکا اور روس کے درمیان طاقت کے توازن کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن آپ زیادہ تر عسکری حالات میں مستغرق رہے۔ آپ کے بعض وفاداروں کے مطابق آپ مستقبل میں امریکہ سے محاذ آرائی پر غور کر رہے تھے۔ ۱۹۸۰ کی دہائی کا زیادہ عرصہ روس کے خلاف جنگ میں گزر گیا۔ جب شاہی خاندان نے امریکی فوجوں کو آنے کی دعوت دی یا خود امریکیوں نے آنے کا فیصلہ کیا، تو بن لادن بہت حیران ہوئے۔
>
> افغانستان میں آپ روسیوں کو نکال باہر کرنے کے لیے لڑے تھے لیکن اب ایک مقدس ترین اسلامی ملک پر امریکا چڑھائی کر رہا تھا۔ اب اگر وہ

اپنے قول کی پابندی کرتے ہیں تو انہیں امریکا کے خلاف لڑنا ہی تھا۔ بن لادن سعودی حکومت، مذہبی قیادت اور علماء کے انحراف سے بہت حیران ہوئے۔ کسی نے بھی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا کہ پانچ لاکھ سے زائد ناپاک امریکی جزیرۃ العرب کے مرکز میں موجود تھے۔ اسامہ بن لادن کے قلب و ذہن پر اس واقعے کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ ریاستوں کے اختلافات کی وجہ سے اب اسلام کا مقصد پورا نہیں ہورہا۔ آپ کو کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ آپ نے سعودی عرب چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔

پہلے آپ واپس افغانستان گئے اور مجاہدین کے مخالف گروپوں میں مصالحت کی کوششیں کیں۔ آپ ناکام رہے اور تقریباً قتل ہی کر دیے گئے تھے کہ۔۔۔ پھر آپ سوڈان چلے گئے۔ سوڈان میں جا کر آپ کو پتا چلا کہ یہاں کی حکومت بہت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ بن لادن کو اس وقت سرپرستی نہیں بلکہ پناہ سے غرض تھی۔ آپ نے سوچا کہ وہ آپ کو یہاں پناہ مل جائے گی۔ تعمیراتی کاموں کا تجربہ رکھنے کی وجہ سے سوڈانی تعمیرات میں سوڈانیوں کی مدد بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت سعودی حکومت آپ سے معاندانہ برتاؤ نہیں برت رہی تھی۔

بہت سے حجازی سوداگر سوڈان جاتے اور آپ سے مشورے لیتے۔ بن لادن نے ان لوگوں کو سوڈانی تجارت میں سرمایہ کاری کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن آپ نے سوڈان میں اسلامی مفادات کے فروغ کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔

سعد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسامہ بن لادن ایک عام مسلمان تھے اور آپ پوری دنیا کے مسلمانوں اور ان کے مفادات کے بارے میں سوچتے تھے۔ آپ امریکا کے خلاف تھے لیکن امریکا نے آپ کو بڑا چیلنج نہیں سمجھا باوجود اس کے کہ آپ کے پاس وسائل تھے اور ارمان بھی لیکن کوئی حکمتِ عملی نہیں تھی۔ یہ صورتحال الظواہری کے منظر عام پر آنے سے مکمل طور پر بدل گئی کیونکہ الظواہری کے پاس ایک منصوبہ تھا۔ سعد کے مطابق:

> منصوبہ زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ یہ صرف اتنا تھا کہ سعودی عرب میں امریکی ٹھکانوں پر بم برسائے جائیں۔ اسامہ بن لادن نے کافروں سے کہا کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ امریکیوں نے ان اعلانات کو کوئی اہمیت نہ دی اور خاموش رہے۔ اگر آپ ماضی میں جائیں اور امریکی بیانات پڑھیں تو آپ کو اسامہ بن لادن کی اہمیت کے بارے میں کوئی بیان نہیں ملے گا۔ مئی ۱۹۸۸ تک ایسا ہی تھا لیکن الظواہری منظر عام پر آئے اور بن لادن کا نقطۂ نظر تبدیل ہو گیا۔ الظواہری جب افغانستان آئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ جزیرۃ العرب میں امریکیوں سے محاذ آرائی کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ الظواہری نے بن لادن کو سمجھایا کہ امریکی نفسیات کو سمجھیں۔ امریکا ایک ''کاؤ بوائے'' ذہنیت رکھتا ہے۔ اگر آپ نظریاتی اور عملی طور پر ان کی شناخت کر کے ان سے محاذ آرائی کریں گے تو وہ شدید ردعمل دکھائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں جب انہیں تنگ کیا جائے گا تو امریکی اپنے تمام وسائل سے کاؤبوائے کی طرح بن جائیں گے۔ پھر وہ آپ کو ایک ناقابل تسخیر دشمن کے طور پر نئی بلندیوں تک پہنچا دیں گے۔ یہ چیز مسلمانوں کی اس دیرینہ خواہش کو پورا کر دے گی کہ کوئی مسلمان رہنما ہو جو کامیابی سے

مغرب کو چیلنج کر سکے۔ الظواہری نے بن لادن کو مشورہ دیا کہ اس موضوع پر اپنے ۱۲ صفحات کے بیان کو بھول جائیں کیونکہ کسی نے بھی اسے نہیں پڑھا۔ اس کے بجائے ایک مختصر بیان جاری کریں کہ ہر امریکی ہمارا ہدف ہے۔ اگرچہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ متنازعہ بات سمجھی جاتی تھی لیکن الظواہری نے دلیل پیش کی کہ عملی بنیادوں پر (یعنی نتائج کے اعتبار سے اور حکمت عملی کے طور پر) اس کی اجازت ہے۔ بعد میں فروری ۱۹۹۸ میں تین چار سطری بیان جاری ہوا اس میں ہر امریکی کا خون بہانے کی اجازت تھی۔ اگر اسامہ بن لادن صرف سعودی عرب میں ہی امریکی فوجوں پر حملہ کرنے پر اصرار کرتے تو ان کا حال بھی جنوبی امریکہ اور افریقہ کے ان گروہوں کا سا ہوتا جن کے بارے میں کسی کو کچھ یاد بھی نہیں۔ بذاتِ خود امریکی شناخت کو چیلنج کرنا ایک بڑی تبدیلی کا ہی نتیجہ تھا۔

۱۹۹۸ میں افریقہ میں امریکی سفارت خانوں پر حملے سے القاعدۃ سے متعلق امریکی فہم کو بڑا جھٹکا لگا اور واشنگٹن کو احساس ہوا کہ ایک نیا دہشت گرد گروپ امریکی مفادات پر حملے کرنے کے لیے ابھر رہا ہے۔ نائن الیون کے واقعے نے اس میں کوئی شک و شبہ نہ رہنے دیا۔ تاہم اربوں ڈالروں کے فنڈز اور بہت زیادہ وقت اور دنیا بھر میں قائم انسدادِ دہشت گردی کے اداروں کے باوجود امریکی فیصلہ ساز اب بھی القاعدۃ کی سوچ کے بارے میں لاعلم تھے۔ اگر ۱۹۸۰ سے ۲۰۰۰ تک افغانستان جنگ کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جاتا تو یہ بات سمجھنا آسان ہوتی کہ امریکہ سے لڑنے کے لیے القاعدۃ کے پاس مادی وسائل سے زیادہ انسانی وسائل تھے جو پوری مسلم دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک سادہ لیکن پکا مسلمان الظواہری کے لیے سٹریٹجک اثاثہ بن گیا۔ الظواہری نے اسامہ بن لادن کو اپنے عسکری اور نظریاتی مقاصد پر

راضی کیا اور الظواہری کی تحریک خود بخود مضبوط ہو گئی خاص طور پر جب اس میں بن لادن کی دولت بھی شامل ہو گئی۔ لہٰذا امریکی جنگی سازوسامان کے خلاف ایک خطرناک مسلح حقیقت نے جنم لیا۔ القاعدۃ نے پھر مزید ایسے مسلمان نوجوانوں کی تلاش شروع کر دی جو وسائل بھی رکھتے ہوں اور امت کے بارے میں فکر مند بھی ہوں۔

لیکن یہ تصویر اب بھی نامکمل ہے۔ کچھ محرکات ایسے ہیں جن کا ابھی تذکرہ نہیں ہوا۔ ان محرکات کی بدولت حقیقت میں القاعدۃ کی الف لیلۃ کا سٹیج تیار ہوا اور نائن الیون کے بعد امریکا کے خلاف عالمگیر لڑائی شروع ہو گئی۔ القاعدۃ کی سوچ کے بیج ۱۹۸۰ کے روس مخالف افغان جہاد میں بوئے گئے تھے۔ وہ عرب جو افغانستان میں جہاد میں شامل ہوئے تھے ان کے دو گروپ بن گئے تھے: یمنی اور مصری۔ وہ مذہبی جوشیلے جو مقامی مولویوں سے متاثر ہو کر افغانستان چلے آئے تھے وہ یمنی کیمپ میں شامل ہوئے۔ یہ لوگ سخت محنت کرتے، سارا دن عسکری ورزشیں کرتے، اپنا کھانا خود پکا کر کھاتے اور عشاء پڑھ کر سو جاتے۔ جب افغان جہاد ۱۹۸۰ کی دہائی کے آخر میں پہنچا تو یہ لوگ وطن واپس چلے گئے۔ جو وہاں رہ گئے وہ افغان آبادیوں میں گھل مل گئے یا پاکستان میں شادیاں کر لیں۔ القاعدۃ حلقوں میں انہیں درویش (سہولت پسند) کہا گیا۔

مصری گروپ کے لوگ بہت زیادہ سیاسی ذہن رکھنے والے اور نظریاتی لوگ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ اخوان کے رکن تھے تاہم یہ ناخوش تھے کہ تنظیم انتخابات اور جمہوریت کے ذریعے معاشرے میں تبدیلیاں لانے پر مصر تھی۔ ان ہم خیال ڈاکٹروں، انجینئروں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ جہادیوں کے لیے افغان جہاد طاقتور سریش کا کام کر گیا۔ بعض لوگ مصری آرمی کے سابقہ فوجی تھے جو الظواہری کی خفیہ تنظیم اسلامک جہاد سے منسلک تھے۔

جب انور سادات نے کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیل سے امن معاہدہ کیا ۱۹۸۱ میں اس کے قتل کا ذمہ دار بھی یہی گروپ تھا۔ ان سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ عربوں کے عروج و زوال کا سبب امریکا اور اس کی کٹھ پتلی حکومتیں ہیں۔ مصری کیمپ کے منتظم ایمن الظواہری تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد یہ لوگ مل بیٹھتے اور عرب دنیا کے مسائل پر گفتگو کرتے۔ ان کے قائدین کا پیغام تھا کہ مسلمان فوجوں میں اپنے وسائل صرف کیے جائیں اور نظریاتی طور پر انہیں متحرک کیا جائے۔

۱۹۹۰ کے وسط میں افغان صدر پروفیسر برہان الدین ربانی اور ان کے طاقتور وزیر دفاع احمد شاہ مسعود نے اسامہ بن لادن کو سوڈان سے افغانستان آنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے لوگ مصری کیمپ میں شامل ہوئے اور مستقبل کی جنگ کی تیاری کے لیے معسکر بنائے گئے۔ جب طالبان ایک طاقت بن کر ابھرے تو مصری کیمپ اپنی عسکری حکمتِ عملی وضع کر چکا تھا۔ اس حکمتِ عملی میں اہم ترین بات یہ تھی کہ:

- بدعنوان اور مستبد حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی جائے اور عوام میں ان کی ساکھ خراب کرنے کے لیے انہیں ہدف بنایا جائے۔
- امریکی کردار پر توجہ مرکوز کی جائے جو مشرقِ وسطیٰ میں استبدادی حکومتوں اور اسرائیل کا حامی ہے۔ ہر خاص وعام کو یہ بات سمجھائی جائے۔

روس کے خلاف افغان جہاد کا دور تھا اور مصری کیمپ نے دنیا بھر سے آئے ہوئے نوجوانوں کی سوچ بدل کر رکھ دی۔ القاعدۃ خود ایک دوسری تنظیم سے نکلی۔ یہ عبداللہ عزامؒ کا مکتب الخدمت تھا جو آپ نے ۱۹۸۰ کی دہائی میں افغان جہاد میں شامل ہونے والوں کی سہولت کے لیے بنایا تھا۔ عبداللہ عزامؒ کو ۱۹۸۹ میں شہید کر دیا گیا اور ان کے شاگرد اسامہ بن لادن اس تنظیم کے سربراہ بن گئے۔ بن لادن نے اس تنظیم کو القاعدۃ میں بدل دیا مگر یہ

ساختی تبدیلی تھی۔ اگر الظواہری اور مصری کیمپ کے نظریات اور طرزِ جہد اسامہ بن لادن کے سامنے نہ ہوتی تو القاعدۃ اتنی مؤثر نہ ہوتی۔ الظواہری ہی وہ شخصیت ہے جس نے القاعدۃ کو وہ کچھ بنا دیا ہے جسے آج ہم جانتے ہیں۔

۱۹۸۰ کا اسامہ بن لادن ۲۰۰۵ کے اسامہ بن لادن سے مختلف تھا۔ آپ امریکا کے مخالف تھے لیکن تب آپ کو مکمل احساس نہیں تھا کہ موجودہ مسلم ریاستیں بشمول سعودی عرب، واشنگٹن کی عالمی پالیسیوں کی پیروی کرتی ہیں۔ افغانستان اور پاکستان میں عرب جنگجوؤں کے ساتھ تقریباً بیس سال گزارنے والے حذیفہ بن عزام نے عمان میں انٹرویو دیتے ہوئے مجھے بتایا کہ:

> یمنی جنگجو زیادہ تر بہت سادہ لوح ہوتے تھے اور ان کا شوق شہادت پانا تھا۔ کمیونزم کے زوال کے بعد یہ لوگ افغانستان سے چلے گئے۔ مصری وہیں رہے کیونکہ ان کے مقاصد ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ جب اسامہ بن لادن ۱۹۹۶ میں سوڈان چھوڑنے کے بعد ان سے ملے تو مصریوں نے آپ کی سوچ بدلنے پر توجہ دی۔ اسامہ بن لادن کی مشرقِ وسطیٰ میں امریکی اجارہ داری کی مخالفت اب ایک نئے تناظر میں ڈھل گئی جس میں مغربی عیسائی دنیا اور مسلم مشرق وسطیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب میں ۱۹۹۷ میں اسلام آباد میں اسامہ بن لادن سے ملا تو آپ کے ساتھ مصری کیمپ کے تین لوگ تھے: صومالی ابو عبیدہ، مصری ابو حفص اور سیف العادل۔ جب میرے والد صاحب نے ۱۹۸۵ میں انہیں افغانستان جانے کو کہا تھا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ اگر شاہ فہد ذاتی طور پر اجازت دیں تو ہی وہ جائیں گے۔ اس وقت تک اسامہ بن لادن شاہ فہد کو اولی الامر ہی خیال

کرتے تھے۔ نائن الیون کے بعد جب انہوں نے سعودی حکمرانوں کو مجرم کہا تو یہ مصری کیمپ کا ہی اثر تھا۔

۱۹۹۸ میں دارالسلام (تنزانیہ) اور نیروبی (کینیا) میں امریکی سفارت خانوں پر حملے امریکی مفادات کے خلاف القاعدۃ کا آغاز تھا۔ اس کے بدلے میں امریکا نے خوست اور قندھار پر میزائل مارے۔ اس کے ردعمل میں القاعدۃ نے خصوصی گروپ بنایا جس کے ذمے نائن الیون کے حملوں کی منصوبہ بندی تھی۔ یہ منصوبہ پورا ہونے میں تین سال لگے۔ اس کے بعد بھی مصری کیمپ کے ارکان اور القاعدۃ کے قائدین میں امریکا کو نیچا دکھانے کے لیے وسیع تر حملوں کی منصوبہ بندی پر بات چیت ہوتی رہی۔

۷ اکتوبر ۲۰۰۷ کو جب امریکہ نے نائن الیون حملوں کے جواب میں افغانستان پر چڑھائی کی تو القاعدۃ کے اہم لوگ پہلے ہی ملک چھوڑ چکے تھے۔ ان کے مشن میں کئی اہداف تھے:

- سٹریٹجک حلقوں مثلاً مسلح افواج اور خفیہ ایجنسیوں کے لوگوں میں نظریاتی تبدیلی لائی جائے۔
- نئے لوگ بھرتی کیے جائیں اور نئے مرکز بنائے جائیں۔
- ہر مرکز کو بااختیار اور خودکفیل بنایا جائے، ایک مرکز منصوبہ بندی کے لیے اور دوسرے مراکز خفیہ اداروں کو دھوکہ دینے کے لیے ہوں۔

القاعدۃ کی اصل جنگ نائن الیون کے بعد شروع ہوئی۔ افغانستان پر امریکی چڑھائی کے بعد ان کی پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ہجرت ان کی جدوجہد میں ایک اہم سنگ میل تھا۔ پرانا مصری کیمپ اب مکمل طور پر القاعدۃ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسامہ بن لادن اور الظواہری اس کے رہنما تھے۔

اپنے نئے گھر پاکستان میں القاعدۃ کو نئے مسائل در پیش آئے۔ انقلابی نظریات پھیلانے کے لیے پاکستان ایک زرخیز زمین تھی۔ ۱۹۷۹ سے ۱۹۹۳ تک روس کے خلاف افغان جہاد ہوا پھر ڈیڑھ سال تک طالبان کی حکومت رہی۔ ان دونوں واقعات کے پاکستان کی معاشرتی اور سیاسی زندگی پر براہِ راست اثرات مرتب ہوئے۔ محض ایک دہائی میں ہی طالبان سوچ کے حامل ہزاروں اسلامی مدرسے وجود میں آئے۔ اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے مقبوضہ کشمیر میں علیحدگی پسند تحریکوں کو ابھارا اور کئی جہادی گروپوں مثلاً جیشِ محمد، حرکت المجاہدین، حرکت الجہاد الاسلامی اور لشکرِ طیبہ کی پرورش کی۔ مزید بر آں، جنرل ضیاء الحق کی گیارہ سالہ فوجی حکومت نے معاشرے اور فوج دونوں میں اسلامی اقدار کو فروغ دیا اور فوج میں جہادی جذبے کو پروان چڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ افغانستان پر امریکی چڑھائی نے امریکہ مخالف جذبات میں مزید شدت پیدا کر دی اور طالبان اور القاعدۃ سے ہمدردی بڑھ گئی۔ اس سارے شور شرابے میں القاعدۃ نے اسلام پسندوں کو مختلف کیمپوں میں بانٹنے اور اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہی نظریات پھیلائے جو الظواہری نے اسامہ بن لادن کو سکھائے تھے۔ افغانستان میں نیٹو سے لڑنے کے لیے یہ القاعدۃ کا آخری ہتھیار تھا۔ اگلے مرحلے میں القاعدۃ کی نظریاتی خصوصیات ابنائے وطن میں منتقل کی گئیں اور انہیں حقیقی بھائی بنایا گیا۔

مستقبل کی ساری جنگ انھیں دھرتی کے بیٹوں نے لڑنا تھی۔ القاعدۃ کا مقصد الظواہریوں کی ایسی نسل پیدا کرنا تھا جس کا ہر فرد تاحیات جدوجہد پر یقین رکھتا ہو، ان کا جینا مرنا اسی تحریک کے لیے ہو۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ اپنے پیچھے ایک دوسری نسل چھوڑ جائیں جو امریکا کے خلاف جنگ جاری رکھے۔ بس یہی القاعدۃ کا اسلحہ خانہ تھا۔ اگلے مرحلے میں

القاعدۃ نے میڈیا ونگ السحاب بنایا جس نے افغانستان اور عراق میں نیٹو فوج پر طالبان اور القاعدۃ کے حملوں کی اصل ویڈیوز بنائیں۔

السحاب نے اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، یحیٰ اللیبی اور دوسرے مبلغین کی تفصیلی تقاریر نشر کیں۔ اس نے مغرب اور اس کے مسلمان اتحادیوں کے خلاف القاعدۃ کے پیغامات پر مشتمل دستاویزی فلمیں بنائیں۔ القاعدۃ کے علماء کی عربی تصانیف کا ترجمہ کر کے شائع کیا گیا اور پورے پاکستان میں تقسیم ہوا۔ اس میں خاص لوگوں کو ہدف بنایا گیا۔ مثلاً اسلامی ذہن رکھنے والے پیشہ ور، ڈاکٹر، انجینئر، آرمی افسر، فوجی، آئی ٹی ماہرین وغیرہ

اس کتاب کے پہلے ابواب میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح القاعدۃ نے قبائلی جوانوں کو متحرک کیا اور طالبان جنگجو پیدا کیے۔ مگر القاعدۃ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ غیر منظم ہجوم اکٹھا کر لیا جائے۔ قبائلی علاقوں میں القاعدۃ نے نیک محمد، بیت اللہ محسود، عبد اللہ محسود اور حکیم اللہ محسود جیسے فطری لیڈر تلاش کیے، ان میں القاعدۃ کے نظریات منتقل کیے اور مستقبل میں کام آنے والی حکمتِ عملیاں سکھائیں۔ ان منتخب رہنماؤں کو اپنے پیروکار خود ہی تلاش کرنا تھے۔

القاعدۃ قیادت کو یقین تھا کہ ایک بار ان کا پیغام مطلوبہ پروفیشنل مسلمان نوجوانوں تک پہنچ گیا تو مادی وسائل کا کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ مسلمان فوجیوں اور افسروں کی طرح لاکھوں ڈالر مالیت کے جدید ہتھیار خریدنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ یہ لوگ اپنی ذہانت سے اپنے ہتھیار خود ہی بنالیں گے۔ اگر حالات کا تقاضا ہوا تو یہ لوگ اپنی تنظیموں سے ہتھیار چوری بھی کر لیں گے۔ آئی ٹی اور میڈیکل سائنس کے شعبے کے نظریاتی نوجوان اضافی اثاثہ ہوں گے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے القاعدۃ نے اپنا پیغام پھیلایا اور مسلم نوجوانوں پر حقیقت واضح کرتے ہوئے انہیں آمادہ کیا کہ اپنی مہارتیں استعمال کرتے ہوئے اپنی

اپنی قیادت کو مغرب سے دور کریں۔ مسلم اسٹیبلشمنٹ کے خلاف بغاوت کرنا کبھی بھی القاعدۃ کا ہدف نہیں رہا تھا۔ ہدف صرف یہ تھا کہ مسلم ریاستوں میں امریکی اجارہ داری کا توڑ کیا جائے۔

القاعدۃ نے پاکستان کے خلاف ہتھیار ۲۰۰۷ میں اٹھائے جب اس پر واضح ہو گیا کہ پاکستان کے تمام سیاسی اور فوجی مقاصد مغرب سے وابستہ ہیں۔ اس کی ترکیب بہت سادہ سی تھی لیکن کام آگئی۔ ۲۰۰۳ سے القاعدۃ مسلح افواج میں نزاع کے بیج بونے میں کامیاب ہو گئی۔ پاکستان کے قبائلی نوجوان اور سابقہ حکومتی حامی جہادی حلقے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ سے دور ہو کر القاعدۃ کی اطاعت میں آگئے۔ ۲۰۰۲ کے شروع میں طالبان کی شکست اور القاعدۃ کی پسپائی کے بعد کچھ قبائلی علاقوں میں نئے کھیل شروع کرنے کی منصوبہ بندی تھی لیکن اس وقت تک القاعدۃ جنوبی ایشیا کے اہم اسلام پسندوں کو اپنے نظریات اور عسکریات منوانے میں کامیاب ہو چکی تھی، لہٰذا اب اپنی مرضی کی جنگی چال چلنے کے قابل تھی۔

کیپٹن خرم شہید

۲۳ دسمبر ۲۰۰۵ کو کیپٹن خرم نے مجھے ایک ای میل کی:

جناب ڈاکٹر صاحب السلام علیکم !(طالبان انگریزی بولنے والے ہر شخص کو ڈاکٹر صاحب کہہ کر بلاتے ہیں) میں نے گذشتہ چند ماہ سے آپ کے مضامین پڑھنے شروع کیے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ ان چند تجزیہ نگاروں میں سے ہیں جو پاکستانی جہادی جماعتوں کے بارے میں صحیح ادراک رکھتے ہیں۔

میں نے آپ کا آرٹیکل ''مسلح اور خطرناک طالبان رواں دواں'' پڑھا ہے اور اس پر تبصرے سے پہلے میں اپنا تعارف کروانا چاہوں گا۔

میں ۲۰۰۱ میں پاکستان کے سپیشل سروسز گروپ کے انسدادِ دہشت گردی خفیہ ونگ 'ضرار' میں کمانڈر تھا۔ نائن الیون ایک عجیب آتش فشاں تھا۔ اس نے لوگوں کی نظریاتی حد بندی کر دی۔ میں بھی جہادیوں سے متاثر ہوا اور کشمیر میں لشکرِ طیبہ میں شامل ہو گیا۔

۹۹-۱۹۹۸ میں جب خفیہ ضرار گروپ کا ایک این سی او ریٹائر ہو کر لشکرِ طیبہ میں شامل ہوا تو لشکر کی تربیت کا عمل یکدم تبدیل ہو گیا۔ یہ ریٹائرڈ کمانڈر شہری علاقوں میں کارروائیوں کی خصوصی مہارت رکھتا اور اس کی تربیت کی وجہ سے لشکری فدائیوں نے انڈین بیرکوں میں خوفناک حملے کیے۔ ان حملوں کا عروج کالو چک میں خوفناک حملہ تھا جس پر واجپائی طبل جنگ بجاتا جموں آ کھڑا ہوا تھا۔ ابو فہد اللہ کے نام سے مشہور شمشاد ۲۰۰۰ میں شہید ہو گیا اور لشکری کی تربیت میں اچانک سکوت اور جمود آ گیا۔

میرے بھائی سابقہ آرمی میجر تھے اور نائن الیون کے بعد بہت بدل گئے تھے۔ سروس سے فراغت پانے کے بعد وہ لشکرِ طیبہ میں شامل ہو گئے۔ میری یونٹ کا ایک افسر بھی اسی راستے پر چل نکلا۔ میں بھی نتائج کی پروا کیے بغیر جلد ہی اس گروپ میں شامل ہو گیا۔ ایک سال کے بعد ہم تینوں لشکر کی قیادت کی سازشوں سے تنگ آ کر لشکرِ طیبہ سے نکل آئے۔

ان نام نہاد پاکستانی جہادی رہنماؤں کی انتہا درجے کی منافقت، عیش پسندی اور برائیوں پر کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن میری اس ای میل کا یہ

مقصد اور موضوع نہیں ہے۔ اس کا مقصد آپ کے مذکورہ بالا آرٹیکل سے ہے۔

لشکرِ طیبہ کے گروہ میں مجھے ان کے فریب، ذرائع نقل و حمل اور کالے بازار کی سرگرمیاں جاننے کا موقع ملا۔ مزید برآں، مجھے مختلف گروہوں مثلاً القاعدہ اور طالبان اور دوسرے پاکستانی گروپوں کے نظریات اور اختلافات بھی معلوم ہوئے۔ دہشت گردی میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ میں نے اس پر جو آخری دفعہ لکھا وہ ۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۴ کے The Nation Plus میں ایک فیچر آرٹیکل تھا۔ یہ چینی یرغمالیوں کی رہائی کے بارے میں تھا۔ اس پس منظر اور تامل ٹائگرز کے حربوں کے گہرے مطالعے کے بعد میں درج ذیل تبصرہ کرنا چاہوں گا۔

آپ نے پاکستان کے سینئر سکیورٹی اہل کاروں کے نام صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے مطابق القاعدۃ اور طالبان عسکری نقل و حمل کے لیے تامل ٹائیگرز کے ساتھ تعلقات قائم کر رہے ہیں۔ میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے اکثر سکیورٹی اہل کاروں کو ان جہادی دستوں کے بارے میں کوئی حقیقی ادراک نہیں ہے۔ نائن الیون کے بعد انہوں نے پاکستانی جہادی تنظیموں کے دنیا پر غلبے کے اسلام پسندانہ نظریے کو قوم پرستی میں تبدیل کر دیا ہے یعنی کشمیر کی آزادی تک محدود۔ مجاہدین کئی برسوں سے امریکا کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے اور پاکستانی ادارے وسعت، نقل و حمل اور ٹھکانوں کے اعتبار سے شاید دنیا کے سرفہرست ادارے تھے جو ان مجاہدین کو امریکی مفادات پر حملوں سے

روک سکتے تھے۔ ان جہادی دستوں کو افغانستان میں طالبان اور القاعدۃ سے جاملنے سے روکنا ایک بہت بڑا کام تھا۔ سرکاری اہل کار اس میں کسی حد تک کامیابی کا دعویٰ کرسکتے ہیں لیکن اس کا اصل سہرا سکیورٹی اور انٹیلی جنس اداروں کی بجائے ان تنظیموں کی بدعنوان قیادت کے سر ہے۔ اس لیے مجھے ان کے کسی دعوے پر اعتبار نہیں ہے۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کی بنیاد انٹرنیٹ پر بغاوت کی کوئی کہانی یا ماضی میں لازمی کورس میں اول درجہ حاصل کرنے کے لیے دی گئی کوئیpresentationہوتی ہے۔

بڑے بڑے سودوں کے ذمہ دار گروپ کے سربراہ دو تامل ٹائیگر تھے۔ ان سودوں میں روبی زون کیمیکلز یوکرائن سے دھماکہ خیز مواد کی ترسیل، ایل ایم جی کی ترسیل، روس سے بندوق کی گولیاں، اور تھائی لینڈ اور برما سے سام میزائیل کی ترسیل شامل ہیں۔ یہ لوگ پانامہ، ہنڈراس اور لائبیریا کے علاقوں سے جہاز چارٹر کرواتے تھے۔ انہوں نے ایک اسرائیلی اسلحہ ڈیلر کو رشوت دی اور اپنا مال جفنا میں پہنچایا۔ ان لوگوں نے جعلی خریداری دستاویزات بنوائیں اور کئی دفعہ تیسری دنیا کی فوجوں کو خریدار ظاہر کیا۔ لیکن یہ سب یادیں نائن الیون سے پہلے کی ہیں جب انسدادِ دہشت گردی کے امریکی محکمے سوئے ہوئے تھے۔

۲۰۰۱ کے بعد یہ خوشگوار وقت کیا ہوا؟ سرحد پار نقل و حرکت کیا ہوئی؟ میں مانتا ہوں کہ ان جہادی لوگوں کو شہر بہ شہر چیزیں لے جانے میں کن کن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں صرف عراقی القاعدۃ سرحد پار کام کرنے کے قابل تھی طالبان ایسا نہیں کرسکتے تھے۔

افغان مزاحمت میں اچانک شدت میرے خیال میں اس لیے ہوئی تھی کہ القاعدۃ نے عراق میں ایرانی وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی پالیسی بدل لی تھی۔ اگر ہم افغانستان میں حملوں کو تاریخ وار دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی حملے میں کہیں بھی کوئی جدید اسلحہ استعمال نہیں ہوا۔ تبدیلی صرف یہ ہوئی کہ طالبان نے خودکش حملوں کا طریقہ اختیار کر لیا۔ چینوک اور دوسرے ہیلی کاپٹر آر پی جی سے بھی گرائے جاسکتے ہیں۔

عراق سے القاعدۃ اور طالبان کو سام میزائل فراہم کرنے کا ایک ممکنہ راستہ ایران ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ سکیورٹی اہلکار ان تنظیموں سے مل جائیں اور یہ حقیقت القاعدۃ کو بہت بعد میں سمجھ آئی۔ تامل ٹائیگرز تو خود جدید اسلحے کی تلاش میں ہیں کیونکہ نائن الیون کے بعد ان کو مختلف ممالک میں بلیک لسٹ کر دیا گیا ہے۔

القاعدۃ اور طالبان کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ لوگوں کو مار سکتے ہیں، سنگسار کر سکتے ہیں لیکن ایک چیز کے بارے میں یہ لوگ بہت سخت ہیں، وہ ہے حشیش اور چرس کا کاروبار۔ میں نے ایک سال ان کے ساتھ گزارا اور دیکھا کہ جعلی کرنسی چھاپنا اور سمگلنگ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے لیکن جید عرب علماء کے تمام شرعی فتووں میں منشیات کا کاروبار سختی سے منع ہے۔

بہرحال، جناب اس ای میل کا واحد مقصد آپ کو صرف یہ بتانا ہے کہ میں آپ کے مضامین کا بہت مداح ہوں اور آپ کو اپنی رائے اور ذاتی تجربہ بتانا چاہتا تھا۔ میں Great Lakes کے علاقے میں ہوں اور چاول برآمد کرتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ یورپی، امریکی اور اسرائیلی کانگو کی

معدنیات، جس میں یورینیم بھی شامل ہے، دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک دلچسپ موضوع ہے۔

میں ۲۰۰۱ سے ۲۰۰۲ تک سیر الیون (مغربی افریقہ) میں بطور امن مشن کارکن بھی کام کر چکا ہوں۔ ایک بار ہم اس کے ہیروں سے بھرے مشرقی صوبے کونو میں داخل ہوئے تو پتا چلا کہ یہ صوبہ اس ملک اور دنیا کے قابو سے باہر ہے۔ ہم نے باغیوں سے ہتھیار واپس لیے، انتخابات کروائے، حکومت بنوائی اور آخر کار ہیروں سے بھرے اس ملک کو دوبارہ انگلستان کی گود میں دے دیا۔ یہ دلچسپ داستان بھی آپ کی توجہ چاہتی ہے۔

شکریہ، اللہ کرے آپ کا زورِ قلم اور زیادہ

خرم

ڈی۔ آر۔ کانگو

کیپٹن خرم کشمیر کے ایک سلفی گھرانے سے تھے۔ آپ کی کہانی سے پتا چلتا ہے کہ کس طرح القاعدۃ اور اسلامی نظریات کے تال میل نے پاکستانی فوج کے درمیانے درجے کے افسروں کو حقیقی بھائی بننے اور جنوبی ایشیا کے میدان جنگ میں کامیاب عسکری چالیں چلنے پر مائل کیا۔ خرم ہر لحاظ سے ایک عملی مسلمان تھے۔ وہ مذہبی نقطۂ نظر اور حالیہ قومی مسائل پر اپنی سیاسی وابستگی بڑی وضاحت و صراحت سے بیان کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنے ایس ایس جی ساتھیوں میں بہت مقبول تھے۔ جب ۲۰۰۱ اور ۲۰۰۲ میں اسے اقوام متحدہ کے امن مشن کے رکن کے طور پر سیر الیون میں کام کرنے کا موقع ملا تو وہ مقامی مسلمانوں کے خلفشار سے بہت پریشان ہوئے۔ ان کے نام مسلمانوں جیسے تھے لیکن انہیں عقائد اور فرائض کا کچھ

پتا نہیں تھا۔ خرم نے سیر الیون میں اپنے کمانڈر شجاع پاشا کی مخالفت کے باوجود ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا۔

افغانستان پر امریکی چڑھائی کے بعد طالبان کے بارے میں پاکستان کی پالیسی بالکل الٹ ہو گئی جس سے مسلح افواج کی درمیانی صفوں کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مگر دوسرے ساتھیوں کے برعکس، جو اس پالیسی کے خاموش ناقد تھے، خرم اور اس کے بھائی میجر ہارون نے عملی طور پر کچھ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب پاکستان نے وار آن ٹیرر میں امریکی اتحاد کا فیصلہ کیا تو قابل افسر میجر ہارون نے ۲۰۰۱ میں فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ سیر الیون سے واپسی پر خرم نے بھی ۲۰۰۳ میں آرمی چھوڑ دی۔ دونوں لشکرِ طیبہ میں شامل ہو گئے لیکن انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ لشکرِ طیبہ محض مسلح افواج کی عوامی شاخ ہے۔

نائن الیون کے واقعات کے بعد افغانستان کے بارے میں لشکرِ طیبہ کی پالیسیاں بدل گئیں۔ لشکرِ طیبہ نے اپنے لوگوں کو طالبان اور القاعدۃ سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ ہارون اور خرم صرف قابل فوجی افسر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے فکر مند بھی تھے۔ اس لیے یہ بات نزاع کا باعث بنی۔ ہارون کی سوچ سلفی مکتبۂ فکر سے تھی اور یہ سوچ ان کے مطالعے کی عادت کی وجہ سے تھی۔ آپ نے علمائے سلف امام ابنِ تیمیہؒ، ابن خلدونؒ اور محمد بن عبد الوہاب کی تصنیفات کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ جدید دور کے علماء میں سے آپ نے سید قطب اور سید مودودی کا مطالعہ کیا۔ مزید برآں، آپ نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی عسکری رسالوں اور انٹرنیٹ پر عسکری حکمتِ عملیوں کے بارے میں پڑھنا جاری رکھا۔ ہارون نے پاکستان آرمی پر اپنی تنقید کبھی خفیہ نہیں رکھی۔ آپ پاکستان کی مسلح افواج کے سخت ناقد تھے۔ آپ اکثر اپنے پرانے فوجی ساتھیوں سے ملاقاتیں کرتے اور ان کے کمزور اسلامی عقاید پر طنز کرتے۔ آپ پاکستان کی مسلح افواج کو برطانوی نو آبادیاتی نظام کا تسلسل سمجھتے تھے اور اپنے

دوستوں کو فوج کی خدمات سرانجام دینے پر بھی ان کا مذاق اڑاتے۔ آپ اکثر مثال دیتے کہ برطانوی فوجوں سے لڑنے والے فقیر ایپیؒ اور حاجی صاحب ترگزئی کو قبائلی باغی کہہ کر ان سے جنگ کی گئی جس پر فرنٹیر کور اب بھی ناز کرتی ہے۔ ہارون نے اپنے ساتھیوں کو فوج چھوڑنے پر اکسایا کیونکہ یہ خالصتاً کرائے کے قاتلوں کا گروہ تھا۔ آپ نے انہیں مشورہ دیا کہ روزی کمانے کا کوئی اور ذریعہ تلاش کریں۔ آپ کے بہت سے دوستوں نے اس نصیحت پر عمل کیا اور فوجی ملازمت چھوڑ دی۔ اسی دوران ہارون کو ایک نیا دوست کمانڈر الیاس کشمیری ملا۔ الیاس کشمیری ایک تجربہ کار جنگجو تھے جنہیں پاکستان فوج نے بار بار ڈرایا دھمکایا تھا۔ انہوں نے کشمیری جدوجہد سے رشتہ ختم کیا اور اپنے خاندان کے ساتھ وزیرستان منتقل ہو گئے۔

میجر عبدالرحمان بھی آرمی افسر تھے جنہوں نے فوج سے استعفیٰ دیا اور میجر ہارون کے ساتھ مل گئے۔ اس وقت ان کا اولین مقصد یہ تھا کہ افغانستان جا کر نیٹو کے خلاف لڑا جائے۔ پھر خرم اور عبدالرحمان افغان صوبے ہلمند میں گئے اور برطانوی فوج کے خلاف مصروفِ پیکار رہے۔ خرم ۲۰۰۷ کی ہلمند کی لڑائی میں شہید ہو گئے۔ عبدالرحمان زندہ لیکن تنہا واپس آئے۔ خرم کی شہادت نے میجر ہارون (کیپٹن خرم کا بھائی) اور میجر عبدالرحمان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ہارون بڑی سنجیدگی سے افغانستان میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے اپنے بھائی کی شہادت کے بعد اپنی زندگی نیٹو کے خلاف جنگ کے لیے وقف کر دی۔ ۲۰۰۶ تک الیاس کشمیری القاعدۃ کی شوریٰ کا رکن بن چکے تھے اور ان کی ۳۱۳ بریگیڈ القاعدۃ میں ضم ہو چکی تھی۔ جلد ہی ہارون نے اپنی کاروباری مصروفیات گھٹا دیں اور افغانستان میں نیٹو کے خلاف گوریلا کارروائیوں میں حصہ لینے کے لیے شمالی اور جنوبی وزیرستان کے چکر لگانے لگے۔

ہارون ۱۹۹۹ کی کارگل جنگ میں حصہ لے چکے تھے اور اکثر پاکستانی افسروں کی بزدلی کے قصے سنایا کرتے۔ آپ اس بات کے قائل تھے کہ پاکستانی فوج کوئی بڑی جنگ لڑنے کی اہل نہیں ہے۔ طالبان اور القاعدۃ نے آپ کی فکر میں جو الا کھی کیفیت پیدا کر دی۔ اب ان کے اندر ایک مشن رکھنے والا فوجی بیدار ہو چکا تھا۔ آپ سخت جسمانی تربیت سے گزرے اور اپنے آپ کو سپر فٹ (Super fit) بنایا۔ آپ کے القاعدۃ سے تعلقات گہرے ہوتے گئے اور آپ اس کے اندرونی حلقوں کا حصہ بن گئے۔ القاعدۃ کے نظریات اور آپ کی پیشہ ورانہ تربیت کی صلاحیتوں کے ملاپ سے آپ جنوبی ایشیا کے میدانِ کارزار پر چھانے لگے۔

ہارون نے افغان میدانِ جنگ کو ایک نئے تناظر سے دیکھا۔ ہزاروں طالبان مرنے مارنے کے لیے تیار کھڑے تھے لیکن ان کی فرسودہ گوریلا کارروائیاں ان کے عروج کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔ طالبان نے ۲۰۰۶ میں کامیاب واپسی کی لیکن ان کی شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ ۲۰۰۶ میں (سرکاری اعدادوشمار کے مطابق) تقریباً دو ہزار طالبان مارے گئے جبکہ نیٹو کی اموات دو سو سے بھی کم تھیں۔ ہارون سمجھ گئے کہ اگر طالبان اپنے پرانے جنگی حربوں سے چمٹے رہے تو امریکی فضائی قوت اور فوجی طاقت ۲۰۰۸ تک ان کا صفایا کر دے گی۔ اب نئے گوریلا حربوں کو سیکھنے کی ضرورت تھی اور جنگجوؤں کو نئے عسکری نظریات سمجھانا ضروری تھا۔

ہارون نے محسوس کیا کہ عرب گوریلے طالبان سے زیادہ جنگی فہم رکھتے ہیں لیکن ان کے خیالات محدود ہیں۔ ان کے پاس ایسی صلاحیت نہیں تھی کہ جنگی حکمتِ عملی سے طالبان کی مدد کر سکتے۔ عبدالرحمان اور ہارون نے مل کر اس پر کام شروع کر دیا۔ آپ کتب خانوں میں گئے اور ویت نام میں امریکا کے خلاف کامیاب گوریلا جنگوں کا مطالعہ کیا۔ گہرے مطالعے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ جدید ہتھیاروں اور بہتر عسکری چالوں کے بغیر افغان

جنگ میں کامیابی ممکن نہیں ۔ پھر ہارون شمالی وزیرستان چلے گئے اور القاعدۃ کے پرانے کمانڈروں کو اپنے خیالات پیش کیے۔ آپ نے بغاوت کے دو ماڈل پیش کیے۔ پہلا ماڈل امریکہ کے خلاف ویت نام کی گوریلا جنگ کا تھا اور دوسرا ماڈل سری لنکا کے خلاف تامل ٹائیگرز کا تھا۔

آپ نے خیال پیش کیا کہ افغان صوبہ خوست، پکتیا اور پکتیکا میں اسی طرح سے سہ شاخہ جارحانہ عسکری چال سے آغاز کیا جائے جس طرح جنرل گیاپ نے شمالی ویتنام میں ۱۹۶۰ کی دہائی میں امریکا کو شکست دینے کے لیے کیا تھا۔ آپ کی تجویز تھی کہ پہلے مرحلے میں ان تینوں صوبوں میں نیٹو کے خلاف مسلح جدوجہد کی جائے۔ دوسرے مرحلے میں سکیورٹی چیک پوسٹوں اور فوجی اہلکاروں کو ہدف بنایا جائے۔ جنگجو چوبیس سے اڑتالیس گھنٹوں تک ان چیک پوسٹوں پر قبضہ جمائے رکھنے کے بعد غائب ہو جائیں۔ تیسرے مرحلے میں یہ جنگ شہری علاقوں اور وفاقی دارلحکومت تک پھیلا دی جائے۔

ہارون نے زور دیا کہ جنرل گیاپ کی حکمتِ عملی میں اہم چیز یہ تھی کہ دشمن کو اچانک دبوچا جائے۔ آپ نے منتخب جنگجوؤں کو خصوصی کارروائیوں کی تربیت دینے پر خاص زور دیا۔ ان لوگوں نے اندر سے حاصل کردہ جدید ہتھیار استعمال کرنا تھے۔ عرب جنگجوؤں نے ہارون کے خیالات پر توجہ دی اور علاقائی کمانڈروں سراج الدین حقانی اور ملا نذیر سے تبادلہ خیال کیا۔ بعد میں یہ حکمتِ عملی قبائلی علاقوں میں پاکستان آرمی کے خلاف بھی کامیاب رہی۔ ہارون نے جدید طرز کی ایک ایسی گن بنائی جو صرف دنیا کی انتہائی جدید افواج کے پاس ہے۔ یہ گن اتنی چھوٹی تھی کہ درمیانے سائز کے سفری بیگ میں بآسانی چھپائی جا سکتی تھی۔ عام گن کی لمبائی کی وجہ سے اسے چھپانا مشکل ہوتا ہے لیکن اس خاص گن کی کم لمبائی کی بدولت اسے منتقل کرنا زیادہ آسان تھا۔ ہارون نے اے کے ۴۷ کے لیے ایک سائلنسر بھی بنایا جو کہ دنیا میں صرف چند لوگوں کے پاس ہے۔ یہ چیزیں القاعدۃ کی خصوصی گوریلا

کارروائیوں کالازمی جزو بن گئیں۔ پھر آپ نے نائٹ وژن گلاسز حاصل کرنے کے لیے چین کا سفر کیا۔ پاکستان میں انہیں کسٹمز سے کلیئر کروانا ایک مشکل کام تھا۔ ہارون نے مشرف کے سکیورٹی افسر کیپٹن فاروق کو فون کیا۔ فاروق سرکاری صدارتی (عملے کی) کار میں ایئر پورٹ گئے اور امیگریشن کاؤنٹر پر ہارون سے ملے۔ فاروق کی موجودگی میں کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ ہارون کے سامان کو ہاتھ بھی لگائے۔ اس طرح بنا کسی گڑبڑ کے نائٹ وژن گلاسز پاکستان پہنچ گئے۔ (فاروق حزب التحریر کے رکن تھے اور اس بات کی خبر انٹیلی جنس کو اس وقت ہوئی جب انہیں مشرف کا سکیورٹی افسر بنے نو ماہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد انہیں مختصر گرفتاری کے بعد فوج سے ریٹائر کر دیا گیا)۔

جدید ہتھیار حاصل کرنے کے بعد جنگجو خاص کارروائیوں کے لیے تیار تھے۔ ان کارروائیوں کے لیے تمام جنگجو وزیرستان سے آئے تھے۔ جنوری ۲۰۰۸ میں سرینا ہوٹل کابل پر حملہ، کابل میں اپریل ۲۰۰۸ میں فوجی پریڈ پر حملہ، مئی ۲۰۰۹ میں خوست میں بم دھماکے اور ستمبر ۲۰۰۹ میں کامدیش امریکی اڈے پر حملہ کامیاب گوریلا کارروائیوں کی چند مثالیں ہیں۔ زیادہ تر کارروائیوں میں طالبان نے افغان فوجیوں یا افغان پولیس اہلکاروں کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ تقریباً ہر کارروائی میں اندرونی مخبروں نے اہداف کے داخلی و خارجی راستوں کی معلومات فراہم کی تھیں۔ ہارون اور کشمیری دونوں نے خصوصی کارروائیوں کے لیے افراد کے مجمعے کو پسند نہیں کیا۔ انہوں نے ۳۱۳ بریگیڈ کے لیے بہترین اور نظریاتی جوان منتخب کیے۔ ان جوانوں کو خاص گوریلا تربیت دی گئی جس میں تیراکی، کراٹے، نشانہ بازی، گھات لگانا، دھماکہ خیز مواد اور آلات کی جان پہچان اور دشمن کی نقل و حرکت کی خبریں حاصل کرنے کے طریقے شامل تھے۔ ۳۱۳ بریگیڈ پر کشمیری کا سخت کنٹرول تھا۔ القاعدۃ کے

لشکرِ ظِل کا کام دوسرے گروپوں کے درمیان تطبیق کرنا تھا۔ اس وقت مجاہدین کے بہت سے گروپ لشکرِ ظِل میں شامل کیے گئے۔

ہارون نے طالبان کے جنگی نقطۂ نظر کو وسعت بخشی۔ پھر آپ نے مستقبل کی جنگی کارروائیوں کے بارے میں نہایت اہم تجزیے کشمیری اور القاعدۃ کے دوسرے رہنماؤں کے سامنے پیش کیے۔ ہارون نے کراچی بندرگاہ سے افغانستان جانے والی نیٹو کنٹینرز کی سپلائی لائن کاٹنے کا جامع منصوبہ پیش کیا۔ نیٹو کی ۸۰ فیصد سپلائی پاکستان کے قبائلی علاقوں سے ہو کر خیبر ایجنسی سے جاتی ہے اور باقی ۲۰ فیصد چمن قندھار کے راستے سے۔ ہارون نے جنوری ۲۰۰۸ میں پاکستان کے راستے سے جانے والی نیٹو سپلائی پر حملوں کا منصوبہ بنایا۔ خیبر ایجنسی اہم اور مرکزی جگہ تھی۔ افغان جنگ میں نیٹو کی تقریباً ساری سپلائی اسی راستے سے ہوتی تھی۔ اس منصوبے کی تکمیل لشکرِ ظِل کے ذمے تھی۔ طالبان رہنما استاد یاسر کو اس منصوبے کی سربراہی دی گئی۔ تحریکِ طالبان پاکستان کے سربراہ حکیم اللہ محسود کو تعاون کے لیے جنوبی وزیرستان سے بھیجا گیا۔ القاعدۃ جانتی تھی کہ لشکرِ ظِل کی کارروائیوں کو خیبر ایجنسی کے مقامی لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہاں بریلوی مکتبِ فکر کے لوگوں کی اکثریت ہے اور وہ طالبان مخالف اور تصوف پسند ہیں۔ دیوبندی مکتبِ فکر کے بھی لوگ تھے لیکن ان کے پاکستان آرمی اور مقامی قبائل سے اچھے تعلقات ہونے کی وجہ سے وہ امن و امان کی صورتحال بہتر رکھنا چاہتے تھے۔ ہارون نے تجویز دی کہ لشکرِ ظِل اور کرزئی ایجنسی میں اپنے ٹھکانے بنائے اور درہ آدم خیل مرکزی اڈا بنایا جائے۔ آپ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ طالبان کے نیٹو قافلوں پر حملوں میں مقامی قبائل کو غیر جانبدار رہنے پر مجبور کیا جائے۔ طالبان نے روزانہ اور کرزئی ایجنسی سے حملے کرنے شروع کر دیے۔ ۱۰-۲۰۰۹ میں بعض جگہوں پر جنگجو اپنے ذاتی ٹھکانے بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

نیٹو سپلائی پر حملے جاری رہے۔ ایک حملے میں جنگی سردار حاجی نمدار بھی مارا گیا۔ حاجی نمدار نے ابتدائی طور پر نیٹو سپلائی لائن پر حملوں میں معاونت کی تھی لیکن خیبر ایجنسی میں القاعدۃ اور طالبان کے خلاف پاکستان آرمی کی مدد کی تھی۔ دوسرا طاقتور سردار منگل باغ تھا جس نے اس سے سبق سیکھا اور غیر جانبدار رہا۔ طالبان حملوں نے ایسی شدت اختیار کی کہ پاکستان کو کئی بار سرحد بند کرنا پڑی۔ ہارون نے پھر ان حملوں کا دائرہ وسیع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ آپ کا یقین تھا کہ افغانستان میں نیٹو کی شکست میں ان حملوں کا کلیدی کردار ہے۔ آپ کئی دفعہ کراچی گئے اور وہاں نیٹو سپلائی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے فعال گروپ بنائے۔ ان ٹیموں نے جائزہ لیا کہ کس طرح نیٹو کا سامان مختلف ٹھیکیداروں تک پہنچتا ہے۔ ایک ایک تفصیل کا مطالعہ کیا گیا۔ کراچی میں کئی ٹھیکیدار اغوا کر لیے گئے اور باقیوں کو دھمکیاں دی گئیں کہ یا تو نیٹو سے ٹھیکہ منسوخ کر دیں یا نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ نیٹو کمانڈر ان نئی پیش رفتوں پر بہت حیران ہوئے۔ اس سے بھی زیادہ حیران وہ اس بات پر تھے کہ ۲۰۰۸ کے آخری مہینوں میں طالبان نے افغانستان میں حملے روک دیے تھے اور اپنی ساری طاقت نیٹو سپلائی تباہ کرنے پر لگا رہے تھے۔ کراچی میں زیادہ تر ٹھیکیدار اغوا کر لیے گئے اور باقی بھاگ گئے۔ پشاور ٹرمینل پر تقریباً ہر دوسرے دن طالبان اچانک نمودار ہوتے، نیٹو قافلوں پر راکٹ برساتے اور خیبر ایجنسی میں غائب ہو جاتے۔ تقریباً ۲۰ سے ۴۰ کنٹینر روزانہ جلائے جاتے یا لوٹ لیے جاتے۔

پاکستانی طالبان نے پاکستانی میڈیا کو ایک تصویر بھیجی جس میں دکھایا گیا تھا کہ اورکزئی ایجنسی میں طالبان امریکی ہموی گاڑی چلا رہے ہیں۔ اس سے مغربی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ بین الاقوامی اخبارات میں نیٹو کے جہازوں کی گمشدگی اور طالبان کے قبضے میں ہونے کی کہانیاں چھپنے پر مغرب مزید پریشان ہو گیا۔ نیٹو قیادت پریشان تھی کہ طالبان کو رہنمائی

کون دے رہا ہے۔ فوری شک پاکستانی فوجی قیادت پر ہوا لیکن اس کے کوئی ٹھوس شواہد نہیں تھے۔ مغربی انٹیلی جنس اداروں نے شمالی وزیرستان میں موجود تمام عرب کمانڈروں اور افغانستان میں طالبان کمانڈروں کی فائلوں کا مکمل جائزہ لیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا کہ اس نئی حکمتِ عملی کو کامیاب بنانے کی مطلوبہ قابلیت رکھتا ہو۔ ہلمند، غزنی، اور وردک کے صوبوں میں گھٹتی ہوئی سپلائی کی وجہ سے نیٹو گشت لگانے کے قابل نہ رہی۔

اپریل ۲۰۰۸ میں نیٹو نے روس سے معاہدہ کیا کہ اس کی سپلائی روس کے ذریعے افغانستان جائے گی۔ اسی طرح کا معاہدہ ایران اور امریکا کے مابین بھی ہوا کہ ایران غیر فوجی سامان کی ترسیل کے لیے چابہار بندرگاہ استعمال کرنے کی اجازت دے گا۔ لیکن ان راستوں میں سے کوئی بھی خیبر ایجنسی والے راستے کا نعم البدل نہیں تھا۔ ہارون نے روس اور نیٹو کے معاہدے کے بعد مجھے ای میل کی جس میں وکی پیڈیا کا حوالہ دیا گیا تھا۔ آپ نے ایک دوسری ای میل میں نقشہ بھی بھیجا:

> خشکی میں گھرا ملک، جس کے ارد گرد کے ملک بھی خشکی میں گھرے ہوئے ہیں، دہری خشکی میں گھرا ملک کہلا سکتا ہے۔ ایسے ملک میں موجود کسی بھی شخص کو ساحل تک پہنچنے کے لیے دو سرحدیں پار کرنا ہوں گی۔ دنیا میں اس وقت صرف دو ہی ملک ایسے ہیں:
>
> وسطی یورپ میں لیکٹنسٹائن (Liechtenstein)
>
> وسطی ایشیا میں ازبکستان
>
> ازبکستان کی سرحد چار ملکوں سے لگتی ہے؛ جنوب مغرب میں ترکمانستان، جنوب میں تاجکستان، مشرق میں کرغستان، اور شمال میں قزاقستان اور

بحر ارل۔ بحیرہ کیسپئین سے جہاز بحر ازوف تک بذریعہ وولگا کینال جاتے ہیں، وہاں سے بحر اسود اور دوسرے سمندروں تک جاتے ہیں۔

۱۸۷۱ میں جرمنی کے اتحاد کے بعد پہلی جنگ عظیم تک دنیا میں کوئی بھی ملک دہری خشکی میں گھرا ہوا نہیں تھا۔ ازبکستان پہلے روس کا حصہ تھا اور پھر سوویت یونین کا، جبکہ لیکٹنسٹائن کی سرحد آسٹریا سے لگتی تھی اور ۱۹۱۸ تک بحیرہ ایڈریاٹک کی بندرگاہ آسٹریا میں تھی۔

ڈاکٹر صاحب! اگر آپ اس کو رسد کے راستے کی نظر سے دیکھیں تو یہ ایک مذاق ہے۔ کیا آپ اس نکتے کی مزید وضاحت کرسکتے ہیں؟ اللہ حافظ

ہارون کا تجزیہ درست تھا۔ نیٹو نے شمالی افغانستان تک وسط ایشیائی رستوں سے پہنچنے کی کوشش کی لیکن دس یا پانچ فیصد سے زیادہ مال لے جانے کے قابل نہ تھی کیونکہ دہری خشکی میں گھرے خطے سے سامان لے جانا بہت مہنگا پڑتا تھا۔

میجر ہارون کا عروج وزوال

میجر ہارون نازاں تھے۔ وہ ایک جنرل کا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ ایسا عہدہ تھا جو وہ اپنی باقاعدۃ سروس میں شاید کبھی نہ حاصل کرسکتے۔ آپ نے شمالی وزیرستان سے ایک نان کسٹم پجارو جیپ بہت ہی سستے داموں یعنی سوا لاکھ میں خریدی اور شمالی وزیرستان سے کراچی سفر کرنے کے لیے استعمال کرنے لگے۔ جب رات ہوتی تو آپ فوجی میس میں ٹھہرتے۔ سابق فوجی افسر ہونے کی وجہ سے انہیں یہ سہولت حاصل تھی۔ آپ ہر وقت اپنا آرمی ریوالور اور گولیاں اپنے ساتھ رکھتے کہ کسی ناکے پر کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ لیکن اپنی بارعب شخصیت اور شستہ اردو انگریزی فوجی لہجے کی وجہ سے ایسی صورتحال کبھی پیدا ہی نہ ہوئی۔ اپنی شناخت چھپانے میں کامیاب ہونے کے بعد آپ نے اپنا نیٹ ورک پھیلانے اور اس کے ذریعے سے

القاعدۃ کا نیٹ ورک وسیع کرنے کی ٹھان لی۔ ہر ملاقات میں وہ نئے ساتھی بناتے۔ ان میں سے زیادہ تر لشکر طیبہ سے، چند ایک دوسرے جہادی گروپوں سے جبکہ زیادہ تر پاکستان آرمی سے تھے۔

پاکستان آرمی میں اپنے گہرے تعلقات کی وجہ سے ہارون ایک مؤثر انٹیلی جنس نیٹ ورک بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ۲۰۰۷ میں آپ کو پتا چلا کہ امریکا نے جنوبی ایشیا کی وار آن ٹیرر پر ایک نیا مؤقف اختیار کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسئلے کی اصل جڑ پاکستان میں ہے۔ امریکا دہشت گردی سے لڑنے کے لیے پاکستانی فوج کی شراکت نہیں بلکہ اس کے اندر اپنے آدمی شامل کرنا چاہتا تھا۔ ۲۰۰۸ میں امریکا نے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملے کرنے کے لیے پاکستان میں اڈے حاصل کیے۔ اسی سال امریکا نے اسلام آباد سے ۲۰ کلو میٹر دور تربیلا میں زمین خریدی اور اپنی اسلام آباد ایمبیسی کو وسیع کرنے کے لیے ایک کھرب ڈالر مختص کیے۔ امریکا کے جنگی ٹھیکیدار ۲۰۰۷ میں پاکستان میں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ایف سی اہلکاروں میں سے ایک گروپ چنا اور باغی مخالف فورس کے طور پر انہیں تربیت دی۔ پاکستانی آئی ایس آئی میں امریکی تربیت یافتہ افسروں پر مشتمل انسدادِ دہشت گردی سیل قائم کیا گیا۔ انہیں باقاعدہ وقفوں کے بعد امریکا جانا ہوتا تھا تاکہ امریکی انتظامیہ ان کا امتحان لے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے میں ان کے عزائم کا جائزہ لے۔ امریکی انتظامیہ نے پاکستان آرمی میں ہر سطح پر ذاتی تعلقات قائم کرنا شروع کر دیے تاکہ القاعدۃ کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کی بساط بچھائی جائے۔

ہارون کو ان سب باتوں کی خبر تھی۔ انہوں نے پاکستان آرمی میں بحران پیدا کرنے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ پاکستان آرمی امریکا سے تمام تعلقات ختم کر دے۔ اپنے مسلح فوجی ساتھیوں کا ضمیر جگانے کے لیے جو واحد راستہ

ہارون جانتے تھے وہ دہشت زدہ کر دینے والی کارروائیاں تھیں۔ آپ نے انسدادِ دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث سینئر آرمی افسروں کی ایک فہرست بنائی اور انہیں نشانِ عبرت بنانے کا منصوبہ بنایا تاکہ دوسرے سبق سیکھیں اور امریکی صفوں سے نکل آئیں۔ سب سے پہلے میجر جنرل فیصل علوی کا نام آیا۔ فیصل علوی نے انگوراڈا میں ۲/اکتوبر ۲۰۰۳ کو پاکستان آرمی کے ایس ایس جی کمانڈو آپریشن کی کمانڈ کی تھی۔ اس آپریشن میں پچیس سو کمانڈو اتارے گئے تھے جنہیں بارہ گن شپ ہیلی کاپٹروں کی فضائی مدد بھی حاصل تھی۔ مقامی لوگوں کے مطابق کچھ ہیلی کاپٹر سرحد پار امریکی اڈے مچد اد سے آئے تھے۔ عینی شاہدین کے مطابق ۳۱پاکستانی فوجی اور ۱۳غیر ملکی اور مقامی قبائلی مارے گئے۔ جنگجوؤں کی بڑی تعداد فرار ہوگئی۔ اس آپریشن میں القاعدۃ کے کئی اہم رہنما جن میں عبدالرحمان بھی شامل تھے، مارے گئے۔ بہت سے گرفتار ہوئے اور گوانتاناموبے پہنچا دیے گئے۔ یہ آپریشن القاعدۃ کے ذہنوں میں سلگ رہا تھا۔ اُس وقت پاکستان آرمی اور القاعدۃ میں کھلی دشمنی بھی نہیں تھی۔

برطانیہ میں پیدا ہونے والے فیصل علوی کا پتہ ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ صدر مشرف سے ذاتی اختلافات پیدا ہونے پر فیصل علوی کو جبری ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک نجی کمپنی ایڈٹون ٹیلی کمیونیکیشن لمٹیڈ کے سربراہ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ۱۹ نومبر ۲۰۰۸ کو جب وہ اپنے کام پر جا رہا تھا تو ہارون نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ پی ڈبلیو ڈی کالونی کے ایک رفتار توڑ (Speed Breaker) پر جنرل کی کار سست رفتار ہو گی اور وہاں پر آپ کے دو ساتھی جنرل کا راستہ روک لیں گے۔ ہر کام منصوبے کے مطابق ہوا۔ ہارون اپنی کار سے نکلے اور اپنے آرمی ریوالور سے علوی کو قتل کر دیا۔

اس قتل سے فوج کے ہر چھوٹے بڑے میں خوف پیدا ہو گیا۔ انٹیلی جنس پر واضح ہو گیا کہ سابق اور حاضر سروس دونوں طرح کے فوجی افسران ہدف بنائے جائیں گے مگر انٹیلی جنس نے چپ سادھ لی۔ ہارون کا منصوبہ صرف علوی کا قتل ہی نہیں تھا؛ آپ اسی طرح کے دوسرے اہداف پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ریٹائر آرمی افسر کا قتل خالصتاً انتقامی کارروائی نہیں تھی بلکہ حاضر سروس فوجیوں کو ایک پیغام تھا کہ ایک دن وہ بھی ریٹائر ہو کر اسی انجام تک پہنچ سکتے ہیں۔ تاہم محض فیصل علوی کے قاتل ہونے کے علاوہ بھی ہارون بہت کچھ تھے۔ وہ بڑی تیزی سے جہادی جنگجوؤں کو پہچان رہے تھے اور ان کا ذہن تبدیل کر رہے تھے کہ امریکا کے خلاف ایک باقاعدہ منظم جنگ لڑی جائے۔

میجر ہارون سے میری پہلی ملاقات ان کی رہائش گاہ پر ستمبر ۲۰۰۷ میں لاہور میں ہوئی۔ وضع قطع سے آپ واضح طور پر مذہبی انسان تھے۔ آپ کی لمبی داڑھی تھی اور شلوار قمیص کے ساتھ سر پر ٹوپی تھی۔ بعد میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو آپ ایک مختلف انسان تھے۔ آپ نے داڑھی تراش لی تھی، وزن کم کر لیا تھا اور مغربی لباس پہنا ہوا تھا۔ ایک بار وہ مجھ سے ملنے آواری ہوٹل آئے اور میرے کمرے میں نماز ادا کی۔ کمرے میں دیوار پر تصویریں تھیں اور آپ نے ایک کپڑے سے انہیں ڈھک دیا کہ اسلام میں تصاویر ممنوع ہیں
۔

ہارون پاکستان میں ہونے والی پیش رفتوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ آپ مسلح افواج کے تمام سابقہ رفقائے کار سے رابطے میں تھے۔ (سوائے ان کے جو جنگجوؤں کے خلاف کارروائیوں میں ملوث تھے)۔ ان میں ایک میجر جنرل بھی تھا جو پشاور میں گیریژن کمانڈر تھا۔ اس جنرل نے کئی بار ان کے بھائی خرم کی شہادت پر تعزیت کرنا چاہی لیکن ہارون نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس دوران آپ اپنے پرانے رفقائے کار سے بڑھتے ہوئے امریکی اثرو

رسوخ کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ انٹرنیٹ کے بہترین صارف اور کتابوں کے قاری ہونے کی وجہ سے آپ ریاستی طریقِ کار، اس کی خوبیاں اور خامیاں اور پالیسیاں اچھی طرح جانتے تھے۔ آپ نے ریاستی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے متبادل منصوبوں پر توجہ مرکوز کی۔ آپ کو احساس تھا کہ اگر امریکا اسی طرح کامیاب ہوتا رہا تو پاکستان آرمی آخر کار اس کے سامنے ہمیشہ کے لیے سجدہ ریز ہو جائے گی۔

امریکا، افغانستان میں انڈیا کو پہلے ہی پاکستان کے خلاف جوڑ توڑ کرنے کا کردار سونپ چکا تھا۔ ہارون جانتے تھے کہ امریکا پاکستان اور انڈیا میں موجود دشمنی کے عنصر سے فائدہ اٹھاکر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ ترغیب و تہدید کا ایسا کھیل تھا جس کا مقصد پاکستان آرمی کو عسکریت پسندوں کے خلاف جنگ میں پھنسانا تھا۔ ۲۰۰۷ سے آپ اپنے امیر الیاس کشمیری کے ساتھ مل کر جوابی حکمتِ عملی پر کام کرنے لگے۔ اس حکمتِ عملی کا اصل مدعا یہ تھا کہ میدانِ جنگ بھارت تک پھیلایا جائے۔ پہلے پہل ہارون نے انڈیا پر نائن الیون کی طرز کا حملہ کرنے کا سوچا کہ اس طرح یقینی طور پر انڈیا پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دے گا۔ ہارون کا اندازہ تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو پاکستان القاعدۃ اور طالبان کے خلاف صف آراء اپنے دستے واپس بلانے پر مجبور ہو جائے گا۔ آپ نے اس انڈیا آپریشن کی ذمہ داری اپنے شہید بھائی کیپٹن خرم کے قریبی دوست اور رفیقِ کار میجر عبد الرحمان کو سونپی۔ عبد الرحمان انڈیا کے معاملے میں چلتا پھرتا قاموس تھے۔ پھر ہارون نے ایک انڈیا سیل بنایا اور اس نیٹ ورک کو حتی الوسع پھیلانے پر کام شروع کر دیا۔

ہارون لشکرِ طیبہ چھوڑ چکے تھے لیکن اس کے کمانڈروں سے اب بھی رابطے میں تھے۔ آپ لشکرِ طیبہ کی کمزوریاں اور قوت اچھی طرح جانتے تھے۔ لشکرِ طیبہ کی اصل قوت

اس کے پاکستان آرمی سے تعلقات اور اس کے وسائل تھے۔ محدود نقطۂ نظر اس کی خامی تھی۔

ہارون ان تمام باتوں کا اظہار لشکرِ طیبہ کے کمانڈروں سے اکثر کرتے رہتے تھے۔ لشکرِ طیبہ کے کمانڈروں کو ہارون پر مکمل بھروسہ تھا کہ آپ سلفی تھے اور ایک ریٹائر فوجی افسر بھی۔ ہارون نے لشکرِ طیبہ کے منصوبے کی تعبیر کے لیے اپنے تعلقات استعمال کیے۔ آپ کو خبر تھی کہ ۲۰۰۷ کے آخر میں آئی ایس آئی نے مقبوضہ کشمیر میں ایک نئے آپریشن کا فیصلہ کیا تھا جس میں لشکرِ طیبہ کو استعمال کیا جانا تھا۔ فنڈز جاری ہو چکے تھے اور لشکرِ طیبہ کو آپریشن کرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ یہ ایک معمول کا آپریشن تھا۔ لائن آف کنٹرول پر باڑ لگنے کے بعد جنگجوؤں کا بھارت میں داخل ہونا مشکل ہو چکا تھا۔ لشکرِ طیبہ اپنے جنگجوؤں کو انڈیا میں داخل کرنے کے لیے ٹھٹہ کا صحرائی ساحل استعمال کرتی تھی۔ یہاں سے وہ کشمیر میں داخل ہوتے تھے۔

ہارون لشکرِ طیبہ کے کمانڈر ابو حمزہ سے ملے اور اسے کہا کہ انڈیا میں بے سود کارروائیوں پر اپنا وقت اور وسائل ضائع نہ کریں۔ پھر ہارون، انڈیا پر ماہر عبد الرحمان سے ملے اور اور انڈیا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کیں۔ رحمان کئی دفعہ انڈیا جا چکے تھے۔ ان کے پاس انڈیا کے تمام اہم اہداف کی تصاویر اور نقشے تھے۔ آپ نے ممبئی کے وہ علاقے منتخب کیے جہاں سفید فام غیر ملکی رہائش پذیر تھے یعنی نریمان ہاؤس اور تاج محل ہوٹل۔

ہارون نے ابو حمزہ کو بتایا کہ وہ پاکستانی کشتی پر سوار ہو کر سفر شروع کریں گے اور پھر ایک انڈین ٹرالر پکڑ کر ساحل پر پہنچیں گے۔ آپ نے ابو حمزہ کو بتایا کہ اگر وہ انڈیا پر ایک سخت حملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انڈیا مذاکرات کی میز پر کشمیر کے بارے میں مفید حل پیش کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ ابو حمزہ نے یہ منصوبہ لشکرِ طیبہ کے کمانڈر ان چیف ذکی

الرحمان لکھوی کو بھیج دیا جو آپریشن کے انتظامات کرنے کے لیے فوراً کراچی روانہ ہو گئے۔ لکھوی نے اس آپریشن کی تیاری میں دو ماہ صرف کیے۔ انہوں نے دن رات ایک کر کے اس مشن کے اہل جنگجوؤں کا انتخاب کیا اور انہیں تربیت دی۔ جب منتخب جنگجو ہارون کے منصوبے کے عین مطابق تربیت پا گئے تو اس آپریشن کا آغاز کر دیا گیا۔ ہارون نے ابو حمزہ کے لیے بالواسطہ پیغام رسانی کا ایک جدید طریقہ وضع کیا اور سرحد پار جانے والوں کے لیے ہدایات جاری کیں جو کہ پاکستان سے باہر سے پہنچائی گئیں۔ ممبئ حملوں نے ساری دنیا کو چونکا دیا۔ یہ واقعہ انڈیا کے علاقائی سپر پاور ہونے کا امتحان تھا۔ حملہ آوروں میں سے ایک اجمل قصاب زندہ پکڑ لیا گیا اور دورانِ تفتیش اس نے اپنے اسیر کنندگان کو تمام کہانی سنائی کہ کیسے، کہاں اور کب ان کی ٹریننگ ہوئی۔ تمام واقعات پاکستان سے جڑے تھے۔ انڈیا نے پاکستان کے خلاف ایک محدود جنگ کا سوچنا شروع کر دیا جس میں مظفر آباد میں لشکرِ طیبہ کے کیمپوں، مرید کے میں لشکرِ طیبہ کے ہیڈ کوارٹر اور لاہور میں اس کے ٹھکانوں پر فضائی حملے شامل تھے۔ یہ چوتھی پاک بھارت جنگ کی شروعات تھیں۔

۲۰۱۱ کے ممبئ حملوں سے القاعدۃ کا مقصد تھا کہ پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑ جائے۔ اس طرح جنگجوؤں اور فوج میں تمام دشمنی یکدم ختم ہو جاتی۔ پاکستانی جنگجوؤں کے رہنماؤں ملا فضل اللہ اور بیت اللہ محسود نے اعلان کر دیا کہ انڈیا پاکستان جنگ میں وہ پاکستانی فوج کے ہمراہ لڑیں گے۔ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل احمد شجاع پاشا نے ملکی اور غیر ملکی نمائندوں کو ایک بریفنگ دیتے ہوئے فضل اللہ اور بیت اللہ محسود کو پاکستان کے سٹریٹجک اثاثے قرار دیا۔ دوستی دشمنی کے محرکات تبدیل کرنے کے لیے زمین تیار تھی مگر واشنگٹن نے دخل اندازی کر دی۔ واشنگٹن نے انڈیا کو یقین دہانی کرائی کہ پاکستان ممبئ حملوں کی تحقیقات میں پورا تعاون کرے گا اور اس کی منصوبہ بندی کرنے والوں کو گرفتار کرے گا۔

اپنا منصوبہ ناکام ہوتے دیکھ کر ہارون نے رحمان کو ۳۱۳ بریگیڈ سے کام لینے کی ہدایت دی۔ پاکستان پر امریکی دباؤ کی وجہ سے لشکرِ طیبہ کا نیٹ ورک محاصرے میں تھا اس لیے اس کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں رہی تھی۔ رحمان نے بار بار انڈیا کا سفر کیا اور حساس مقامات سے متعلق معلومات اور تصاویر حاصل کیں۔ ان میں ممبئی اور حیدر آباد میں انڈیا نیو کلیئر ریسرچ لیبارٹریز بھی شامل تھیں۔ رحمان نے انڈین نیشنل ڈیفنس کالج، انڈین پارلیمنٹ اور دہلی کے اہم دفاتر کی بھی تصاویر حاصل کیں۔ رحمان ہمیشہ مختلف اہداف پر حملوں کے کئی منصوبے تیار کیا کرتے۔ اس صورتحال میں جنگجو اگر انڈین ڈیفنس کالج کو نشانہ بنانے میں ناکام رہتے تو انہیں پارلیمنٹ پر حملہ کرنا تھا۔

جولائی ۲۰۰۹ میں آئی ایس آئی نے ۳۱۳ بریگیڈ کے ایک جنگجو زاہد اقبال کو اسلام آباد سے گرفتار کیا اور اس کی نشاندہی پر عبد الرحمان بھی گرفتار کر لیے گئے۔ لیکن چونکہ عبد الرحمان پاکستان میں کسی کارروائی میں ملوث نہیں تھے اس لیے رہا کر دیے گئے اور آپ نے انڈیا میں اس کارروائی کے لیے ۳۱۳ بریگیڈ استعمال کرنے کے منصوبے پر پھر سے کام شروع کر دیا۔ تاہم آئی ایس آئی کو خبر ہو گئی اور کارروائی سے پیشتر ہی عبد الرحمان اور پوری ٹیم دھر لی گئی۔ اکتوبر ۲۰۰۹ میں ایف بی آئی نے شکاگو میں ایک سازش کا سراغ لگایا۔ دو مشتبہ افراد ڈیوڈ ہیڈلے (پاکستانی نژاد امریکی شہری داؤد سید) اور تہور رانا گرفتار ہوئے۔ ان کی تفتیش کرنے سے پتہ چلا کہ وہ انڈین ڈیفنس کالج اور انڈیا کے نیوکلیئر اثاثوں پر حملوں کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے توہین آمیز خاکے شائع کرنے والا ڈینش اخبار بھی ہٹ لسٹ پر تھا۔۔ ان دونوں کا تعلق کشمیری گروپ سے تھا۔ ان کے بیانِ حلفی سے میجر ہارون اور ساتھی عبد الرحمان کے کردار بے نقاب ہو گئے۔ ہیڈلے کا رابطہ عبد الرحمان اور

ہارون سے تھا۔ جب نو اکتوبر ۲۰۰۹ کو میں نے الیاس کشمیری کا انٹرویو کیا تو وہ انڈیا کو ممبئی حملوں سے بھی بڑا دھچکا لگانے کے لیے پر امید تھے۔

گرفتاری

عبد الرحمان کی گرفتاری سے پہلے ہارون اپنے آرمی اور لشکر طیبہ کے دوستوں کے پاس گئے۔ آپ نے انہیں افغانستان میں نیٹو کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ آپ انہیں اپنے ساتھ قبائلی علاقوں میں لے کر گئے اور انہیں جدید گوریلا جنگ کی تربیت دی۔ چند ہی سالوں میں ۳۱۳ بریگیڈ اپنی مہارت اور وسائل کی وجہ سے جہادی حلقوں میں بہت مکرّم ہو گئی۔ تاہم نئے نئے مشن سامنے آئے تو وسائل کم پڑ گئے۔

جنگ میں جتنا بھی پیسہ ہو کم ہوتا ہے اور ہارون کو اس وقت ایسی صورتحال کا سامنا تھا کہ ہوٹل کے بل ادا کرنا تو در کنار، ان کے پاس کار میں پٹرول ڈلوانے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ اپنا سفر جاری رکھنے کی خاطر آپ نے اپنی کرولا گاڑی بیچ دی اور سادہ طرز رہن سہن اپنا لیا۔ آپ نے درہ آدم خیل میں اے کے ۴۷ کے سائلنسر بھی بیچ ڈالے لیکن پھر بھی بقدرِ کفایت پیسے نہ ہوئے۔ مالی حالات نے ہارون اور کشمیری کو ایک نئی ترکیب سجھائی۔ یہ اغوا برائے تاوان کا منصوبہ تھا۔ تاہم انہیں صرف غیر مسلم ہی اغوا کرنا تھے۔ ہارون کراچی گئے اور اپنے پرانے فوجی دوست ریٹائرڈ میجر عبد الباسط سے رابطہ کیا۔ باسط سے ہارون صرف یہی مدد چاہتے تھے کہ وہ مشہور فلم پروڈیوسر ستیش آنند کی جاسوسی کریں۔ ستیش ایک ہندو ہے اور مشہور انڈین اداکار جوہی چاولہ کا انکل اور مشہور فلم ڈسٹری بیوٹر جگدیش آنند کا بیٹا ہے۔ باسط سے حاصل کردہ معلومات پر ہارون کراچی گئے اور ستیش آنند کو تاوان کے لیے اغوا کر لیا۔ آپ کا خیال یہی تھا کہ اس کا خاندان کافی امیر ہے۔ آپ ستیش کو شمالی وزیرستان لے گئے مگر معلوم ہوا کہ اس کی دولت کے بارے میں سارے اندازے غلط تھے۔ ستیش کے پاس نقد

رقم نہیں تھی۔ اس کی جائیداد تھی لیکن حراست میں ہونے کی وجہ سے وہ اسے فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ ستیش سے کہا گیا کہ اپنے خاندان سے رابطہ کر کے تاوان کی رقم جمع کرے لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

پھر اغواکاروں نے ستیش کو ایک پیش کش کی کہ وہ اسلام قبول کر لے تو اسے رہا کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کو قتل نہیں کرتے۔ ستیش نے اسلام قبول کر لیا اور جنگجوؤں پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا وعدہ کیا۔ یہ بات ابھی تک راز ہے کہ آیا ستیش کی رہائی کے لیے کوئی رقم ادا کی گئی تھی یا نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ستیش بحفاظت کراچی واپس چلا گیا اور اغواکاروں کے خلاف مقدمہ درج کرانے سے انکار کر دیا۔ اس نے ان کی شناخت بارے بھی کچھ نہیں کہا۔ آخر کار فروری ۲۰۰۹ میں ہارون کو اسلام آباد سے گرفتار کر لیا گیا جب آپ ایک قادیانی سرور خان کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر آپ پر فیصل علوی کے قتل سمیت کئی مقدمات درج کر دیے گئے۔

ہارون اور ان کے بھائی خرم سرکردہ فوجی رہنماؤں کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی فوجی قیادت، جو ان کی پیشہ ورانہ مہارتوں سے واقف تھی، انہیں بہت یاد کرے گی جس طرح سعودی اسٹیبلشمنٹ اسامہ بن لادن کو یاد کرتی ہے۔ یہ داستان ان اسلام پسندوں کی ہے جو حالات کے تھپیڑوں سے ایک الگ راستے پر چل نکلے اور پھر ایک نظریے کی آغوش میں آ گئے۔ وہ مسلمان حکومتیں جو سرد جنگ کے بعد ایک نئی عالمی حکومت کے لیے امریکی عزائم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکی ہیں ان کے لیے ایسے لوگ اگر بے کار نہیں تو الٹے اثر والے ضرور ہو جاتے ہیں۔

ہارون کی گرفتاری کے ایک ہفتہ بعد ۱۳ مارچ ۲۰۰۹ کو لاہور میں تقریباً دس بندوق برداروں نے سری لنکن کرکٹ ٹیم پر اس وقت حملہ کیا جب وہ میچ کھیلنے کے لیے سٹیڈیم جا

رہی تھی۔ حملے کے انداز سے پتا چلتا ہے کہ حملہ آور کرکٹروں کو قتل کرنے کا ارادہ لے کر نہیں آئے تھے کیونکہ انہوں نے ساتھ چلنے والی پولیس کی گاڑیوں پر ہی گولیاں برسائیں۔ جب پولیس والے بھاگ گئے تو بندوقچیوں نے بس اغوا کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بس ڈرائیور نے ناکام بنادی؛ اس نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھے اور بس کو محفوظ مقام پر لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس ناکام ہائی جیک میں حفاظتی پولیس کے چھے اہلکار مارے گئے، سات کرکٹر اور اسسٹنٹ کوچ زخمی ہوئے۔ راکٹ لانچر اور گرنیڈ موقع واردات پر ہی پھینک دیے گئے۔ سرکاری اداروں کے مطابق یہ حملہ ممبئی کے خوفناک حملوں سے ملتا جلتا تھا۔ آئی ایس آئی کا دعویٰ تھا کہ یہ حملہ ہارون کے تربیت یافتہ جنگجوؤں نے کیا ہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ کرکٹروں کو یرغمال بنا کر اسیر کمانڈر (ہارون) کو تبادلے میں رہا کروالیا جائے۔

میجر ہارون کا نظریاتی سفر

سارے مغربی سٹریٹجک ماہرین حیران تھے کہ طالبان کی عام ملیشیا، جو تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی، کس طرح چند ہی سالوں میں دوبارہ بحال ہو گئی اور مؤثر گوریلا کارروائیاں کرنا بھی سیکھ گئی۔ یہ ماہرین حیران تھے کہ جو گوریلا مہارتیں ۲۰۰۵ تک کہیں نظر نہیں آرہی تھیں اچانک کہاں سے آگئیں۔ نیٹو یہ بات سمجھنے میں ناکام ہوگئی کہ اس تبدیلی کے پیچھے کوئی ماہر حربیات تھا۔ یہ حربی ماہر ہارون تھا جو پاکستان کے قبائلی علاقوں اور کراچی کے درمیان مخفی طور پر چکر لگا رہا تھا۔ عسکری کارروائیوں اور حکمتِ عملی کے اعتبار سے اب القاعدۃ کے حلقوں میں ہارون کی وہی تکریم ورفعت ہے جو ابو حفص شہید کی ہے۔

کراچی میں سی ویو پر میری رہائش گاہ کے قریب بحیرۂ عرب کے ریتلے ساحل پر چلتے ہوئے میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے جنوبی ایشیا میں جنگ کے اندرونی محرکات تبدیل کرکے رکھ دیے ہیں۔ الظواہری کی طرح ہارون کی ساری زندگی ایک

تحریک تھی۔ ان کے ذہن کی تار تار اس سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ نیٹو کی شکست کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ کراچی کے کلفٹن ساحل پر چلتے ہوئے انہوں نے کبھی خوبصورت لہروں اور نسیم بحری پر تبصرہ کیا نہ اس سے لطف اندوز ہوتے نظر آئے۔ ان کی نگاہیں آئل ٹرمینل پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کراچی بندرگاہ کے ذریعے خشکی میں گھرے افغانستان میں پہنچنے والے نیٹو کے سامان کو روکنے کی حکمتِ عملی پر غور کر رہے تھے۔ جب میں کراچی میں رہائش پذیر تھا تو ہارون ہر ملاقات میں میرے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آپ نے کہا:

ڈاکٹر صاحب! خراسان کی فتح قریب ہے۔ مجھے یقین ہے اگر مجاہدین ۲۰۰۸ تک نیٹو کی سپلائی لائن کاٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ۲۰۰۹ تک نیٹو انخلا پر مجبور ہو جائے گی۔ اور اگر سپلائی لائن ۲۰۱۰ میں کاٹی جاتی ہے تو نیٹو ۲۰۱۱ تک افغانستان چھوڑ جائے گی۔ اس جنگ میں یہ حکمتِ عملی مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ وسط ایشیا کے ذریعے متبادل سپلائی راستے کا جو دعویٰ نیٹو کر رہی ہے وہ ایک مذاق ہے۔ یہ اس قدر طویل اور پیچیدہ ہے کہ سارے یورپ اور امریکا کی معیشت مالیاتی بوجھ تلے دم توڑ دے گی۔ دوسرا واحد راستہ ایران کے ذریعے نیٹو کے سامان کی سپلائی ہے لیکن اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قدیم فارسی سلطنت اور رومی سلطنت کے تعلقات ہمیشہ ناساز گار رہے۔ اسی طرح اس جنگ میں بھی اگرچہ ایران نے طالبان کے خلاف افغانستان پر امریکی حملے میں سہولت فراہم کی ہے لیکن اس کے باوجود بھی ایران امریکا اور نیٹو کو شکست دینے کا

ارادہ رکھتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ ایران اپنے علاقے سے نیٹو کو مستقل راستہ فراہم کرے گا۔

ہارون اس جنگ کا عروج ۲۰۱۲ میں دیکھ رہے تھے:

اس وقت مہدی علیہ السلام ظہور کریں گے۔ مسلمان علماء کی تمام پیش گوئیوں اور اندازوں کے مطابق آپ پیدا ہو چکے ہیں۔ ۲۰۱۲ تک آپ مسلمانوں کی قیادت کے لیے ظہور فرمائیں گے اور مشرقِ وسطیٰ میں دجالی مغربی قوتوں کو شکست دیں گے۔

میں شام کے وقت ہارون کے ساتھ گھنٹوں ساحل پر چلا کرتا اور مختلف حوالوں سے القاعدۃ کا تناظر سمجھنے کی کوشش کرتا۔ میرے لیے یہ دہرا مخمصہ تھا کہ ایک طرف تو مغرب افغانستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستانی آرمی کی وفاداری پر شک کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ آرمی اور طالبان شیر و شکر ہیں جبکہ طالبان مسلسل مسلح افواج پر حملے کر رہے ہیں کہ ان کی وفاداریاں مغرب کے ساتھ ہیں۔ اس معاملے میں ہارون سے تسلی بخش معلومات ملتی تھیں۔ آپ نہ صرف پاکستان کے سابقہ فوجی افسر تھے بلکہ کئی اہم کمانڈروں کے ماتحت کام کر چکے تھے جن میں جنرل طارق مجید بھی شامل ہیں۔ ہارون کہتے:

پاکستانی فوج کی افغان طالبان کی حمایت خالصتاً ایک چال ہے۔ اس کی کوئی نظریاتی بنیاد نہیں ہے۔ ریاستیں پڑوسی ملکوں میں بغاوتوں کو اس طرح کی مدد دیتی رہتی ہیں تاکہ خطے میں ان کا اثر ورسوخ بنا رہے۔ پاکستانی فوج لشکرِ طیبہ کی بھی حمایت کرتی ہے لیکن اسے صرف انڈیا کے خلاف پراکسی جنگ میں استعمال کرتی ہے۔ اسی طرح انڈیا بھی پاکستانی غداروں کی مدد کرتا ہے۔ اگر حالات بدلے تو فوج بھی اپنی پالیسی بدل لے گی۔ مثال کے طور پر آئی

ایس آئی نے کلکتہ میں سبوتاژ کرنے کے لیے لشکرِ طیبہ کو استعمال کیا۔ لشکرِ طیبہ کے لوگ ہمیشہ پکڑے جاتے۔ کچھ اپنی لمبی داڑھیوں سے، کچھ اپنی سلفی عادات سے اور کچھ اپنی گفتگو کی وجہ سے پکڑے جاتے۔ انہوں نے جب بھی کارروائی کی، پکڑے گئے۔ پاکستانی خفیہ ایجنسیاں پریشان تھیں کہ انڈیا میں آئی ایس آئی کی کارروائیاں ہمیشہ منظر عام پر آجاتی ہیں جبکہ انڈیا کی پاکستان میں کارروائیاں ہمیشہ مخفی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ انہیں بعد میں معلوم ہوئی۔ انڈیا میں کارروائی کرنے والے انڈین نہیں ہوتے تھے۔ انڈین انٹیلی جنس پاکستانیوں کو اجرت پر حاصل کرتی۔ پاکستان نے بھی ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کیا اور ۲۰۰۷ اور ۲۰۰۸ میں دہلی اور دوسری جگہوں پر بم دھماکے کروانے کے لیے انڈین انڈرورلڈ کو استعمال کیا۔ انڈین خفیہ ایجنسیاں پہلی دفعہ ان کارروائیوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہیں۔ اب پاکستان کو لشکر طیبہ کی ضرورت نہیں تھی یا اسے مزید استعمال کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا "اگر یہ بات ہے تو پاکستان مکمل طور پر لشکر طیبہ ختم کیوں نہیں کر دیتا؟" ہارون نے جواب دیا:

کئی وجوہات کی بنا پر انہیں اب بھی لشکر طیبہ کی ضرورت ہے۔ پہلی تو یہ کہ نائن الیون کے یوٹرن کے بعد پاکستان نے ایک ایک کر کے سارے اسلام پسند حلیف کھو دیے۔ لشکر طیبہ ان کی واحد حلیف ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ پاکستانی فوج معاشرتی اعتبار سے پنجابی ہے۔ اس کی ۶۰ فیصد سے زیادہ بھرتی پنجاب کے دیہی علاقوں سے ہوتی ہے۔ لشکر طیبہ اہل

حدیث جماعت ہے اور اس مکتبِ فکر میں خروج کی اجازت نہیں ہے۔
دوسرے لفظوں میں لشکر طیبہ اسٹیبلشمنٹ کی حامی ہے۔ پاکستان آرمی کو
اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

مختلف مسلمان معاشروں اور مقامی بغاوتوں کی ناکامیوں اور کامیابیوں کا تقابلی جائزہ ہارون کا دوسرا دل پسند موضوع تھا۔ جب ہم عرب بعثت پارٹی کے بانی میکائیل اخلاق کے فلسفے اور صدام حسین کے عملی و نظری اسلام پر گفتگو کر رہے تھے تو ہارون نے کہا کہ

ڈاکٹر صاحب، اسلام تمام انسانیت کے لیے عالمگیر پیغام ہے لیکن یہ مقامی
سوچ، ثقافت اور روایات کو نظر انداز نہیں کرتا۔

میں نے دلیل دی کہ

کیا یہ بات اسلام کی روح کے خلاف نہیں ہے کہ میکائیل اخلاق اور صدام
حسین کی طرح اس عظیم الشان مذہب کو عرب قومیت کے تنگ دائرے
میں قید کر دیا جائے؟

آپ نے جواب دیا:

ڈاکٹر صاحب اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اسلام ثقافتی اعتبار سے عرب
ہے لیکن اگر کوئی شخص عرب قومیت کی بنیاد پر اسلامی ریاست قائم کرنا
چاہے تو میرے خیال میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ عمر بن الخطاب
رضی اللہ عنہ کے دور میں ایسا ہو چکا ہے۔ آپ نے ایرانی سامراج کے
خلاف جنگ کے دوران میں بعض عراقی قبیلوں کی حمایت عرب قومیت کی
بنیاد پر حاصل کی تھی۔

”پھر اخوان المسلمون کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو عرب قوم پرستی اور بعث نظریے کی مذمت کرتی ہے؟“

ہارون کا جواب تھا کہ:

میں ان کے نقطۂ نظر سے زیادہ واقف نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جنگ میں اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے قوم پرستی کے نظریات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کئی دفعہ ہارون سے دریافت کیا کہ میں اس جنگ کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہوں جس میں ہزاروں غیر حربی بھی مارے جاتے ہیں۔ آپ کا جواب تھا کہ:

بڑے مقاصد بڑی قربانیاں مانگتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جنگ اور امن میں ہزار ہا بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں۔ حالتِ امن میں استبدادی نظام انہیں پیس کر رکھ دیتا ہے۔ زندگی صرف انہیں کے لیے ہے جو کسی ایک جانب سے فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ باقی لوگ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔

ہارون اب اڈیالہ جیل راولپنڈی میں قید ہیں۔ جس پولیس افسر نے ان سے تفتیش کی اور مجھ سے تبادلہ خیال کیا، اس نے اعتراف کیا کہ وہ آپ سے متاثر ہو چکا ہے۔ وہ اس بات پر حیران ہے کہ ہارون جیسا آدمی اغوا برائے تاوان جیسے جرم میں کیسے گرفتار ہو گیا۔ وہ اکثر ہارون کی باتیں دہراتا ہے اور اس بات پر فخر کا اظہار کرتا ہے کہ اسے زندگی میں اس جیسے انقلابی سے ملنے کا موقع ملا۔ وہ حیران ہے کہ ہارون کی داستانِ حیات کا اتنا چرچا کیوں نہیں؟

ہارون اپنے تفتیشی افسروں کو افغانستان میں نیٹو کی شکست کی ضرورت پر اپنے خیالات پیش کرتا رہتا ہے۔ بعض اوقات جیل کی تنہائی اور خلوت انہیں آزردہ کر دیتی ہے

لیکن ان کا ایمان انہیں اس دنیا میں واپس لے آتا ہے اور وہ ایک اور دن جی لیتے ہیں۔ آپ کی کہانی الف لیلۃ کی ایک ایسی داستان ہے جو زمانہ آخر کی جنگوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ وزیرستان میں آپ کے ساتھی آپ کی واپسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ آپ کے خیالات اور آپ کی موجودگی انہیں فتح مندی سے قریب لے جائے گی۔

طالبان کی صفوں میں نئے طالبان

نئے طالبان کی کہانی نائن الیون کے بعد پاکستان کے قبائلی علاقوں میں خفیہ تنظیموں کی صورت میں شروع ہوئی۔ پھر یہ کہانی پاکستانی شہروں میں پھیلی اور ہارون اور کشمیری جیسے لوگوں کو مسحور کر کے طالبان کی تنظیم نو شدہ صفوں میں لے آئی۔ یہاں سے پھر یہ افغانستان پہنچی جہاں القاعدۃ کے مرکزی میدان جنگ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کا بحر متلاطم ۲۰۱۱ تک افغانستان سے انخلا کے لیے تیار تھا۔ یہ اقدام اس وقت کیا گیا جب طالبان ہر محاذ پر جیت رہے تھے۔ ہر گزرتا دن ان کی فتح کا نیا باب رقم کرتا۔ مغربی تھنک ٹینکس کے مطابق تقریباً ۸۰ فیصد افغانستان طالبان کے زیرِ عمل ہے۔ تاہم تجزیہ نگار اب بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ مزید فوجی دستوں اور ڈرون حملوں اور سپیشل آپریشن کی وجہ سے طالبان القاعدۃ اور اس کے حلیفوں کو چھوڑ کر مذاکرات کا عمل شروع کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

القاعدۃ کی اگلی حکمتِ عملی جنگ میں امریکی چالوں کا توڑ کرنا تھا۔ القاعدۃ نے حقیقت کا اندازہ اسی وقت لگا لیا تھا جب امریکا نے مزید فوجی دستے بھیجنے کا اعلان کیا تھا۔ اس نے طالبان کو مذاکرات کی میز پر جانے سے روکنے کے لیے تدبیر شکن تدبیر پر پہلے سے ہی کام شروع کر دیا۔ یہ القاعدۃ کے آپریشن کا حساس ترین حصہ تھا۔ اس کا مقصد طالبان کی طاقت بحال کرنا تھا جو ۲۰۰۱ میں القاعدۃ کو محفوظ پناہ گاہ دینے کے جرم میں تمام خطہ کھونے کو تھے۔

منصوبہ یہ تھا کہ طالبان کی صفوں میں القاعدۃ کی سوچ آہستہ آہستہ اور دھیمے انداز میں سرایت کی جائے تاکہ طالبان کی گروپ بندی نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے القاعدۃ کو افغان طالبان تک پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حقانی نیٹ ورک ان کے وزیرستانی ٹھکانوں کے پاس ہی تھا جہاں کے حالات نے قدرتی طور پر طالبانی معاشرے کو ایک نظریاتی، حکومت دشمن اور عالمی جہادی تحریک میں بدل دیا۔ اس قدرتی تبدیلی کے عمل کو تیز کرنے کے لیے القاعدۃ کو بس تھوڑی سی محنت درکار تھی۔

طالبان کی اصل طاقت

سراج الدین حقانی افغان کمانڈر جلال الدین حقانی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ افغانستان میں نیٹو کے خلاف لڑنے والے خطرناک ترین کمانڈر شمار ہوتے ہیں۔ افغانستان میں قابض فوجوں کے خلاف مؤثر حملوں کا ذمہ دار یہی نیٹ ورک ہے۔

اپریل ۲۰۰۴ میں شمالی وزیرستان میں ڈانڈے درپہ خیل میں حقانی سے میری ملاقات ہوئی۔ کسی بھی صحافی کو دیا جانے والا ان کا یہ پہلا انٹرویو تھا۔ اس وقت سراج الدین کو جلال الدین کے بیٹے سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ بطور کمانڈر میدانِ جنگ میں آپ کی بہادری کا امتحان نہیں ہوا تھا۔ جب مجھے ان کے انٹرویو کی اجازت ملی تو آپ منبع العلوم کے سامنے ایک چھوٹے سے حجرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ افغانستان میں ۲۰۰۱ میں طالبان کی شکست کے بعد پاکستانی حکام نے یہ مدرسہ زبردستی بند کر دیا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو کمرے میں بیٹھے کچھ جوانوں نے جلدی سے اپنے چہرے ڈھانپ لیے لیکن ان کی آنکھوں اور پیشانیوں سے میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ نہ تو مقامی قبائلی تھے اور نہ پشتون۔ مجھے یہ جان کر کوئی حیرت نہ ہوئی کہ یہ پنجابی تھے کیونکہ پنجابی جنگجو حقانی نیٹ ورک کی اصل طاقت سمجھے جاتے ہیں۔

جلال الدین حقانی اکوڑہ خٹک کے دارالعلوم حقانیہ سے پڑھے ہوئے تھے لیکن اپنی جہادی مہمات کے لیے وہ زیادہ تر پنجابی جنگجوؤں پر انحصار کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا تعلق پکتیا کے زردان قبیلے سے تھا لیکن آپ اپنی قوت پنجابی جہادی تنظیموں خاص طور پر حرکت المجاہدین اور حرکت الجہاد الاسلامی سے حاصل کرتے تھے۔

خوست سابق صدر نجیب اللہ کا آبائی علاقہ ہے۔ شمالی وزیرستان میں ۱۹۹۱ میں اس کی فتح کا سہرا جلال الدین حقانی کے زیر کمان لڑنے والے حرکت المجاہدین کے پنجابی جنگجوؤں کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ حقانی کے پنجابی جنگجو کسی بھی شہری علاقے میں کمیونسٹوں کو شکست دینے والے اولین جنگجو تھے۔ اس وقت حقانی کے زیر کمان لڑنے والے افغان قبائلیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ ۲۰۰۱ کے آخر میں طالبان کی شکست کے بعد دوسرے طالبان کمانڈروں کی طرح حقانی بھی افغانستان میں بے اثر ہو کر رہ گئے۔ آپ کو ایک نئی فوج بنانے کے لیے شمالی وزیرستان آنا پڑا۔ آپ کے افغان پیروکار افغانی معاشرے میں غائب ہو چکے تھے۔ شمالی وزیرستان میں مقامی قبائلی اپنے اپنے قبائلی کمانڈروں کے ماتحت تھے۔ اس طرح حقانی ایک بار پھر پنجابیوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

سراج الدین حقانی کے پنجابی لڑاکوں کو نائن الیون کے بعد پاکستان میں سخت آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ (افغانستان میں تمام غیر پشتونوں کو پنجابی کہا جاتا ہے)۔ نائن الیون کے بعد امریکی دباؤ میں جہادی گروپ کالعدم قرار دیے گئے اور ۲۰۰۳ میں مشرف پر حملے کے بعد سینکڑوں جہادیوں کا تعاقب ہوا اور بغیر کسی چھان بین کے انہیں حراستی مراکز میں بند کر دیا گیا۔ فطری طور پر اس مہم کا سراج الدین حقانی کے رویے پر اثر ہوا اور آپ کی سوچ بتدریج فوج مخالف ہوتی چلی گئی۔ ۲۰۰۶ کے بعد آپ نے روایتی افغان طالبان سے مختلف راہ اپنائی۔ افغان طالبان پاکستان اور عرب ممالک کے قریب تھے۔ افغانستان پر روسی حملے کے

دوران میں اگرچہ جلال الدین حقانی آئی ایس آئی کے پسندیدہ تھے لیکن ۲۰۰۷ کے بعد صورتحال یکسر بدل گئی۔ قبل ازیں، پاکستان میں القاعدۃ کی کارروائیاں عروج پر تھیں۔ جواباً پاکستانی سکیورٹی فورسز نے جیشِ محمد، حرکت المجاہدین اور حرکت الجہاد الاسلامی کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ ان تنظیموں کے سیکڑوں ارکان مطلوب افراد کی فہرست میں ڈال دیے گئے اور ان ارکان کے پاس وزیرستان میں پناہ حاصل کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ بچا۔ ان لوگوں نے جلال الدین حقانی کے اڈے کو اپنا گھر اور نیٹو کے خلاف جنگ کو اپنا مشن بنالیا۔ ان لوگوں نے وزیرستان میں فوج مخالف ذہنیت پروان چڑھائی۔ ۲۰۰۵ سے ۲۰۰۷ تک جہادیوں نے بڑے پیمانے پر شمالی وزیرستان ہجرت کی۔ ہزاروں پنجابی جہادی اس علاقے میں پہنچے۔ اگرچہ ان کی اکثریت حقانی نیٹ ورک سے جاملی تاہم وہ القاعدۃ سے متاثر تھے۔ وہ اس بات پر نازاں تھے کہ انہیں شیخ عیسیٰ، ابو ولید انصاری اور ابو یحییٰ اللیبی جیسے عرب علماء کے ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

عربوں کے ساتھ میل جول کے سراج الدین حقانی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے لیکن یہ عمل اتنا بتدریج تھا کہ آپ کو خود بھی اس کا پتا نہ چلا۔ ۲۰۰۷ میں جلال الدین بیمار پڑ گئے اور سپہ سالاری سراج الدین کو سونپ دی۔ حقانی نیٹ ورک کے اندرونی تحرکات میں یہ اہم موڑ تھا۔ تھوڑے عرصے بعد جلال الدین مکمل طور پر صاحبِ فراش ہو گئے۔ آپ نوجوان سراج الدین کو پند و نصائح کرنے کی حالت میں بھی نہیں رہے تھے۔ القاعدۃ نے موقع شناسی سے کام لیا اور جلال الدین کے وارث سے سٹریٹجک تعلقات قائم کیے۔ فروری ۲۰۰۷ میں آپ کا بگرام بیس پر حملہ ابو لیث اللیبی کی رہنمائی میں کیا گیا تھا۔ اس عرب عالم نے یہ حملہ کرنے کے لیے سراج الدین حقانی کو تمام درکار مہارت فراہم کی۔ اس طرح غزنی، خوست اور کابل میں ہونے والی دوسری کارروائیاں بھی حقانی نیٹ ورک اور القاعدۃ کے باہمی

ربط سے ہوئیں۔ چند ہی مہینوں میں حقانی نیٹ ورک افغانستان میں طالبان کا مؤثر ترین گروپ بن گیا۔

عرب علماء کے ساتھ ربط اور میل جول سے سراج الدین حقانی القاعدۃ کے اندرونی حلقوں میں شامل ہو گئے۔ شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن اور ۲۰۰۸ اور ۲۰۰۹ میں ڈانڈے درپہ خیل میں حقانی کے گھر پر سی آئی اے کے ڈرون حملوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ان حملوں میں آپ کے خاندان کے بہت سے لوگ مارے گئے اور اس وجہ سے پاکستانی فوجی اسٹیبلشمنٹ سے آپ کے رہے سہے پرانے تعلقات ختم ہو گئے۔ جنگجوؤں کا دعویٰ تھا کہ ان کی پناہ گاہوں سے متعلق معلومات پاکستانی فوج سی آئی اے کو فراہم کرتی ہے۔ جلال الدین حقانی نے القاعدۃ کے حامی پاکستانی عسکری گروپوں سے ہمیشہ فاصلہ رکھا لیکن ۲۰۰۷ کے بعد سراج الدین حقانی نے محسوس کیا کہ القاعدۃ اور اس کے پاکستانی متعلقین سے گہرے تعلقات قائم کر کے وہ اپنے مفادات کا تحفظ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ آپ کا منصوبہ نیٹو فوجوں کے خلاف افغان فوجی مزاحمت میں اہم ترین کمانڈر کا مقام حاصل کرنا تھا۔

سراج الدین حقانی کے لیے بڑا مسئلہ طالبان اور ان کے والد کے مابین تعلقات تھے۔ طالبان کی افغان مزاحمت میں جلال الدین خود مختار رہے تھے۔ اگرچہ ملا عمر نے انہیں ۲۰۰۶ میں اپنا نائب اور کمانڈر ان چیف مقرر کیا تھا لیکن قندھاری قبیلہ آزادانہ لڑا تھا۔ ملا داداللہ جیسے کمانڈر قبائلیوں کی بھرتی کے لیے وزیرستان آتے رہتے تھے۔ حقانی کے علاقے میں یہ مداخلت انہیں پریشان کرتی لیکن وہ کچھ نہ بولتے۔ اور سچ پوچھیے تو وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ بہرحال وہ صحیح معنوں میں طالبان نہیں تھے۔ جب ۱۹۹۰ کی دہائی میں طالبان نے عروج پکڑا تو سب سے پہلے جلال الدین نے انہیں تسلیم کیا۔ آپ نے ملا عمر کے ہاتھ پر بیعت کی جو اس وقت غیر معروف اور کم عمر تھے۔ باوجود اس کے کہ جلال الدین افغان مزاحمت

میں ایک بڑا نام تھا، انہیں مطلوبہ اہمیت نہ دی گئی۔ ایک طالب کو ہی اہم ذمہ داری سونپی جاتی ۔ اپنے باپ سے کمانڈرشپ لینے کے بعد القاعدۃ کے کھلے بازوؤں میں جانے سے پہلے سراج الدین کو ان گذشتہ حقائق کو ذہن میں رکھنا پڑا۔ بہر حال القاعدۃ کے ساتھ آپ کے تعلقات بہت محتاط قسم کے تھے۔

کابل میں بیٹھی نیٹو قیادت حقانی نیٹ ورک کی ان پیش رفتوں سے واقف تھی۔ انہوں نے سراج الدین کی طالبان سے دوری کا جائزہ لیا اور آپ کو آزاد کمانڈر سمجھا۔ انہوں نے غلط اندازہ لگایا۔ نیٹو کی میڈیا ریلیز میں سراج الدین کو ملا عمر کے حریف کے طور پر پیش کیا جاتا۔ یہ غلط جائزہ سراج الدین اور القاعدۃ کے مابین تعلقات کے بارے میں غلط فہمی کی وجہ سے تھا۔ در حقیقت سراج الدین ہمیشہ ملا عمر کے وفادار رہے۔ القاعدۃ نے اس کی توثیق کی اور سراج الدین اور طالبان کے مابین تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش کی تاکہ طالبان القاعدۃ کی وسیع حکمتِ عملی سے منحرف نہ ہو جائیں۔ القاعدۃ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ ملا عمر سے بے وفائی کرے۔ القاعدۃ چاہتی تھی کہ یہ اہم کمانڈر طالبان کے درمیان ان کا آدمی بن کر رہے اور القاعدۃ کے ایجنڈے کی درست عمل پیرائی کو یقینی بنائے۔ سراج الدین کا نیٹ ورک یہ سب کر سکتا تھا کیونکہ نیٹو کے خلاف جنگ میں اس کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ سراج الدین اپنے والد کی پرچھائیں سے باہر نکل آئے۔

کرم ایجنسی میں ۸-۲۰۰۷ میں ہونے والے شیعہ سنی فسادات میں سراج الدین کو سنّیوں کی مدد کے لیے بھیجا گیا۔ آپ نے تحریکِ طالبان پاکستان کے پاکستان مخالف کمانڈر بیت اللہ محسود کے ساتھ مضبوط تعلقات بنائے۔ ۲۰۰۹ میں جب پاکستانی سکیورٹی فورسز نے سراج الدین حقانی کے بھائی نصیر الدین کو گرفتار کیا تو بیت اللہ محسود نے پاکستانی فوجیوں کے تبادلے میں انہیں رہا کروایا۔ سراج الدین حقانی حیران ہوں گے کہ وہ کس طرح القاعدۃ

کیمپ میں شامل ہو گئے لیکن کچھ خارجی عناصر بھی اس کے ذمہ دار تھے۔ آپ کو پنجابی جنگجوؤں کے خیالات کا بھی احترام کرنا تھا اور وہ سب کے سب حکومت مخالف ہو چکے تھے۔ حکومت کو شبہ تھا کہ یہ لوگ القاعدۃ سے منسلک ہیں اس لیے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا تھا۔ پھر ان کے والد کی علالت تھی اور القاعدۃ کی غیر مشروط حمایت۔ سراج الدین حقانی القاعدۃ کے اس قدر مرید ہوئے کہ ۲۰۰۹ میں تحریکِ طالبان پاکستان کے خلاف فوجی آپریشن میں نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ فوج کے خلاف لڑنے میں مدد بھی کی۔

پرچھائیں سے ظلی فوج تک

سراج الدین القاعدۃ کے اسلحہ خانے میں اہم اضافہ تھے۔ بلاشبہ یہ بات سچ ہے کہ ۲۰۰۶ کے بعد حالات اس قدر سازگار ہو چکے تھے کہ القاعدۃ افغانستان اور پاکستان سے اپنی ذاتی فوج بنانے کے قابل ہو گئی جو افغان طالبان کے زیرِ کمان القاعدۃ کا علم لہرانے لگی۔ پاکستانی طالبان کی اس قدر شدید انقلابیت کی کئی وجوہات تھیں:

۱۔ پاکستانی فوجی قیادت کی طرف سے پاکستانی جہادی حلقوں پر غیر ضروری دباؤ

۲۔ القاعدۃ کے بزرگ ارکان کا قتل، گرفتاریاں اور گوانتاناموبے میں منتقلی

۳۔ عراق جنگ

۴۔ ۲۰۰۶ میں اسرائیل کا لبنان پر حملہ

اس اضافی انگیخت سے القاعدۃ طالبان بغاوت کو ایک نظریاتی جنگ میں بدل دینے میں کامیاب ہو گئی اور طالبان جنگجوؤں کی ایک نئی نسل نے جنم لیا۔ نئے طالبان بہ اعتبار جوہر طالبان ہیں لیکن ملا عمر کی بیعت میں القاعدۃ کے مقاصد کے لیے لڑتے ہیں۔ سراج الدین حقانی تو پہلے سے ہی کمانڈر تھے جو القاعدۃ کے قریب آ گئے لیکن قبائلی علاقوں میں ان جیسے اہل کمانڈر نہیں تھے۔ القاعدۃ کو اپنے یہ علاقائی کمانڈر خود چن کر تیار کرنا پڑے۔

القاعدۃ کی توجہ کوہ ہندوکش پر تھی جہاں نئی نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور نئی قیادت کے لیے جگہ بن رہی تھی۔ یہ جگہ باجوڑ، مہمند، کنڑ اور نورستان کے علاقے تھے۔ یہ سارے علاقے شمال مشرقی افغان صوبے کاپیسا سے ملحق ہیں اور پاکستانی لڑاکوں کے لیے کابل جانے کا طویل قدرتی راستہ ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی شکست کے فوراً بعد انہیں علاقوں میں القاعدۃ کے طالبان سے کمزور ترین تعلقات تھے۔ احمد شاہ مسعود اور گلبدین حکمت یار نے کرزئی انتظامیہ کی اطاعت کی اور ان کے ساتھ جڑے جنگی سردار کنڑ اور نورستان میں شوروغل مچا رہے تھے۔ یہی صورتحال پاکستان کے مہمند اور باجوڑ میں تھی جہاں پاکستانی حکومت کا کنٹرول تھا۔ ڈاکٹر اسماعیل اور مولوی فقیر محمد جیسے چند ایک بااثر کمانڈروں کے پاس القاعدۃ قائدین تھے لیکن ۲۰۰۵-۶ میں طالبان باجوڑ اور مہمند میں کھلے عام نہیں پھر سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ پاکستانی ریاست کی گرفت مضبوط تھی۔

تاہم اس دوران جنگجو ہندوکش کے قریب طاقت حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ کینیڈین ٹی وی کی دستاویزی فلم بنانے کے لیے میں نے مہمند اور کنڑ کا سفر کیا تو میری ملاقات ایک پاکستانی جنگجو سے ہوئی جو ماضی میں لشکر طیبہ سے وابستہ تھا۔ اس کا نام صادق تھا۔ اس نے مجھے وہ گم شدہ کڑیاں بتائیں جن کی وجہ سے القاعدۃ اس علاقے میں خود کو پھیلانے اور اپنی قیادت پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی۔ صادق نے اعتراف کیا کہ:

"تین سال پہلے یہ صرف ایک خواب تھا لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ وزیرستان کے علاوہ مہمند اور باجوڑ میں بھی مجاہدین بہت محتاط انداز میں سفر کرتے تھے گویا کہ لاہور یا کراچی میں ہوں۔ ہمیں ہر وقت جاسوسی اور گرفتاری کا خوف رہتا تھا۔ ہم اکا دکا حملے کرنے کے لیے خفیہ طریقے سے افغانستان جاتے تھے۔ ایک طرف ہمارے پیچھے امریکی ہوتے اور دوسری

طرف پاکستانی فوج ہماری کھوج میں ہوتی۔ ہم پاکستانیوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے کیونکہ وہ مسلمان تھے۔ ہم اپنی پوری کوشش کرتے کہ ان سے سامنا نہ ہو۔ اب بھی تین فیصد سے بھی کم مجاہدین ان کے مخالف ہیں۔ تاہم پاکستانی ہمارے بارے میں ویسی سوچ نہیں رکھتے تھے جیسا کہ ہم ان کے بارے میں سوچتے تھے۔ وہ ظالم تھے یہاں تک کہ امریکیوں سے بھی زیادہ سنگدل اور کٹھور تھے۔ ہمارا ایک ساتھی تھا جو کشمیر میں ہمارے ساتھ جنگ لڑ چکا تھا۔ اس کا نام عمر تھا اور وہ پاکستان آرمی کے خلاف لڑائی کا زبردست مخالف تھا۔ جب بھی فوج کوئی آپریشن کرتی تو وہ الگ ہو جایا کرتا کہ مسلمانوں سے نہیں لڑ سکتا اور نہ ہی لڑے گا۔ لیکن ایک بار آئی ایس آئی نے اسے گرفتار کر لیا۔ انہوں نے اسے ایک ہاتھ سے چھت سے لٹکا دیا اور اس کی رانوں پر خنجروں سے ستارے کھودے۔ کئی دوسرے طریقوں سے بھی اس کی تذلیل کی گئی۔ جب وہ رہا ہوا تو خیال تھا کہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہو گا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اب وہ جہاد کا متعصب ترین داعی اور پاکستان آرمی کا سخت ترین دشمن ہے۔ اس طرح کے واقعات مجاہدین کو ہمارے کیمپ میں لے آئے۔ اب انہیں سمجھ آ گئی کہ کشمیر میں انہیں بے وقوف بنا کر لڑایا جاتا رہا۔ ان میں اصل جذبۂ انقلاب القاعدۃ نے پیدا کیا۔

القاعدۃ کے ایک رہنما ابو مروان کو باجوڑ ایجنسی میں خاصہ دار فورس نے شہید کر دیا۔ خاصہ دار ایک چھڑا اس فورس ہے۔ اگر ابو مروان کسی کمانڈو فورس کے ہاتھوں شہید ہوتے تو اتنی سبکی نہ ہوتی۔ لیکن ان جیسے شخص کی خاصہ داروں کی گھٹیا فورس کے ہاتھوں شہادت شرمناک واقعہ تھا۔

ابو مروان ایک بس میں سفر کر رہے تھے کہ بطور عرب ان کی شناخت کے بعد انہیں نیچے اترنے کو کہا گیا۔ ابو مروان نے اپنا ریوالور نکالا اور خاصہ داروں کو خبر دار کیا کہ وہ ایک مجاہد ہیں اور کسی مسلمان ساتھی کو مارنا نہیں چاہتے اس لیے ان کا راستہ نہ روکا جائے۔ خاصہ دار اس بات پر ہنسنے لگے۔ عربوں کو تو جانتے ہیں وہ پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگتے بلکہ آخری سانس تک لڑتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ لڑائی سے بچنے کے لیے ابو مروان بھاگ نکلے اور شہید کر دیے گئے۔

آپ کی نعش کی تصاویر لی گئیں اور امریکیوں کو پیش کی گئیں۔ آپ کی شہادت کے ذمہ داروں کو تمغے نوازے گئے۔ ہر مجاہد نے شرمندگی محسوس کی۔ بھائی۔۔۔ ہمارا خون اتنا ارزاں نہیں ہے کہ ایک گھٹیا فوج کے لوگ اس سے کھیلتے رہیں۔ مجاہدین غضبناک ہو گئے ۔ وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے۔ مروان کی شہادت ذریعۂ تحریک بن گئی۔ باجوڑ میں ان کی شہادت ایک داستان اور ان کی قبر ایک مقدس جگہ بن گئی۔ باجوڑ میں شدید رد عمل شروع ہوا اور چند دن کے اندر اندر خاصہ داروں کی چوکیوں کا صفایا ہو گیا۔ آرمی نے آپریشن شروع کیا تو اسے بھی منہ کی کھانا پڑی ۔ ہماری فتوحات نے سارے قبائل کو ہمارے قریب کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اہم ترین کمانڈر مولانا فقیر محمد کو پاکستان آرمی نے سوویت کے خلاف تیار کیا تھا۔ لیکن گیارہ ستمبر کے بعد ان کے بھائی کو اسی آرمی نے گرفتار کیا اور تشدد کر کے شہید کیا۔ ۲۰۰۵ میں طالبان صرف شمالی اور جنوبی وزیرستان

تک محدود تھے اور مہمند ایجنسی میں ان کی نفری چند درجن تھی لیکن پاکستانی فوج کے دم قدم سے اب ہماری تعداد اٹھارہ ہزار سے زیادہ ہے۔"

القاعدۃ ان تمام پیش رفتوں پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ القاعدۃ کے پاکستانی قبائلیوں میں بہت سے حلیف موجود تھے لیکن وہ کسی افغان کی تلاش میں تھے جسے اہم کمانڈر بنایا جا سکے؛ کوئی ایسا جو سراج الدین جیسا ہو؛ جو طالبان مزاحمت کا مرکزی نمائندہ ہو لیکن کارروائیاں القاعدۃ کی ہدایت پر کرے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہیں مطلوبہ آدمی مل گیا۔ پاکستانی آئی ایس آئی کی حراست میں رہ کر وہ پاکستانی فوج کا سخت دشمن بن گیا تھا اور پاکستان کی مسلح افواج کے خلاف نہ لڑنے کی طالبان پالیسی پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا نام کمانڈر ضیاء الرحمان تھا۔

ضیاء الرحمان ایک گمنام شخصیت تھی جو ۲۰۰۸ کے وسط میں کنڑ، نورستان، مہمند اور باجوڑ کے علاقے میں مشہور ہونے لگی۔ آپ نے نومبر ۲۰۰۹ میں نورستان میں نیٹو فوجوں کو واضح شکست سے دوچار کیا اور وہ اپنے اڈے خالی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ قبل ازیں، نیٹو اور پاکستان آرمی نے ضیاء الرحمان کو طالبان کے ایک دوسرے درجے کے کمانڈر سے زیادہ نہیں سمجھا تھا لیکن القاعدۃ نے چوری چھپے انہیں بااثر بنا دیا۔ جب میں وادی کنڑ میں مئی ۲۰۰۸ میں ان سے ملا تو انہیں اس وقت بہت کم لوگ جانتے تھے۔ آپ کسی عظیم مجاہد کمانڈر کی اولاد نہیں تھے بلکہ ایک عالم مولانا دلبر کے بیٹے تھے۔ آپ کے تعلقات آئی ایس آئی سے نہیں بلکہ اسامہ بن لادن سے تھے۔ اسامہ بن لادن نے آپ کے والد سے حدیث کے سبق پڑھے تھے۔ تیس سال کی عمر میں آپ نے عرب جنگجوؤں کے کیمپوں میں تربیت حاصل کی۔ انہوں نے آپ کے دل و دماغ میں امریکا کے خلاف نہ صرف افغانستان بلکہ پوری دنیا میں لڑنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ضیاء الرحمان کو کمانڈر شپ وراثت میں نہیں ملی۔ آپ نے میدان

جنگ میں کمانڈر ہونے کا ثبوت دیا۔ آپ نے نورستان اور کنڑ میں امریکی دستوں سے جنگ لڑی۔ آپ پہلے آدمی تھے جنہوں نے کورنگل وادی میں امریکا کے خلاف کارروائیاں کیں اور نورستان میں دوسرا بڑا معرکہ لڑا۔ نیٹو فوج کے تعاقب سے بچتے بچاتے آپ باجوڑ کے علاقے میں داخل ہوئے اور پاکستانی فوج کے ہتھے چڑھ گئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد گرفتار فوجیوں کے تبادلے میں آپ کو رہا کروالیا گیا۔

میں نے جب مئی ۲۰۰۸ میں ان کا انٹرویو کیا تو میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کے تعلقات القاعدۃ کے ساتھ کس قدر مضبوط ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایشیا ٹائمز میں بڑے وثوق سے پیش گوئی کی کہ ضیاء الرحمان اس خطے کے اہم ترین کمانڈر ثابت ہوں گے۔ کچھ ہی مہینوں بعد القاعدۃ اور طالبان کے خلاف افغانستان کی کنڑ وادی میں آپریشن لائن ہارٹ اور پاکستانی باجوڑ اور مہمند میں آپریشن شیر دل شروع ہو گیا۔ ضیاء الرحمان سرکردہ رہنما کے طور پر سامنے آئے۔ پاکستان آرمی کو پتہ چلا کہ ہندوکش کے خطے میں تمام طالبان اور القاعدۃ گروہوں کے کمانڈر ان چیف ضیاء الرحمان ہی ہیں۔

ضیاء الرحمان ایک سیمابی شخصیت تھے۔ دوسرے طالبان کے برعکس آپ کے دل میں پاکستان آرمی کے لیے کوئی رحم و کرم نہیں تھا۔ ستمبر ۲۰۰۸ میں پاکستانی سکیورٹی فورسز نے دعویٰ کیا کہ ضیاء الرحمان کنڑ میں سیکڑوں چیچن، عرب اور افغان جنگجوؤں کی قیادت کر رہے تھے اور مہمند ایجنسی میں پاکستانی آرمی کے ٹھکانوں پر حملے کر رہے تھے۔ نومبر ۲۰۰۹ میں آپ کی کمان میں طالبان نے امریکی فوج پر زبردست حملے کیے اور انہیں اپنے بیس خالی کرنے پر مجبور کر دیا۔ جلد ہی ضیاء الرحمان نیٹو کے لیے خطرناک ترین دشمن کمانڈر بن گئے۔ القاعدۃ کو ضیاء الرحمان جیسے لوگوں کی ضرورت تھی جو طالبان میں رہ کر مقامی مزاحمتی تحریکوں کی قیادت کریں اور درپردہ القاعدۃ کی کمان میں ہی کام کریں۔ لیکن اس سارے

وقت میں القاعدۃ کے ماہرین عسکریات مختلف خطوط پر سوچ رہے تھے۔ ۲۰۰۶ اور ۲۰۰۷ کے درمیانی عرصہ میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس نئی قیادت کو ایک منظم پس پردہ فوج میں بدلا جائے۔ معروف طالبان کمانڈروں جیسے کہ ملا داداللہ اور اختر عثمانی کو ایک دکھاوے کے طور پر سامنے رکھا گیا کہ مغربی اتحادی صرف انہیں ختم کرنے کا سوچتے رہیں۔ اس دوران ایک ظلی فوج پس پردہ اور گمنام رہ کر جنگ جاری رکھے گی جس کے بارے میں نیٹو اور اس کے اتحادی کچھ بھی نہ جانتے ہوں گے۔

میں اس سے پہلے مختلف طالبان کمانڈروں سے مل چکا تھا لیکن ضیاء الرحمان ایک الگ جنس تھے۔ القاعدۃ نے انہیں مکمل طور پر بدل دیا تھا۔ اب آپ محض غضبناک قبائلی لڑاکا نہیں رہے تھے بلکہ القاعدۃ کے نظریات پر پختہ ہو چکے تھے۔ جب میں کنڑ وادی میں ان کے ٹھکانے پر ان سے ملا تو انہوں نے میرے لیے پر تعیش کھانے کا اہتمام کیا۔ آپ اپنے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ ان کے پاس اے کے ۴۷ اور راکٹ سے چلنے والے گرنیڈ تھے۔ یہ سب افغانی اور پاکستانی تھے۔ کھانا پیش کیا گیا، سب لوگ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے سوائے ضیاء الرحمان کے۔ انہوں نے اس کی وضاحت اس طرح سے کی کہ میں بعد دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا، اس سے نمازیں قضا ہو جاتی ہیں اور اللہ سے تعلق کمزور ہو جاتا ہے۔ اردو آپ کی دیسی زبان تھی لیکن عربی پر بھی عبور تھا۔ آپ نے یہ زبان عربوں سے سیکھی تھی جب انہوں نے طالبان دور میں تعلیمی مراکز قائم کیے ہوئے تھے۔ ضیاء الرحمان سلفی تھے اور آپ کی وجہ سے ہی قبائلیوں میں تفرقہ بازی کا خاتمہ ہوا۔ اس سے پہلے افغان اور پاکستانی قبائلی صرف اپنے قبیلے کے کمانڈر کے ماتحت ہی کام کرتے تھے۔ ضیاء الرحمان نے اس حد بندی کا خاتمہ کر دیا۔ آپ نے اعلان کیا کہ ہم سب ایک ہیں، تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، چاہے کوئی

مشرق سے آئے یا مغرب سے، چاہے کوئی عربی ہو یا پاکستانی۔ ہم سب کے لیے ایک ہیں اور سب ایک (اللہ) کے لیے ہیں۔

خطے میں اسٹیبلشمنٹ کی حمایت کا رجحان بدل چکا تھا۔ یہ خطہ اب پاکستانی ریاست کے خلاف ہو چکا تھا اور القاعدۃ کا طاقتور ترین ٹھکانہ بن چکا تھا۔ اس خطے میں نسل در نسل ضیاء الرحمان پیدا ہونے لگے جن کے لیے سب سے برتر چیز القاعدہ نظریات تھے۔ ہندوکش میں ضیاء الرحمان کی نمود اری نے ہر چیز الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ باجوڑ اور مہمند کے قبائلی اب پاکستانی اسٹیبلشمنٹ یا پاکستان دوست طالبان کمانڈروں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

نیٹو اور پاکستان کا مشترکہ آپریشن لائن ہارٹ (شیر دل) طالبان کی اسی نئی نسل کو ختم کرنے کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ نیٹو افغان صوبوں کنڑ اور نورستان میں لڑی اور پاکستان آرمی باجوڑ اور مہمند میں۔ یہ آپریشن کئی مہینے جاری رہا۔ پاکستان آرمی اور نیٹو نے فتح کا اعلان کر دیا لیکن نومبر ۲۰۰۹ میں جنگجو دوبارہ نمودار ہو گئے۔ انہوں نے امریکی فوج کے سرحدی دستوں پر تباہ کن حملے کیے، کم از کم نو امریکی فوجی قتل کیے، افغان فوج کے درجنوں اہلکار قتل اور بہت سے اغوا کر لیے۔ نومبر ۲۰۰۹ کے آخری ہفتے میں ضیاء الرحمان کی کمان میں جنگجوؤں نے نورستان میں امریکی اڈوں پر قبضہ کر کے عالمی میڈیا کو اس فتح مندی کا نظارہ کرنے کی دعوت دی۔ مہمند اور باجوڑ میں ضیاء الرحمان کے وفاداروں نے دوبارہ ظاہر ہو کر پاکستانی سکیورٹی اہلکاروں پر پہلے سے بھی مہلک حملے کیے اور سرحدی دیہات خالی کرنے پر مجبور کر دیا۔ جب دسمبر ۲۰۰۹ میں برفباری ہوئی تو ہندوکش القاعدۃ کے کنٹرول میں تھا۔ تاہم یہ نہ ختم ہونے والی جدوجہد جاری رہی اور اسی وجہ سے افغانستان اور پاکستان میں ایک اور آپریشن شروع ہو گیا۔

القاعدۃ کی روح نئے جسم میں: لشکرِ ظِل

دسمبر ۲۰۰۹ میں امریکی خفیہ ایجنسی کے ترجمان نے اے بی سی نیوز کو بتایا کہ افغانستان میں القاعدۃ کے تقریباً سو رکن باقی رہ گئے ہیں۔ اصل حقیقت کو نہ سمجھنے کی امریکی حکومت کی یہ دوسری مثال تھی۔ جب صدر اوباما نے تیس ہزار نئے فوجی افغانستان میں بھیجنے کا فیصلہ کیا تو اس کا یہ فیصلہ القاعدۃ کی نفری کی جمع تفریق کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ واشنگٹن القاعدۃ کے ۲۰۰۲ سے ۲۰۰۹ کے درمیان ارتقاء کی کہانی نہیں جانتا تھا۔ القاعدۃ ۲۰۰۲ کے بالی بم دھماکوں جیسے محدود اہداف کی بجائے مغربی حلیفوں کی سپلائی لائن کاٹنے کے اعلیٰ ہدف کا فیصلہ صرف افغانستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں کر چکی تھی۔ ۸-۲۰۰۷ کے واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ اب القاعدۃ اپنی نائن الیون والی سوچ سے کہیں آگے تھی اور اب اس کا کھیل صرف اس کے نظریات تک ہی محدود نہ تھا۔ سابقہ تمام سانچوں کی حد تک یہ ٹھیک تھا۔ اب القاعدۃ نے جنگجوؤں کی ایک نئی نسل میں اپنی روح پھونکی جس کا نام لشکرِ ظل[1] تھا۔ اپنے بنیادی مزاحمتی طریقہ کار جس پر وہ اپنی تشکیل کے وقت سے کاربند تھی، کی بجائے اب القاعدۃ نے اس لشکر ظل کے ذریعے عالمی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ القاعدۃ نے قبائلی علاقوں میں جند اللہ جیسے عسکری ڈھانچے کھڑے کیے تھے لیکن لشکرِ ظل بنا کر القاعدۃ کی رسائی بہت بڑھ گئی۔

تحریکِ طالبان پاکستان جیسے مقامی عسکری گروپ القاعدۃ کو پاکستان کے قبائلی اور شہری علاقوں اور افغانستان میں سہولت دینے کے لیے تھے۔ لشکرِ ظل پرانی القاعدۃ میں ایک

1۔ لشکر ظل کی موجودہ صورت القاعدہ کی افغانستان، پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور برما میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف کاروائیوں کے لیے بنائی جانے والی تنظیم "القاعدہ برصغیر" ہے، جس کی قیادت دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل بھارتی شہری مولانا عاصم عمر کر رہا ہے۔ مترجم

اہم اضافہ تھا۔ ۱۹۹۰ کی ساری دہائی میں القاعدۃ کا مقصد اور ہدف مغرب اور عالمِ اسلام کے درمیان جنگ کی ترغیب دینا تھا۔ اس کا اظہار یمن میں یو ایس ایس کول اور ۲۰۰۱ میں امریکی سرزمین پر حملوں میں ہوا۔ تاہم وسط ۲۰۰۰ میں القاعدۃ نے مغرب کو شکست دینے کے لیے اپنے تناظر میں توسیع کی۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ القاعدۃ نے پہلے سے موجود عسکری گروپوں جیسے کہ تحریکِ طالبان پاکستان کو ایک تنظیم کی صورت میں کیوں نہ ابھارا اور الگ سے لشکرِ ظل کیوں بنایا؟ ۲۰۰۲ کے بعد سے القاعدۃ نے اپنے پھیلاؤ کا ایک ایسا نظام وضع کر دیا تھا کہ اس کے اہداف کو پورا کرنے کے لیے مختلف گروپ خود بخود وجود میں آتے رہیں۔ تحریکِ طالبان پاکستان اسی نظام کی پیداوار تھی۔ نظام میں لچک رکھی گئی اور مقصد یہ تھا جب کبھی امریکا اور اس کے حلیف پاکستان کی طرف سے حملہ ہو تو القاعدۃ تنظیم اور اس کے وسائل کی مکمل تباہی سے بچنے کے لیے جنوبی ایشیا میں بحران پیدا کر دیا جائے۔

ان تنظیموں کے پیش رو اور منتظم مقامی قبائلی اور میدانی پاکستانی تھے۔ لیکن تحریکِ طالبان پاکستان جیسی تنظیموں پر القاعدۃ کا اثر و رسوخ کم ہو گیا تھا۔ یہ تنظیمیں ایسی سرگرمیوں میں ملوث تھیں جن سے القاعدۃ قیادت نفرت کرتی تھی لیکن انہیں نظریۂ ضرورت کے تحت برداشت کیا جاتا تھا اور القاعدۃ جان بوجھ کر ایسی سرگرمیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ یہ القاعدۃ کی تبدیلی کا دور تھا جس میں القاعدۃ کچھ وقت لے کر طاقت حاصل کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پیروکار اکٹھے کر کے انہیں حقیقی بھائی بنا رہی تھی۔ القاعدۃ کا اندازہ تھا کہ کشمکش کے عمل میں حالات کا رخ اس کے حق میں جائے گا۔

گیارہ ستمبر کے بعد جنوبی ایشیا کے میدان جنگ میں القاعدۃ طالبان کے اسلام پر خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ طالبان جدید تعلیمی نظام اور قوانین کی مخالفت کرتے تھے۔ مردوں کے لیے داڑھی لازمی تھی ، شہری آبادی اور آرائشِ حسن وجمال کے مراکز

(Beauty Parlors) پر حملے کیے جاتے تھے (خاص طور پر پاکستانی طالبان)[1]۔ القاعدۃ یہ بات جانتی تھی کہ اس طرح کے کاموں سے مقامی آبادی آخر کار اس کے اور طالبان کے خلاف ہو جائے گی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ روئے زمین پر افغان طالبان اور پاکستانی طالبان کے سوا القاعدۃ کو پناہ دینے والا کوئی نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی تو طالبان کی حمایت یکسر ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ القاعدۃ نے مقامی روایات کو خواہی نخواہی برداشت کیا اور اس طرح مقامی عسکری گروہوں پر اپنی گرفت برقرار رکھی۔ نامحسوس طریقے سے القاعدۃ اس مقام تک پہنچنے پر کام کرتی رہی جہاں پر وہ دوسروں کی محتاج نہ رہے بلکہ براہِ راست معاملات کنٹرول کرے۔ القاعدۃ نے مستقل مزاجی سے اپنے نظریات والے کمانڈروں کی پرورش کی اور سراج الدین اور ضیاء الرحمان جیسے لوگ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مگر ایک کام ابھی باقی تھا۔ القاعدۃ کی روح محفوظ کرنے اور اس کے مشن کو اعلیٰ سطح تک پہنچانے کے لیے اس روح کو ایک نئے جسم میں داخل کرنا ضروری تھا۔ یہ عمل بہت حساس اور مشکل تھا۔

القاعدۃ کی منزلِ مقصود ایک خلافت کے تحت اسلامی نظام کا قیام تھا لیکن یہ جبری نفاذِ اسلام کی تحریک نہیں تھی۔ القاعدۃ مغربی اجارہ داری کے خلاف ایک مزاحمتی تحریک تھی جس کا مدعا یہ تھا کہ اسلامی مزاحمت اور آزادی کی تحریکیں الگ الگ لڑنے کے بجائے ایک متحدہ محاذ پر جمع ہو جائیں۔ اخوان المسلمون اور القاعدۃ میں یہ بنیادی اختلاف تھا۔ القاعدۃ میں ایمن الظواہری کا مؤقف تھا کہ جب تک اسلامی آبادی اور اسلامی ممالک کے اداروں سے مغربی اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہو جاتے شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔ الظواہری اخوان

1۔ طالبان میں موجود ایسے شدت پسند عناصر کی وجہ سے افغانستان و پاکستان میں داعش کو اپنی نئی شاخ بنانے میں آسانی ہوئی۔ مترجم

کے بانی حسن البنا سے متاثر تھے جنہوں نے ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ میں مصر میں اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے کام کیا لیکن ان کا کام برطانوی نو آبادیات کے خلاف مزاحمت تک محدود تھا۔ الظواہری سید قطب سے بھی متاثر تھے جنہوں نے مغربی تہذیب کو مکمل جاہلیت قرار دیا اور اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے لیے مغربی معاشرے کی عادات واطوار سے قطع تعلقی کا مطالبہ کیا۔

القاعدۃ اکثر سعودی عرب کی مثال پیش کرتی ہے جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں لیکن ملک مغربی مقاصد اور عزائم کا غلام ہے۔ القاعدۃ نے مغربی اجارہ داری کے خلاف عالم اسلام کی مزاحمتی تحریکوں کے احیا کو اپنا ہدف بنایا اور اس عمل میں جماعت اسلامی پاکستان، اخوان المسلمون، صومالیہ کی اسلامی کورٹ یونین اور حزب الاسلامی عراقی کی نفی کی۔ اگرچہ یہ تحریکیں اسلام کی نام نہاد علمبردار ہیں لیکن در حقیقت حاضر و موجود کو برقرار رکھنے میں اہم قوتیں ہیں۔ ان تنظیموں کی بقاء مسلم ممالک میں امریکی مقاصد کے تحفظ کے لیے قائم مغربی اداروں اور طاقتوں سے سمجھوتے کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح القاعدۃ کا خیال ہے کہ مسلم ممالک کی نام نہاد فوجیں صرف مغربی مفادات کے دفاع کے لیے ہیں اور غلبۂ اسلام کی راہ میں خطرناک ترین مغربی ہتھیار ہیں۔ حماس اور اسلامک جہاد بھی اس صف میں شامل ہیں جو مغرب کے وضع کردہ عالمی قوانین کی پیروی کرتی ہے۔ القاعدۃ کی جدوجہد کا مقصد مسلم مسلح افواج اور عالمی سیاست و تجارت سے امریکی تسلط و غلبے کو ختم کرنا ہے۔ گیارہ ستمبر سے پہلے القاعدۃ کے پاس خالد شیخ محمد جیسے زبردست ماہر عسکریات تھے لیکن اعلیٰ سطح کی بغاوت کے لیے کوئی تجربہ کار شخص دستیاب نہیں تھا۔ گلبدین حکمت یار جیسے لوگ القاعدۃ کے حلیف تو تھے لیکن ان کی اپنی سوچ اور پالیسیاں تھیں۔ یہ تو ممکن تھا کہ یہ حلیف عارضی طور پر تو کام دیں لیکن یہ خطرہ ہمیشہ موجود رہتا کہ عین مشکل گھڑی میں یہ لوگ ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

القاعدة کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو عالمی تناظر میں گوریلا جنگ کا ماہر ہو اور اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر سوچ سکے۔

کشمیر کے جہادی کیمپوں میں بحران نے ایک بار پھر القاعدۃ کو موقع دیا کہ اپنی روح ایک نئی فوج میں داخل کر سکے۔ یہ موقع ۲۰۰۳ میں مشرف پر حملے کے بعد ملا جب حقِ خود ارادیت کے لیے لڑنے والے مجاہدین کے خلاف وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا عمل شروع ہوا۔ تفتیشی عمل میں کسی فرد کے جہادی حلقوں سے تعلق کا ذرا سا شبہ بھی اذیت کے لیے کافی ثبوت تھا، خواہ اس کا تعلق پاکستانی فوج سے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ جب پتہ چلا کہ آصف چھوٹو (لشکر جھنگوی کا موجودہ سربراہ) نامی شخص نے حملے کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا تو جیشِ محمد کے سپریم کمانڈر عبد اللہ شاہ مظہر کو بھی آئی ایس آئی نے اٹھا لیا۔ آصف کبھی جیشِ محمد کا رکن تھا جو بعد میں القاعدۃ میں شامل ہو گیا۔ عبد اللہ شاہ نے عقوبت خانے میں بِتائے دنوں کی بپتا ان لفظوں میں سنائی:

> "مجھے کراچی سے اٹھایا گیا اور ایک گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ آخری عمارت جو میں نے دیکھی وہ ڈیفنس کی سلطان مسجد تھی۔ اس کے بعد میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور ایک بنگلے پر لے جایا گیا۔ مجھے اچھا کھانا دیا گیا اور اچھا برتاؤ کیا گیا۔ مجھ سے آصف کے بارے میں چند ایک سوالات کیے گئے کہ میں اس کے بارے میں کتنا جانتا ہوں اور مشرف پر حملے میں میرے ملوث ہونے کا امکان ہے یا نہیں۔ میں نے انہیں واضح طور پر بتایا کہ اگرچہ میں اور آصف مدرسے میں ایک ساتھ پڑھتے تھے لیکن مجھے اس کی سرگرمیوں کا کوئی علم نہیں تھا اور نہ ہی مشرف کے قتل کی سازش میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔ فوجی افسر نے مجھے بتایا کہ میرے پاس سوچنے کے لیے تین دن ہیں، اس کے

بعد مجھے ان لوگوں کے حوالے کر دیا جائے گا جو میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ میرا جواب وہی تھا کہ مجھے کوئی علم نہیں آصف چھوٹو کیا کرتا ہے۔

تین دن کے بعد مجھے ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا جو ایک فوجی بیرک تھی۔ کوئی بھی شخص مجھ سے نہیں ملا سوائے ایک آدمی کے جو مجھے کھانا پانی دیا کرتا تھا۔ پھر ایک دن مجھے ایئرپورٹ لے جایا گیا اور دوسرے شہر (غالباً لاہور) پہنچا دیا گیا۔ یہاں پر مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھا گیا۔ انہوں نے مجھے چھت سے اس طرح لٹکا دیا جس طرح قصائی مرغی ذبح کرنے سے پہلے اسے جکڑتے ہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں ملا کر ایک رسی سے باندھ دی گئے اور چھت سے لٹکا دیا گیا۔ جسم کا ہر رگ و ریشہ درد سے چٹخنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد مجھے نیچے کھینچا اور میری شلوار اتار کر میرے چوتڑوں پر بید سے پیٹنا شروع کر دیا۔ بید کی ضرب میری کھال ادھیڑ دیتی۔ اس سارے عمل میں کسی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ جب میں نیم بے ہوش ہو گیا تو مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ کچھ گھنٹوں بعد ایک آدمی آیا، دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور مجھے اپنا ہاتھ باہر نکالنے کو کہا۔ میں نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو اس نے میرے ہاتھ پر کوئی مرہم رکھا اور کہا کہ یہ مرہم اپنے زخموں پر لگا لو۔

اس کے بعد ایک مختصر تفتیشی دور ہوا اور پھر مجھے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ رفع حاجت کے لیے ایک لوٹا دیا گیا۔ چھ ماہ بعد بے گناہ قرار دیا گیا۔ ایک

بریگیڈیر آیا اوراس برتاؤ پر معذرت کی۔ اس نے اس کا مالی معاوضہ بھی پیش کیا لیکن میں نے انکار کر دیا۔"

عبد اللہ پھر کراچی چلے گئے اور اپنے معمول کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ان کے دل میں کوئی انتقامی جذبہ نہیں تھا۔ لیکن ان عقوبت خانوں میں بنیامین جیسے لوگ بھی لائے گئے اور ایسے ہی حراستی مراکز میں رکھے گئے جو اپنے اوپر ہونے والے اس بدترین تشدد کو بھول نہیں پائے۔ ابن امین (بنیامین) بعد میں سوات وادی میں طالبان کے بااثر کمانڈر بنے۔

ایک دوسرے شخص جنہوں نے مظہر کے برعکس پاکستانی ریاست کے خلاف انحراف کا راستہ اپنایا، کمانڈر محمد الیاس کشمیری ہیں۔ ان کے نام سے ہندوستانی فوجی قیادت ابھی تک کانپتی ہے۔ بطور کمانڈر جدید دنیا کے گوریلا کمانڈروں میں سے کسی کو ایسی کامیابی نہیں ملی جو کشمیری نے پائی۔ آپ کے سابقہ ریکارڈ اور القاعدۃ کی مکمل اطاعت نے القاعدۃ قیادت کو بہت متاثر کیا۔ جلد ہی آپ القاعدۃ کی شوریٰ میں شامل ہو گئے اور بعد میں آپ کو کارروائیوں کی کمان سونپی گئی۔ یہ القاعدۃ کے سفر میں ایک نیا موڑ تھا۔ اب القاعدۃ اپنی کارروائیوں میں مکمل طور پر آزاد تھی اس نے قاری ضیاء الرحمان اور سراج الدین حقانی کے کمانڈروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور لشکر ظل کی تنظیم بنائی۔ القاعدۃ کے بہترین دماغ یعنی ہارون اور ضیاء الرحمان جیسے لوگ لشکر ظل کے رکن تھے۔ یہ افغان جنگ کے نئے مرحلے کا آغاز تھا جس کے لیے مغربی اتحادی فوجیں تیار تھیں اور ہزاروں فوجیوں کی آمد آمد تھی۔ اس مرحلے میں انڈیا بھی مغربی اتحادیوں کی حمایت کر رہا تھا۔ یہی مرحلہ تھا جس میں یہ ارادہ کیا گیا تھا کہ مغربی دباؤ کے زیرِ اثر پاکستان جنگجوؤں کے خلاف مکمل اور بھرپور کارروائی کرے گا۔

القاعدۃ کی الف لیلۃ کی ایک نئی داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اگرچہ مرکزی محاذ افغانستان ہی رہا لیکن القاعدۃ نے مغربی وسائل کھپانے کے لیے کچھ نئے محاذ کھولنے اور عراق میں احیا کا منصوبہ بنایا۔ ۲۰۰۸ اور ۲۰۰۹ میں لشکر ظل نے افغانستان اور پاکستان میں طالبان کی کامیابی کے لیے مرکزی کردار ادا کیا۔ تاہم بعد میں اس کا رخ افغانستان اور مشرق وسطیٰ کے جنگ زدہ علاقوں کی طرف کر دیا گیا تاکہ القاعدۃ کے وسیع تر اہداف کے لیے اس کے نظریات اور عسکریات پر عمل درآمد ہو سکے۔ اس نئی تشکیل میں ہارون اور ضیاء الرحمان جیسے لوگوں کو مدد کے لیے طالبان کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لشکر ظل کے ذریعے وہ آزادانہ طور پر حکمتِ عملی ترتیب دے سکتے تھے جو بالآخر نیٹو کے خلاف طالبان کے لیے مفید ہو۔ لشکرِ ظل کی تشکیل نے القاعدۃ پروگرام کو ایک قدم آگے بڑھا دیا۔ القاعدۃ کا اگلا ہدف یہ تھا کہ پوری دنیا میں اسلامی مفادات کے لیے کام کرنے والے مسلم گوریلا گروپوں اور ماہرین حربیات کو ایک چھتری تلے جمع کیا جائے اور انہیں حقیقی بھائی بنایا جائے۔ القاعدۃ کا آخری ہدف یہ ہے کہ مقامی مسلمان مزاحمتی تحریکوں کے تحرکات پر مکمل کنٹرول حاصل کیا جائے اور ایسا ماحول بنایا جائے کہ مقامی اہداف القاعدۃ کی (عالمی) پالیسیوں سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ ان تحریکوں میں طالبان، عراقی اور فلسطینی مزاحمتی تحریکیں بھی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ القاعدۃ پاکستان، سعودی عرب، مصر اور اردن جیسے ممالک پر لشکرِ ظل کے ذریعے دباؤ ڈالنا چاہتی ہے تاکہ وہ مغربی حمایت سے باز آ جائیں۔

اس صورتحال سے مکمل بے خبر اوباما انتظامیہ نے اپنی توجہ کا مرکز افغانستان ہی قرار دیا اور تیس ہزار اضافی فوجیوں کو میدانِ جنگ میں اتار دیا۔ امریکا نے القاعدۃ اور طالبان کو ختم کرنے کے لیے اپنے یورپی اتحادیوں سے بھی درخواست کی کہ وہ بھی مزید فوجی دستے روانہ کریں۔ جب اوباما انتظامیہ اپنی نئی پالیسیاں مرتب کر رہی تھی تو القاعدۃ نیٹو کا سامنا

کرنے کے لیے نئے محاذ ڈھونڈ چکی تھی۔ القاعدۃ ظلی حربیات کے ذریعے امریکا کا مقابلہ کرنے کے لیے یمن اور صومالیہ کی نئی منزلوں پر پہنچ گئی۔

القاعدۃ کے بنائے سگے بھائی: صومالیہ اور یمن

صومالی جہادی ویب سائٹ (http://www.alqimmah.net) پر شائع ہونے والا ایک بیان:

"اللہ تعالیٰ پیارے شیخ ابو یحیٰ اللیبی کی حفاظت فرمائے جنہوں نے بھائیوں کو صومالیہ میں بحری اور برّی حملے کرنے کی تجویز دی۔ بحری انفال (مالِ غنیمت) بھی جائز ہیں اور برّی جنگ سے حاصل کردہ انفال کی طرح ہی تقسیم کیے جاتے ہیں۔ جدید دور میں سمندری اموالِ غنیمت بہت زیادہ اور بہت مبارک ہیں اور ان پر حملہ کرنا بنتا ہے۔ کفار کا ایک بحری جہاز پکڑ کر اتنا مال حاصل کیا جا سکتا ہے جو درجنوں زمینی حملوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اب جہاز اتنے بڑے بڑے ہیں کہ ان کی جسامت ایک دیہہ کے برابر ہوتی ہے۔ ان سب میں مہنگا اور قیمتی سامان ہوتا ہے جس سے لوگ منفعت حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے کفار ایک جہاز واپس حاصل کرنے کے لیے کروڑوں کا تاوان ادا کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان اموالِ غنیمت کے سب سے زیادہ حقدار اور ضرورت مند مجاہدین ہی ہیں۔ ان میں سے اکثر اس بات پر غمزدہ ہیں کہ ان کے پاس خرچ کرنے کے لیے کوئی رقم نہیں ہے۔"

یہ القاعدۃ کی صومالی کارروائی کے لیے توجیہہ ہے۔ ۲۰۰۴ تک صومالیہ میں القاعدۃ کا وجود بہت کمزور تھا لیکن جب اس نے پاکستانی قبائلی علاقوں میں کیے گئے تجربات سے سیکھے

طریقے وہاں بھی برتے (اپنے مالی اور انسانی وسائل استعمال کرنے کی بجائے مقامی اسلام پسندوں کو القاعدۃ کے حقیقی بھائیوں میں تبدیل کرنا) تو صومالیہ میں اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس سے افغانستان میں طالبان اور القاعدۃ کے خلاف لڑنے والے مغربی اتحادیوں پر مزید دباؤ آگیا کیونکہ یورپ سے ایشیا کا اہم تجارتی راستہ کٹ چکا تھا۔

صومالیہ کے خاص حالات نے القاعدۃ کو اپنا ایجنڈا نافذ کرنے میں بہت مدد دی۔ ان حالات میں افغانستان میں طالبان کی طرز پر کورٹ یونین کا ظہور، چھے مہینوں میں اس کا زوال اور اس کے بعد بدنظمی اور حبشہ کے ساتھ جنگ شامل ہیں۔ درحقیقت انٹرنیشنل کورٹ یونین کے فوری بعد القاعدۃ نے صومالیہ میں اپنی شاخ قائم کرنے کے لیے لشکرِ ظل کو متحرک کر دیا تھا۔ جب ۲۰۰۶ کے آخر میں آئی سی یو حکومت کے خاتمے کے بعد صومالیہ میں انتشار و بدنظمی شروع ہوئی تو لشکرِ ظل کے ارکان، الیاس کشمیری اور وزیرستان میں القاعدۃ رہنما صلاح صومالی نے اس بدنظمی میں اضافہ کرنے کے لیے حرکت الشباب کی تشکیل کی۔ القاعدۃ نے اس بات کو یقینی بنایا کہ حرکت الشباب کے نام سے بنائی گئی اس کی تنظیم کے چند سو جوان خصوصی طور پر صومالیہ کے نزدیک بحری کارروائیاں کریں گے۔ اس کا مقصد یورپ سے ایشیا تک کی مغربی سمندری تجارتی رگ کاٹنا تھا۔

اسی سال القاعدۃ نے خود کو یمن میں دوبارہ منظم کیا۔ یہاں بھی لشکرِ ظل ہی اس کی تشکیلِ نو کا انچارج تھا۔ لشکرِ ظل کے تحت القاعدہ نے عراق اور سعودی عرب سمیت مختلف ممالک سے جنگجوؤں کو ایک جگہ جمع کیا تاکہ یمن میں اس کا احیا ہو سکے۔ القاعدۃ کے وسیع مفادات کے لیے یمن کی بہت اہمیت ہے کیونکہ عرب دنیا کے لیے اسے سٹریٹجک مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ القاعدۃ کے لیے فلسطینی اور عراقی تحاریکِ آزادی کو کنٹرول کرنا بہت ضروری ہے۔ القاعدۃ سعودی عرب، اردن اور مصر میں بھی پاکستانی طرز کا طریقہ اپنانے کا

ارادہ کیے ہوئے ہے یعنی ان ممالک کی امریکی حمایت ختم کی جائے اور یہاں اپنا نیٹ ورک مضبود کیا جائے۔ اصل میں یمن اور صومالیہ میں گرفت مضبوط کرنا بھی افغانستان میں القاعدۃ کی جنگ سے ہی مربوط ہے۔ بارہ جون کو نیویارک ٹائمز نے امریکی ترجمان کا ایک بیان شائع کیا کہ القاعدۃ کے کارکن پاکستان سے یمن اور صومالیہ میں منتقل ہو رہے ہیں اور واشنگٹن خوف زدہ ہے کہ بحرِ احمر کی ریاستوں میں بد نظمی پیدا کرنے کے لیے منظم کوشش جاری ہے۔ القاعدۃ کے اہم عسکری اہداف حاصل کرنے کی جدوجہد بارے یہ ایک سچی رپورٹ تھی۔ صومالیہ اور یمن بحر احمر کے جنوبی حصے پر واقع آبنائے باب المندب پر واقع ہیں جو کہ خلیج اور مغرب کے درمیان تیل کی تجارت کا بنیادی راستہ ہے۔ خلیج عدن میں صومالی قزاقوں کے بحری جہازوں کے لوٹنے سے اس خطے میں بڑھتے ہوئے تحفظات واضح ہو جاتے ہیں۔

سعودی تجزیہ کار مائی یمانی کے مطابق یمن نہ صرف سعودی عرب بلکہ پوری دنیا کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ صرف یہی ایک ملک ہے جہاں سے تیل بغیر کسی تنگنائے سے گزرے کھلے سمندروں تک لے جایا جا سکتا ہے۔ وہ مزید کہتی ہے کہ اس راستے کو خطرہ ہونے کا مطلب ہے کہ پوری دنیا کی معیشت خطرے میں ہے۔ دراصل یہ کارروائی القاعدۃ کی افغانستان میں فتح حاصل کرنے کے لیے پاکستان سے افغانستان میں جانے والی نیٹو سپلائی لائن کاٹنے کی حکمتِ عملی کا اِعادہ تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں طوفان کھڑا کر کے القاعدۃ افغانستان میں مغرب کو شکست دینا چاہتی ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے یمن پاکستان اور افغانستان کے درمیان واقع قبائلی پٹی کی طرح عرب دنیا کے قلب میں ہے۔ سیاسی طور پر پاکستانی قبائلیوں کی طرح یہاں کے قبائلیوں نے بھی ۱۹۸۰ کے افغان جہاد میں فعال شرکت کی تھی۔ لہٰذا القاعدۃ کو یہاں پر وسط مشرقی کارروائیوں کے لیے مطلوبہ جگہ مل گئی۔ لشکر ظل نے اپنے ماہر دستے روانہ کیے تا کہ ابنائے وطن (دھرتی کے بیٹوں یعنی غیر القاعدۃ اسلامی جنگجوؤں کو

القاعدۃ کے حقیقی بھائیوں میں بدلنا) حکمتِ عملی پر دوبارہ عمل کیا جاسکے۔ کشمکش برپا ہونے کے لیے زمین بالکل تیار ہو چکی ہے۔

گیارہ ستمبر سے پہلے القاعدۃ کی تمام بڑی کارروائیاں یمن سے کی گئی تھیں۔ اکتوبر ۲۰۰۰ میں امریکی بحری بیڑے یو ایس ایس کول پر حملہ، آپریشن بلیک ہاک ڈاؤن کے لیے نقل و حمل کی تیاریاں، ۱۹۹۳ میں صومالیہ میں امریکی فوجیوں کا قتل، ۲۰۰۲ میں کینیا اور ممباسا میں یہودی املاک پر حملہ اور ۲۰۰۳ میں سعودی اہداف پر القاعدۃ کے حملے، یہ سب کے سب یمن سے کیے گئے۔ افغانستان اور پاکستان میں اہم قدم اٹھانے میں القاعدۃ کو پانچ سال لگے لیکن القاعدۃ قیادت پر اعتماد تھی کہ صومالیہ اور یمن میں اس کی کارروائیاں ثمر آور ہونے میں ایک دو سال ہی لگیں گے۔ ان کارروائیوں کے فوری نتائج افغانستان میں حاصل ہوں گے جہاں پر پورے خطے پر سیاسی اور عسکری محاصرے کے بعد مغربی دستوں کا ٹکنا محال ہو جائے گا۔ رسد منقطع ہونے کے بعد بحر احمر کی طرف سے وہ مکمل طور پر محصور ہو جائیں گے۔ اس طرح مغرب کی شکست یقینی ہو جائے گی۔ پاکستانی قبائلی علاقوں میں القاعدۃ قیادت کا خیال ہے کہ ۲۰۱۲ تک اس سمت میں تیز تر پیش رفتیں ہوں گی۔ ان کا ایمان ہے کہ اس وقت تک مشرقِ وسطیٰ میں زمانہ آخری کی لڑائیوں کے لیے وہ مکمل طور پر تیار ہو چکے ہوں گے۔ اس دوران کلمہ طیبہ والے سیاہ پرچم بلند کیے، روندے ہوئے افغان، عرب افغان اور وسط ایشیائی مسلمان قبیلے پہاڑوں سے اتریں گے اور غیر متوقع فتح کا اعلان کریں گے۔ پھر وہ یہاں سے مہدی مسیح الموعود کی قیادت میں ایک نئی جدوجہد کا آغاز کریں گے؛ مغربی فوجوں سے فیصلہ کن آمنا سامنا ہو گا اور عالمگیر خلافت کے احیاء کے لیے دجال کو شکست دی جائے گی۔

باب 4
تکفیر اور خروج: اسلام پسندوں اور ریاستوں میں تمیز کا عقیدہ

تکفیر اور خروج: اسلام پسندوں اور ریاستوں میں تمیز کا عقید

وہ مسلمان حکمران جو ایک مسلمان ریاست کے خلاف کسی غیر مسلم ریاست کی پالیسیوں کی حمایت و معاونت کریں تو کیا وہ اسلامی عقیدے کی رو سے مسلمان رہیں گے؟ یا وہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے؟ کیا وہ فوج مسلمان ہے جو مسلمان فوجیوں پر مشتمل ہے لیکن ان مسلمان بھائیوں پر مظالم ڈھانے میں مصروف ہے جو ایک غیر مسلم فوج کے حملے کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں؟ مسلمان عوام جو مسلمانوں کے خلافت کے سیاسی نظام کا انکار کرتے ہیں اور اس کے بجائے مغربی لبرل جمہوریت، شہنشاہیت، سوشلزم یا کسی بھی دوسرے انسانی وضع کردہ سیاسی نظام کی پیروی کریں تو کیا وہ مسلمان رہتے ہیں؟ یا کسی غیر اسلامی نظام کو اپنانے کے بعد وہ اسلامی عقیدے پر ہی عمل پیرا رہتے ہیں؟ کیا وہ مسلمان افراد اور عوام جو اسلامی اقدار ترک کر کے مغربی طرزِ زندگی اختیار کرتے ہیں مسلمان ہی رہتے ہیں یا غیر مسلم ہو جاتے ہیں؟

پچھلے بیس برسوں میں کئی ایسی تحریریں شائع ہوئیں جن میں ان سوالوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس بحث میں شریک ایک گروپ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلمان معاشروں میں چند چھوٹے چھوٹے گروہوں کے سوا اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والوں کی اکثریت اسلام ترک کر چکی ہے۔ یہ خالص علمی بحث یا فرقہ واریت کے دلدادہ کسی خاص مولوی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اصل میں یہ القاعدۃ نظریات کی اساس ہے جو آج مسلم دنیا میں دو قطبیت پیدا کرنے اور مستقبل کی جدوجہد میں اسے برتنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

یہ مسلسل بحث اور اخذ کردہ نتائج بعد از خلافت کے دور میں پیدا ہونے والے حالات پر علمائے سلف کی تصانیف کے دوبارہ جائزے سے نکلے ہیں۔ لیکن جس واقعے نے اس مسئلے کو ایک قدم بڑھا دیا وہ ۱۹۷۹ میں مکہ مکرمہ کی مسجد حرام کا محاصرہ ہے۔ جب مسلمانوں

کے ایک چھوٹے سے گروہ نے تھوڑی دیر کے لیے مسجد کا محاصرہ کر کے سعودی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ سعودی بادشاہت نے اس بغاوت کو بڑی بے رحمی سے کچل دیا لیکن اس واقعے نے اس نوجوان نسل کی آنکھیں کھول دیں جو روسی حملے کے بعد افغانستان میں لڑ چکے تھے۔ منکرینِ خدا روسیوں سے لڑتے ہوئے معاصر دنیا کے بارے میں وہ تیز فہم ہو چکے تھے اور مکہ محاصرہ سے تحریک پکڑتے ہوئے مسلم خلافت کے احیا کے لیے ان کی جدوجہد تیز تر ہو گئی۔

القاعدۃ کے علماء کے مطابق صحیح معنوں میں یہ بیسویں صدی کا پہلا خروج ہے۔ افغانستان میں آنے والی نوجوان نسل نے پہلے ہی قدیم و جدید علمائے کرام کی تصانیف کے مطالعے سے عالم اسلام کے تحرکات کو تبدیل کرنے کے طریقوں پر کام کرنا شروع کر دیا تھا، مکہ محاصرہ نے اس عمل کو بڑھاوا دیا۔ افغانستان سے روسی انخلا کے بعد افغانستان میں لڑنے والے نوجوان جنگجوؤں نے تمام مقبوضہ مسلم خطوں کو مغرب کے وجود اور اثر سے آزاد کرانے اور خلافتِ اسلامیہ کے احیا کے لیے عالمگیر تحریکِ مزاحمت القاعدۃ الجہاد کی بنیادیں رکھیں۔ تاہم انہیں یہ خیال دامن گیر ہوا کہ مغرب کا مؤثر طریقے سے مقابلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جدید اسلامی ریاستوں کے مجموعی عمل اور سوچ کے اعتبار سے ان کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی بحث چھیڑی جانی چاہیے۔ مسلم دنیا کو دو گروپوں میں بانٹنے اور پھر القاعدۃ کی چھتری تلے اسلامی معاشروں کی تشکیلِ نو کرنے کر لیے جدوجہد کا آغاز کیا گیا تاکہ دستیاب وسائل کو اپنی گرفت میں لے کر عالمِ اسلام کے اپنے معاملات میں خود مختاری کو یقینی بنایا جائے۔ اس نظریاتی دعوے سے القاعدۃ نے تین نتائج کی توقع رکھی:

۱۔ مسلم حکمرانوں، مسلم فوجوں اور مسلمان عوام پر دباؤ پڑے گا کہ وہ مغرب اور اس کے اتحادیوں سے تعلق ختم کریں اور خلافتِ اسلامیہ کے قیام اور مسلم دنیا کے مقبوضہ خطوں کی آزادی کے اسلام پسندوں کے مقصد کی حمایت کریں۔

۲۔ مسلم معاشروں میں اس حد تک قطبیت پیدا کر دی جائے کہ ان کی حکومتوں کی مسلم مزاحمتی تحریکوں کی مخالفت میں مغربی افواج کی حمایت اس قدر کمزور ہو جائے کہ بالآخر بے اثر ہو جائے۔

۳۔ معاشرے کے اسلام پسند عناصر فتح یاب ہوں اور براہِ راست مغربی اجارہ داری کے خلاف تن کر کھڑے ہو جائیں اور مسلم خطوں کی آزادی اور خلافت کے تحت عالمی اسلامی سیاست کا قیام عمل میں لائیں۔

ان تینوں میں سے کوئی ایک نتیجہ بھی القاعدۃ کے لیے قابل قبول تھا۔ القاعدۃ نے مسلمان ریاستوں اور مسلم معاشروں میں تفریق اور عالمی معاملات میں ان کے طرزِ اختلاف کو نمایاں کیا۔ القاعدۃ نے واضح کیا کہ مسلم ریاستیں جدوجہد کے ایک ہی طریقے پر چل رہی ہیں اور یہ طریقہ بعد از خلافت پیدا ہونے والے واقعات کا فطری نتیجہ ہے۔ ۶۶۱ ہجری کے بعد اسلامی خلافت کا ادارہ راست بازی کے نمونے کے بجائے ایک علامت بن کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی آخری عثمانی خلیفہ تک خلافت کے ادارے نے مسلمانوں کے مجموعی مفادات خاص طور پر اسلامی سرزمینوں کے دفاع کے لیے مسلمانوں کو متحد کیے رکھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے بعد زیادہ تر مسلم ریاستوں پر مغرب نے قبضہ جما لیا۔ اگرچہ بعد میں وہ آزاد ہو گئیں لیکن ان کے طریقِ حکومت مغربی رہے اور ان کی خارجہ پالیسیاں مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے بنتی رہیں۔

اگرچہ زیادہ تر عربوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اس کی ترک شناخت کی وجہ سے خوشی کا اظہار کیا لیکن برطانوی ہند میں عالم اسلام کی سب سے بڑی آبادی نے خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے پر غم کا اظہار کیا۔ اس وقت ڈاکٹر محمد اقبالؒ ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور انہیں یاد دہانی کرائی کہ وہ ایک قوم ہیں اور انہیں غیر ملکی قابض فوجوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا چاہیے۔ اقبالؒ جدید مسلم ریاستوں میں مغربی طرزِ جمہوریت کے بھی مخالف تھے۔ مصر میں اخوان المسلمون اور جنوبی ایشیا میں جماعتِ اسلامی نے بالترتیب ۱۹۲۰ اور ۱۹۳۰ سے اقبالؒ کے پیغام کو آگے پھیلایا۔ اسی طرح جب کئی مسلم اکثریتی ریاستیں خلافتِ عثمانیہ سے الگ ہوئیں تو ان کی اسلامی حیثیت کے بارے میں سوالات اٹھائے جانے لگے۔ مگر یہ سوالات القاعدۃ کے کفر کے فتاویٰ کی نسبت بڑا دھیما لہجہ لیے ہوئے تھے۔ اپنے وقت میں اسلامی تحریکوں کے ممتاز عالم اور جماعتِ اسلامی کے بانی سید مودودی نے فتویٰ دیا کہ:

> اگر ایک اسلامی معاشرہ شعوری طور پر شریعت قبول کرنے سے انکار کر دے اور اپنا آئین اور قوانین بنانے یا شریعت سے متصادم کسی دوسرے نظام سے مستعار لینے کا فیصلہ کرے تو ایسا معاشرہ اللہ سے اپنا وعدہ توڑ دیتا ہے اور اسلامی کہلانے کا حق ختم ہو جاتا ہے۔

مولانا مودودی اور سید قطب ایسے اسلامی تحریکوں کے مبلغین نے واضح طور پر بیان فرما دیا کہ مسلم معاشروں میں اسلامی قوانین کلی حیثیت سے نافذ ہونے چاہئیں تاہم ان کا اندازِ بیان اتنا براہِ راست، سخت اور محاذ آرائی لیے ہوئے نہیں تھا جتنا کہ ۱۹۷۹ کے مکہ محاصرہ کے بعد ہوا۔ اس سے پہلے اسلامی تحریکیں خلافت کے اسلامی نظامِ سیاست، اسلامی قوانین کے نفاذ اور مسلم خطوں کی آزادی جیسے مسائل کا سامنا کر رہی تھیں۔ لیکن ۱۹۷۰ کی دہائی میں

مصری اسرائیلی امن معاہدے کے نتیجے میں فلسطینیوں پر اردن اور مصر میں ہونے والے ظلم نے مسلم دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ جیسے جیسے کئی دوسرے مسلمان ممالک نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے اور مسلم تحریکوں کو دبایا جانے لگا تو یہ بے چینی بڑھنے لگی، خاص طور پر جب ۱۹۹۰ میں سعودی عرب نے امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدہ کیا اور امریکی فوج کو ملک میں آنے کی دعوت دی۔ تب سعودی حکومت نے ہر اُس عالم دین کا تعاقب کیا جس نے اس معاہدے کی مخالفت کی۔ یہ نزاعی صورتحال اس وقت نقطۂ عروج پر پہنچی جب امریکہ نے ۲۰۰۱ میں امارتِ اسلامیہ افغانستان (طالبان کی اسلامی حکومت) پر چڑھائی کی، جسے اکثر علما اسلامی ریاست کے طور پر جانتے تھے۔ افغانستان پر امریکی حملے کی بہت سے مسلمان ممالک بشمول ہمسایہ ملک پاکستان نے بھی حمایت کی۔ اس کے بعد امریکہ نے ۲۰۰۳ میں عراق پر حملہ کر دیا اور اس حملے کی بھی سعودی عرب، قطر اور کویت جیسے مسلمان ممالک کی حمایت نے صورتحال کو اور گھمبیر (یا واضح) کر دیا۔

القاعدۃ نے ۲۰ نومبر ۱۹۷۰ کے مکہ محاصرہ کے امیر جہیمان ابن سیف العتیبی کو کبھی بھی ایک لیڈر یا عالم نہیں مانا۔ نہ ہی القاعدۃ نے جہیمان کے مہدی محمد بن عبد اللہ القحطانی کو حقیقی مہدی یا مسلمانوں کا نجات دہندہ تسلیم کیا۔ تاہم القاعدۃ قیادت نے اس بھولے بسرے محاصرے کو ایسے واقع کے طور پر لیا جس نے ہر کہیں اسلام پسندوں کو بیدار کیا اور اسلام کے تصور خروج کو دوبارہ زندہ کیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ابن علی رضی اللہ عنہ نے اموی حکمران یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف پہلا خروج کیا جب یزید نے مسلمانوں کی اکثریت کی مرضی کے خلاف وراثتی طور پر خلافت سنبھال لی تھی، اموی اور عباسی خلافتوں میں بھی خروج کا سلسلہ جاری رہا لیکن حکومتوں کے تخت الٹنے میں ناکامی ہوتی رہی۔

القاعدۃ نے جدید دور میں اسلامی حکومتوں اور مغرب کے درمیان تعلقات اور اتحاد کو ختم کرنے کی حکمت عملی پر غور کیا اور مغربی ثقافت، تہذیب اور عالمِ اسلام پر مغرب کے اثر کو ختم کرنے کے لیے ایک طاقتور مسلم تازیانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ جہیمان کے خروج کو سعودی حکومت نے (پاکستانی اور فرانسیسی کمانڈوز کی مدد سے) دبا دیا تھا لیکن اسلامی تقویم کی چودھویں صدی کے پہلے دن رونما ہونے والے اس واقعے نے مسلم عسکریت پسندوں کے ذہنوں پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ خلافتِ عثمانیہ کے بعد والی مسلم حکومتیں مغربی مفادات کے دفاع میں اگلے مورچے سنبھالے ہوئے ہیں لہٰذا ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ سعودی حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے لکھی جانے والی تحریریں معاصر عالم اسلام اور اس کے مغرب کے ساتھ تعلقات کا جائزہ لینے میں القاعدۃ کے لیے بنیاد بن گئیں۔ القاعدۃ نے ایک ایسا جدلیاتی طریقہ وضع کیا جو بالآخر زمانہ آخر کی لڑائیوں کے لیے ضروری حالات پیدا کر دے۔

دراصل یہ محاصرہ ایک اہم وقت پر ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب تقریباً ہر مسلم اکثریتی علاقے میں مسلمان علماء کی تحریریں اسلامی تحریکوں کو انقلابیوں کی ایسی نسل تیار کرنے پر مائل کر چکی تھیں جو غالب نظام سے مکمل طور پر بیزار تھی۔ ان انقلابیوں نے مشرقِ وسطیٰ میں سید قطبؒ، جنوبی ایشیا میں ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی کو پڑھا۔ اگرچہ فقہ کے فروعی مسائل میں ان کا اختلاف تھا تاہم علماء اور ان کے پیروکاروں میں متحدہ عالم اسلام کی ضرورت پر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مثلاً سید قطب ایک مصری تھے لیکن ایک ایشیائی سید مودودی سے متاثر تھے اور ان کی تحریروں میں مولانا مودودیؒ کے ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ میں لکھے گئے تجزیے کی گہری چھاپ ہے۔ اسی طرح علی شریعتی ایک ایرانی شیعہ تھے لیکن سید قطبؒ کی تحریروں اور ہندوستانی سنی محمد اقبالؒ کی شاعری سے متاثر تھے۔ نئی اسلامی

صدی کے آغاز میں شروع ہونے والی نصف صدی پر محیط یہ نظریاتی کوششیں بیسویں صدی کے طاقتور واقعات میں مدغم ہوئیں اور آخر کار مسلم اکثریتی ریاستوں اور ان کی خارجہ پالیسیوں کا تاریخی تسلسل اور بنیادی تحرکات تبدیل کر دیے۔

مکہ محاصرہ کا واقعہ ایرانی اسلامی انقلاب فروری ۱۹۷۹ اور افغان قومی اسلامی مزاحمت دسمبر ۱۹۷۹ کے دوران میں پیش آیا۔ ایران، افغانستان اور امریکہ میں ایک ہی سال میں ہونے والے ان تینوں واقعات کے ادغام نے اس حد تک زمین تیار کر دی کہ افغانستان میں مسلح جہاد کی طرف پوری دنیا کے مسلمان جوان کھنچے چلے آئے جبکہ ایرانی اسلامی انقلاب مغرب مخالف اسلامی حکومت کا ایک نمونہ بن گیا۔ قصہ مختصر، ۱۹۷۹ کے اختتام تک دنیا بدل چکی تھی اور مغربی اجارہ داری کا مقابلہ کرنے کے لیے عالمی افق پر نئی قوتیں جنم لے چکی تھیں۔ ۱۹۷۹ کے مکہ محاصرہ نے اس تبدیلی کو جدلیاتی عمل میں بدلنے کے لیے عمل انگیز کا کام کیا۔ وہابی سعودی حکومت کے خلاف اس ناکام کوشش نے افغانستان میں لڑنے والے اسلامی عسکری حلقوں میں بھی اسلامی حکومتوں کے بارے میں علمی بحث چھیڑ دی۔ ان عسکری حلقوں میں اب یہ بحث چل رہی تھی کہ مسلم حکومتیں صرف اس حد تک اسلامی اقدار کو فروغ دیں گی جہاں تک ان اقدار سے ان کے اپنے مفادات پر زد نہ پڑے۔ آخر کار اسلام سے تعلق ختم ہو جائے گا اور یہی اقدار مغربی مفادات سے ہم آہنگ ہو جائیں گی۔ ۱۹۷۹ کے مکہ محاصرہ نے کسی انقلاب کی بنیاد نہیں رکھی کیونکہ باغیوں کی تعداد چار یا پانچ سو تھی اور اتنی طاقت سے وہ سعودی حکومت کا تخت نہیں الٹ سکتے تھے، لیکن اس واقعے نے متعلقہ سوالات کو منظرِ عام پر ضرور کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس واقعے نے القاعدۃ کی اگلی نسل کے کارندوں کو مستقبل کی جدوجہد کے لیے علمی بنیادیں بھی فراہم کیں۔

اس ناکام کوشش اور جہیمان کے قتل کے بعد اس کے سات خطوط جو ۱۹۷۸ میں ایک کتابچے کی شکل میں چھاپے گئے تھے، عرب دنیا میں بڑے پیمانے پر تقسیم کیے گئے۔ سبع رسائل میں حضرت محمد ﷺ کی اسلام کے لیے کوششوں کی روشنی میں طریقہ کار وضع کیا گیا تھا۔ ان میں لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا، انہیں منظم کرنا اور غلبۂ اسلام کی تحریک کے لیے ایک محفوظ ٹھکانا حاصل کرنے کے لیے ہجرت کرنا شامل تھا۔ جہیمان نے علمائے سلف کی تحریروں سے واضح کیا کہ علماء نے بدعنوان قیادت کا تخت الٹنے کا حکم دیا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مسلم قیادت عرب کے قبیلہ قریش سے ہو اور مسلمان اس کا چناؤ کریں۔ انہوں نے قرآن و سنت کے مطابق اسلامی عقیدے پر عمل کرنے پر زور دیا نہ کہ علماء کی سخت تفسیروں اور غلط تعلیمات پر۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو نصیحت کی کہ موجودہ غالب سیاسی و معاشرتی نظام سے دور ہو جائیں اور سرکاری عہدے قبول نہ کریں۔ جہیمان کا عقیدہ تھا کہ مہدی علیہ السلام حضرت محمد ﷺ کی نسل سے ہوں گے اور بدعنوان قیادت کے خلاف بغاوت کی قیادت کریں گے۔ انہوں نے سعودی عرب کو محمد بن عبد الوہاب کی تعلیمات کے مطابق بنانے کو اپنا ہدف بنایا، محمد بن عبد الوہاب کی پشت پناہی سے آلِ سعود نے حجاز پر قبضہ جمایا تھا۔ عبد الوہاب نے توحید پر خاص زور دیا اور شیعہ رسومات کا رد کیا۔ جہیمان نے موسیقی اور ٹی وی کی بھی مذمت کی اور سب سے اہم یہ کہ سعودی عرب میں ایک ایسی اسلامی ریاست کے قیام کی تجویز دی جس کا تمام غیر مسلم ریاستوں سے کوئی علاقہ نہ ہو۔

جہیمان کی تعلیمات نئی نہیں تھیں۔ بیسویں صدی کی سینکڑوں مسلم تنظیمیں اسی طرح کے نظریات پیش کر رہی تھیں۔ جہیمان اور دوسری تنظیموں میں فرق یہ تھا کہ جہیمان نے لکھا اور کارروائی سے پہلے اپنی جماعت منظم کی۔ ۱۹۸۰ کی دہائی میں افغانستان میں لڑنے والے عرب جوانوں میں سبع رسائل کے لیے ایک خاص کشش تھی۔ اس کی جلدیں عرب

مجاہدین کے کیمپوں میں تقسیم کی گئیں اور یہ ان کے لیے اہم ترین سیاسی رہنمائی بن گئیں؛ جس طرح چیئرمین ماؤ کی سرخ کتاب کمیونسٹوں کے لیے رہنمائی تھی۔ اس طرح مسلم اکثریتی علاقوں کے معاملات پر سیاسی بحث شروع ہوئی۔ بدعنوانی، غیر اسلامی شعار اور مغربی حکومتوں سے اتحاد جیسے مسائل کا فوری جائزہ لیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عرب جنگجوؤں نے بعض پہلوؤں سے جہیمان پر تنقید بھی کی۔ مثال کے طور پر انہوں نے جہیمان کے محمد بن عبد اللہ القحتانی کو مہدی بنانے پر اعتراض کیا اور اس کے بری طرح تیار کیے گئے آپریشن پر بھی تنقید کی گئی کہ یہ آپریشن نہایت عجلت میں کیا گیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جہیمان کے نظریات نے عرب جنگجوؤں اور ان کی آئندہ سیاسی حکمت عملی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس بغاوت نے مسلمان معاشروں کے تضادات کو نمایاں کیا اور مسلم ریاستوں میں قطبیت کے عمل کو تیز کیا۔

بعد از خلافتِ عثمانیہ عالم اسلام اور مغرب کے درمیان اہم تنازعہ فلسطین کا رہا ہے۔ اسلام میں ارضِ حجاز کے بعد فلسطین دوسری مقدس سرزمین ہے اس لیے پوری مسلم دنیا کے لیے یہ اہم مسئلہ رہا ہے۔ بہت سے اسلامی اداروں خاص طور پر مؤتمر عالمِ اسلامی، رابطہ عالم اسلامی اور اسلامی ممالک کی تنظیم میں اسے خلافت جتنی اہمیت حاصل ہے۔ فلسطین کے مسئلے پر عرب حکمرانوں کی طرف سے اپنائی گئی سیاسی اور عسکری پالیسیوں پر اسلامی جنگجوؤں نے ہمیشہ تنقید کی۔ عرب اسرائیل جنگوں میں عربوں کی شکست کا باعث یہی بدعنوان حکمران تھے جبکہ مصر اور اسرائیل کے درمیان امن معاہدہ ایک دکھتی رگ تھا۔ جنگجوؤں نے ان پیش رفتوں کو جہیمان کے سبع رسائل کی نظر سے دیکھا اور مسلم اکثریتی ریاستوں کو مرتد قرار دے کر ان کے نظامِ حکومت کو رد کیا۔ پھر انہوں نے ان حکمرانوں کے خلاف خروج کی ممکنہ جوابی صورتیں وضع کیں۔

عرب ریاستوں کے حکمرانوں اور اسلامی جنگجوؤں کے درمیان قتل و غارت کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ مصر اسرائیل معاہدے اور سفارتی تعلقات کی بحالی کے بعد مصر میں بغاوت کی ایک نئی لہر اٹھی۔ یہ صرف چند ایک پر تشدد واقعات تک محدود نہیں تھی۔ مصر کے اسلامی جہاد گروپ نے انور سادات، جسے جنگجوؤں نے اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے کے بعد مرتد قرار دے دیا تھا، کو ہٹانے کے لیے ایک جماعت بنائی۔ اس منصوبے کے مطابق قاہرہ کے اہم مقامات پر قبضہ کر کے انور سادات کو قتل کیا جانا تھا۔ مختلف دستوں کو مختلف ذمہ داریاں دی گئیں۔ لیکن بغاوت سے پہلے ہی خبریں باہر نکلنے سے سینکڑوں جنگجو گرفتار ہو گئے۔ اس کے باوجود خالد اسلامبولی کی قیادت میں ایک خفیہ دستے نے انور سادات کو فوجی پریڈ میں قتل کر دیا۔

۱۹۸۰ کے وسط میں عالم اسلام میں تضادات مزید وسیع ہو گئے تھے۔ مسلم اکثریتی ریاستوں کے زیادہ تر حکمران قوم پرست عرب بادشاہ تھے جو مغربی طرزِ جمہوریت کی طرف مائل تھے، مجموعی پر اپنی بد عنوانیوں اور بری حکمرانی کی وجہ سے اپنی عوامی حمایت کھو چکے تھے۔ اس دوران وہ مسلمان گروپ متحد ہو گئے جن کے ساتھ مشرق وسطیٰ اور کسی حد تک جنوبی ایشیا میں برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اخوان کی قیادت سعودی عرب، کویت، قطر اور متحدہ عرب امارات میں غریب الوطن ہو چکی تھی اور اس کے ارکان جو پیشہ ور ماہرین مثلاً ڈاکٹر، انجینئر اور استاد تھے، شمالی امریکا اور یورپ منتقل ہو گئے اور نئے تناظر سے اسلامی مفاد کے لیے کام شروع کر دیا۔۱۹۷۹ میں افغانستان میں اسلامی جنگجو تیزی سے اپنے قدم جما رہے تھے اور پاکستان میں اسلام پسند جنرل ضیاء الحق سابق وزیر اعظم کو پھانسی دے کر فوج کا کنٹرول سنبھال چکا تھا۔ ضیاء الحق نے ملک میں اسلام کاری کی اور شدت پسند اسلامی مزاحمتی گروپوں کی سرپرستی کی۔ پاکستان روسیوں کے خلاف مزاحم مجاہدین کا محفوظ ٹھکانا تھا۔ ضیاء الحق نے

ملک میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی قائم کی اور اخوان سے منسلک متشدد علماء کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ ان میں ایک فلسطینی ڈاکٹر عبداللہ عزام بھی تھے جنہوں نے بعد میں افغانستان میں عرب جوانوں کی بھرتی اور صف آرائی کے لیے مکتب الخدمت قائم کیا۔ ۱۹۸۰ کے وسط تک اخوان، فلسطینی مزاحمتی تحریکوں، برما اور فلپائن کے علیحدگی پسند گروپوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں داخل ہو چکے تھے۔ تاہم ان کا اصل مقصد ڈاکٹر عبداللہ عزامؒ اور دوسرے اساتذہ کے حلقوں میں شامل ہو کر مغربی تسلط کے خلاف عالمی اسلامی جدوجہد میں حصہ لینا تھا۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی سے یہ طالب علم پشاور میں مکتب الخدمت اور وہاں سے افغانستان چلے گئے۔ اس طرح ہزاروں مسلمان نوجوانوں نے فنِ حرب میں مہارت، اسلامی نقطۂ نظر سے تازہ سوچ اور جدوجہد کو اگلی سطح تک پہنچانے کے لیے سیاسی بصیرت حاصل کی۔ اس انقلابی سیاسی فضا نے انقلابی مسلمانوں کی نئی نسل پیدا کی۔ عالمی افق پر کچھ اور دوسرے واقعات ہوئے جن سے جنگجوؤں کے مسلم اکثریتی ریاستوں کے حکمرانوں کے خلاف خروج کے دلائل کو مزید تقویت ملی۔ ان میں سے اہم ترین واقعہ عراق کا کویت پر حملہ ہے۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ سعودی عرب نے عراقی حملے کے ڈر سے امریکی مدد طلب کی اور ملک میں امریکی فوجیں تعینات کر دیں۔ تمام چھوٹی عرب ریاستوں بشمول کویت اور اردن نے امریکی جوابی حملے اور عراق پر حملے اور صدام حکومت پر معاشی پابندیوں کی پرزور حمایت کی۔ گیارہ ستمبر کے بعد افغانستان پر امریکی حملے کی پاکستان نے حمایت کی۔ اس طرح مسلم ریاستی مشینری اور افغانستان کے اسلامی جنگجوؤں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی۔ ۱۹۷۹ کے بعد تمام واقعات کا افغانستان کے عالمی عسکری کیمپوں میں تجزیہ ہو رہا تھا اور جہیمان کے سبع رسائل اس تجزیے کا لازمی جزو تھے۔ تاہم یہ تجزیہ ایک مختلف سطح پر ہو رہا تھا کیونکہ جہیمان

کی نسبت جنگجوؤں کو زیادہ آزادانہ ماحول میسر تھا۔ مکمل اور ہمہ جہت جنگی حکمت عملی تیار کرنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ ان کے پاس اڈے تھے، اسلحہ اور بارود تھا، اور ان وسائل کے ساتھ ان کا جدلیاتی عمل زیادہ بہتر اور زیادہ سوچا سمجھا تھا۔ پھر ان کا تناظر کسی ایک ریاست تک محدود نہیں تھا۔ مغرب کے خلاف عالمگیر لڑائی کے لیے پوری دنیا ان کی نظر میں تھی۔

سابق سوویت کو افغانستان میں شکست ہوئی اور وہ ۱۹۸۹ میں اپنی فوجیں واپس بلانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے ایک کمزور سی کمیونسٹ حکومت چھوڑی جو ۱۹۹۰ کے آغاز میں ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد مجاہدین کی حکومت آ گئی۔ مسلمانوں کے سارے انقلابی گروپ منتظر تھے کہ اب آگے کیا ہو گا۔ عالمی فضا اسلامی انقلابیت کے لیے تیار تھی۔ ۱۹۸۷ کے میں ایک نیا محاذ حماس کے نام سے کھل گیا۔ اس نے اسلامی پرچم تلے فلسطینی تحریک مزاحمت کو پھر سے زندہ کر دیا۔ ۱۹۸۹ کے بعد سے افغانستان میں تربیت پانے والے اسلامی گروپوں نے مقبوضہ کشمیر میں علیحدگی کی تحریک شروع کر دی۔ افغانستان میں تربیت پانے والے ابو سیاف گروپ نے فلسطین میں تہلکہ مچا دیا۔ چیچن علیحدگی پسند بھی افغانستان سے تربیت پا کر گئے اور اپنی مردہ تحریک مزاحمت کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح کی علیحدگی پسند تحریکیں برما اور اریٹریا میں بھی ہلالِ خضریٰ لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہزاروں نوجوان پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش میں جہاد کے لیے تیار ہو گئے۔ برسوں کے اندر ہی پاکستان اور بنگلہ دیش میں اسلامی مدارس کا جال بچھ گیا۔ نئی آزاد ہونے والی مسلم اکثریتی ریاستوں، ملائیشیا، انڈونیشیا، اور یورپ سے طلبہ کا تانتا بندھ گیا۔ وسط ایشیائی ریاستوں میں حزب التحریر جیسے اسلامی گروپوں نے سر اٹھایا۔

پاکستان جو کبھی روس کے خلاف افغان مزاحمت میں سٹریٹجک میدان تھا، اسلام پسندی کی اس نئی لہر سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ پاکستان میں اسلامی مدارس روایتی قسم کے

تھے لیکن نئے اسلامی رجحانات نے طلباء کی ایک مختلف نسل تیار کی۔ ان طلباء کو روسیوں کے خلاف لڑنے کا موقع ملا تھا اور ان کا خون گرم تھا۔ یہ طالب علم بعد میں ان مدارس کے اساتذہ بنے اور مدارس کو مراکزِ تعلیم و تعلم کی بجائے اسلامی انتہا پسندی کے اڈوں میں بدل دیا۔ اس کی ایک مثال بنوری ٹاؤن کراچی کا جامعۃ الاسلامیہ ہے۔ بنوری ٹاؤن مدرسے کو دیوبندی مکتبِ فکر میں ہمیشہ سے علومِ اسلامی کے محترم مرکز کا درجہ حاصل رہا ہے۔ یہاں سے کئی نامور فقیہہ اور علماء پیدا ہوئے۔ تاہم ۱۹۹۰ میں اس مدرسے میں انتہا پسندانہ سوچ عام ہو گئی۔ ایسا نہیں ہوا کہ مدرسے کا نصاب تبدیل ہو گیا تھا بلکہ ہوا یہ تھا کہ اس مدرسے کے طلباء روس کے خلاف لڑنے کے لیے افغانستان گئے اور وہاں کے شدت پسند مدارس کے طلباء سے اثر قبول کیا۔ ان طلباء میں سے بعض بعد میں بنوری ٹاؤن کے معلم بنے اور اپنے طالب علموں کو اپنے رنگ میں رنگ گئے۔ مثال کے طور پر مفتی نظام الدین شامزئی اس مدرسے میں بطور معلم آئے اور اس مدرسے کی حرکیات بدل کر اسے ایک جہادی ٹھکانہ بنا دیا۔ ۲۰۰۴ میں آپ کی شہادت کے بعد یہ مدرسہ پھر مسندِ علم وارشاد بن گیا۔ جامعہ فاروقیہ کراچی اور اکوڑہ خٹک کی تاریخ بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔

۱۹۹۴ تک اسلامی مدارس کے افغان طلباء افغان جنگی سرداروں اور ان کی بدمعاشیوں کے خلاف سخت مؤقف اپنا چکے تھے۔ ۱۹۹۶ تک وہ امارتِ اسلامیہ کا پرچم بلند کر چکے تھے۔ اس سے پاکستان میں مساجد و مدارس کی انقلابیت کا عمل تیز ہو گیا۔ تاہم ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کے درمیان ان تمام واقعات نے براہِ راست القاعدۃ کو کوئی خاص فائدہ نہیں دیا اگرچہ القاعدۃ ایسا کر سکتی تھی۔ پاکستان کی فوجی قیادت نے تیزی دکھائی اور افغان طالبان اور ان کی کابل حکومت پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ پھر پاکستانی فوجی قیادت نے اسلامی مدارس کے ساتھ تعلقات بڑھائے اور آئی ایس آئی نے جہادی تنظیموں کو کنٹرول

کرنے اور ان کی سرگرمیوں کو انڈیا کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پاکستانی قیادت نے افغانستان کو اپنا سٹریٹجک خطہ قرار دیا اور اپنے ملکی سکیورٹی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کشمیری علیحدگی پسند گروپوں کی تربیت کے لیے اڈے قائم کیے۔ عراق میں صدام حکومت، ایران کی اسلامی حکومت، شامی حکومت اور سعودی بادشاہت، فلسطینی اسلام پسندوں اسلامی جہاد اور حماس سے قریبی تعلقات قائم کیے۔ القاعدۃ کی نظر میں اسلامی گروپوں اور مسلم ممالک کے مقتدر طبقوں کا یہ گٹھ جوڑ اور افغان جہاد کے بعد ترقی کے لیے ان کی حکمت عملیاں اور ارادے اسلامی ریاستوں کے اعلیٰ طبقات کا اپنا تسلط مضبوط کرنے کے لیے تھے۔ اس صورتحال میں لازم تھا کہ نئے نئے وجود میں آنے والے اسلامی گروپ ریاستی ڈھانچے سے الگ ہو کر القاعدۃ کے زیرِ عمل آ جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے تکفیر بہترین راستہ تھا۔ وسط ۱۹۹۰ سے نپا تلا ادب شائع کیا گیا۔ اس نئے ادب کی بنیاد قرآنی تعلیمات، حضرت محمد ﷺ کی احادیث مبارکہ اور اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل پر مبنی تھا۔ چودہ صدیوں کے مسلمان علماء اور فقہا کی آراء کو اور فتاویٰ بھی شامل کیے گئے۔ اس ادب میں ان تصورات کا بعد از خلافت عثمانیہ کی معاصر دنیا پر اطلاق کیا گیا۔ عالم اسلام کے لادینی جمہوری نظام، باشاہوں کے ذاتی مفادات اور خارجہ پالیسی کے بارے میں ان کے نظریات کا تجزیہ کیا گیا۔

دلچسپ بات یہ کہ بیسویں صدی کی اسلامی تحریکوں کے پھیلائے گئے ادب کے برعکس، جس کے مطلوبہ قارئین تعلیم یافتہ جوان تھے، القاعدۃ کا مطلوبہ قاری عام آدمی نہیں بلکہ معاشرے کا وہ طبقہ تھا جو پہلے ہی عملی مسلمان تھا۔ القاعدۃ نے ان اسلام پسندوں کو اس بات پر مائل کرنے پر کام کیا کہ عالم اسلام میں غالب عصری عقائد، نظام اور خارجہ پالیسیاں کفریہ ہیں، لہٰذا ان کے خلاف بغاوت شروع کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نئے ادب میں

محمد بن عبد الوہاب کی طرح بنیادی توحیدی اقدار کو فروغ مقصد کے طور پر نہیں لیا گیا بلکہ اس ادب میں محمد بن عبد الوہاب اور امام ابنِ تیمیہؒ کے خیالات کو یکجا کر کے وسیع سیاسی تناظر میں بیان کیا گیا۔

اسلامی مزاحمت کی ایک فطری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی حکمتِ عملی اور جدوجہد ہمیشہ نظریاتی تحریروں سے جڑی ہوتی ہے۔ خلافتِ عثمانیہ کے زوال کے دوران محمد عبدہ مصری، سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبالؒ جیسے دانشوروں نے پان اسلام ازم کی تبلیغ کے لیے کام کیا جس سے نئی اسلامی تحریکوں نے جنم لیا۔ جو ادب انہوں نے تخلیق کیا اس نے بالواسطہ طور پر پچاس سالہ جدوجہد کے بعد واقعات کے وقوع کو ایرانی انقلاب، افغان جہاد اور مکہ بغاوت میں بدل دیا۔ اسی طرح جنوبی ایشیا میں مغلوں کے زوال کے بعد شاہ ولی اللہؒ کی تحریروں میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی زوال کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا جس نے سید احمد بریلویؒ کی سکھوں کے خلاف جہادی تحریک کو بنیاد فراہم کی۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے سکھوں کے خلاف جہاد سے پہلے تقویۃ الایمان لکھی۔ اس کتاب نے اسلامی عقائد، ثقافت اور روایات کی بظاہر نئی تعبیر کی اور اس وقت کے مسلمان معاشرے میں خاصا بڑا تنازعہ کھڑا کر دیا۔ اس کتاب کے لکھنے کی ایک خاص وجہ تھی؛ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہمیشہ وسط ایشیا کے حملہ آور سمجھا جاتا تھا۔ ان کی مقامیت اور قبولیت اکبر بادشاہ کے دور میں شروع ہوئی۔ فارسی کے ساتھ ایک نئی ہندوستانی زبان اردو بھی متعارف ہوئی۔ اردو پر مقامی زبانوں کے اثرات تھے۔ اسی طرح مسلمان سکھ اور ہندو معاشروں کے اثرات بھی قبول کر چکے تھے۔ یہ اثرات مسلمان اقلیتوں میں سرایت کر گئے اور ہندوؤں کے بھجنوں کی طرز پر قوالی جیسی رسم مسلم روایت کا حصہ بن گئی۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے درمیان فکر و عمل اور رہن سہن کے فرق معدوم ہونا شروع ہو گئے۔

تحریک مجاہدین کے داعی شاہ اسماعیل شہیدؒ کو سکھوں کے خلاف لڑنے کے لیے زمین ہموار کرنا تھی۔ تقویۃ الایمان میں انہوں نے عقیدے کی از سرِ نو تشریح کی اور ہندو معاشرے سے در آنے والے تمام اثرات کی نفی کی اور ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ دوسری معاشرتوں سے کس طرح مختلف ہیں۔ امتیازیت کا یہ احساس ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف کھڑا کرنے کے لیے ہمیشہ سے لازم رہا ہے۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے مشرک ہندوستان میں اسلامی توحید پر زور دے کر اس مشن کی تکمیل کی۔ اس حکمت عملی سے آپ ہزاروں لوگوں کو راغب کرنے میں کامیاب ہو گئے جو پنجاب میں سکھ حکومت کے خلاف لڑے۔ اس طرح کے اہداف حاصل کرنے کے لیے القاعدۃ ماضی کی جہادی تحریکوں سے کچھ مختلف نہ تھی۔ سید قطبؒ کے ادب نے القاعدۃ کو بنیاد فراہم کی لیکن اپنی جدوجہد شروع کرنے سے پہلے اس کے داعیان نے عقیدے کی نئی تعبیر کی۔ تاہم اب حالات سید احمد بریلویؒ کی تحریک کے وقت سے مختلف تھے۔ اس وقت مغل حکومت روبہ زوال تھی اور اس کی عملداری اصلاً ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے القاعدۃ کو ابن تیمیہؒ کے زیادہ سخت نظریات اپنانے تھے۔ ابن تیمیہؒ منگولوں کے خلاف تحریک مزاحمت کے سپہ سالار اور داعی تھے۔ ابن تیمیہؒ نے بھی توحید کی اقدار پر زور دیا اور عقیدے کی نئی تعبیر کی تھی۔ آپ نے منگول روایات کے مقابلے میں اسلامی امتیاز کو واضح کیا اور مسلمانوں کو بغداد پر منگول قبضے کے خلاف لڑنے پر تیار کیا۔

ابتدائی طور پر القاعدۃ نے محمد بن عبدالوہاب کا ادب استعمال کیا جس میں اسلام کی توحیدی اقدار پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن وہاب کی تحریروں میں ایک نقص تھا۔ وہ یہ کہ اگرچہ یہ تحریریں الولاء والبراء جیسے بنیادی عقائد کا اظہار کرتی تھیں لیکن وہاب آل سعود کا مبلغ تھا جس نے مسلمان خلافتِ عثمانیہ سے جنگ لڑی تھی۔ کوئی بھی شخص اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا

کہ عبد الوہاب کو مسلمان عوام کو تصوف پسند اسلام (جسے عبد الوہاب بدعت و شرک کہتے تھے) کے خلاف اکسا کر خلافت عثمانیہ کے خلاف لڑانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس طرح عبد الوہاب نے، شاید غیر ارادی طور پر، خلافت کے زوال میں مدد دی اور نو آبادیاتی راج کی راہ ہموار کی۔ لہٰذا القاعدۃ نے محسوس کیا کہ اسے ایک مختلف ادب کی ضرورت ہے جس میں اسلام کے امتیازی وصف توحید کو جدید سیکولر اور مشرک جمہوریت و بادشاہی کے ساتھ متصادم کیا گیا ہو اور جو مغرب کے خلاف اس کی جنگی کشمکش کو فروغ دے۔

اسلامی عقیدے کی یہ نئی تعبیر افغانستان میں کمیونسٹ شکست کے بعد شروع ہوئی۔ نئے ادب میں شرک اور مغربی سیاسی نظام کے علی الرغم توحید کے امتیازی وصف کو بیان کیا گیا۔ اس ادب کا مقصد مسلمانوں کو مغربی ایمانیات اور اقدار سے دور کرنا تھا۔ نتیجہ یہ کہ جو معاشرے مغرب سے متاثر تھے وہاں پر تفریق پیدا ہونا عین واضح تھا۔ گیارہ ستمبر تک، جس نے جنگ کے آغاز کا اعلان کیا، القاعدۃ کے نئے ادب کے ذریعے اسلامی مزاحمت کی نظریاتی بنیادیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ گیارہ ستمبر کے واقعے نے پوری دنیا میں اختلاف پیدا کیا اور ابتدائی طور پر دنیا کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا؛ ایک وہ جو امریکا کے ساتھ تھے اور دوسرے وہ جو امریکا کے مخالف تھے۔ اس تقسیم کے ان مسلمان معاشروں پر اثرات ہوئے جہاں پر مقتدر طبقے مغرب کے قریب تھے۔ اس فیصلہ کن مرحلے کے بعد مقتدر مسلم طبقات اور عوام تقسیم ہو گئے۔ آنے والے برسوں میں القاعدۃ نے امریکا کی جنگ میں مسلمان حکومتوں کی حمایت کمزور کرنے اور مسلم معاشروں میں بغاوتوں کی راہ ہموار کرنے کے لیے اس تقسیم کو مزید تیز کرنے پر کام کیا۔ سٹریٹجک محاذ پر القاعدۃ کامیابی سے گیارہ ستمبر کے دن امریکا پر ضرب لگا چکی تھی۔ امریکا نے افغانستان پر حملہ کیا اور بقول القاعدۃ جال بچھایا جا چکا تھا۔ تاہم یہ حکمت عملی ناکام ہو جاتی اگر القاعدۃ گیارہ ستمبر کے بعد مسلمان معاشروں میں نظریاتی تفریق

کے عمل کو مزید تیز نہ کرتی۔ القاعدۃ نے مسلح افواج میں اسلامی ذہن رکھنے والے افسروں، مذہبی جماعتوں اور مدارس میں بااثر علماء شامل کر کے اس مشن کو جاری رکھا۔ پھر اس کی توجہ افغانستان میں امریکا کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے وسائل جمع کرنے پر ہو گئی۔

القاعدۃ کے تصنیف شدہ ادب سے وابستہ علماء نے ایک مسلمان کے لیے کفر و ایمان کے اصول وضع کیے لیکن جدلیاتی محاذ پر بہت سے دوسرے ذہن بھی کام کر رہے تھے۔ القاعدۃ نے گیارہ ستمبر کے متوقع مغربی حملے کے خلاف مسلمانوں میں سیاسی جذبات پیدا کرنے کو اپنا ہدف بنایا لیکن اس بات سے اچھی طرح واقف تھی کہ مسلمان معاشروں میں بھی منقسم ردعمل سامنے آئے گا کیونکہ مسلمان ممالک سیاسی، عسکری اور معاشی لحاظ سے مغرب کے دستِ نگر ہیں۔ سعودی عرب، اردن، پاکستان اور کویت جیسے ممالک میں تو یہ ایک کھلی حقیقت تھی۔ یوں القاعدۃ میں کبھی بھی یہ سوچ نہیں تھی کہ اگر امریکا نے گیارہ ستمبر کے جواب میں حملہ کیا تو مغرب کی حمایتی مسلمان حکومتیں غیر جانبدار رہیں گی۔ القاعدۃ کو سو فیصد یقین تھا کہ واشنگٹن نے القاعدۃ کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا تو عالم اسلام کے پاس واشنگٹن کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ گیارہ ستمبر کے حملے ایک خاص مقصد کے تحت کیے گئے اور وہ مقصد یہ تھا کہ امریکا کو افغان پھندے میں پھنسایا جائے۔ اس کے بعد مسلمانوں میں سیاسی مخالفت جنم لیتی اور بالآخر عالم اسلام اور مغرب میں براہِ راست آمنا سامنا ہو جاتا۔ القاعدۃ کو پتا تھا کہ امریکی جنگی مشینری کو افغان پہاڑوں کی ویرانی میں لانا ناگزیر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کوئی فتح کی علامت نہیں ہو گی۔ مغرب پر فتح پانے کے لیے ایک طویل جدوجہد، منصوبہ بندی اور کامیاب جنگی حکمت عملی درکار تھی۔ اس کے لیے وسائل کی ضرورت تھی اور تمام وسائل مغرب کی حلیف مسلمان حکومتوں کے قبضے میں تھے۔ لہٰذا گیارہ ستمبر کے حملے اور جوابی حملے میں القاعدۃ کی حکمت عملی کا دوسرا اہم ترین ہدف

یہ تھا کہ مسلمان حکومتوں کے مغرب کے ساتھ سیاسی اتحاد کے تضادات نمایاں کر کے انہیں بے وقعت ثابت کیا جائے۔ جب ان مسلمان حکومتوں کی مغرب کے ساتھ اصل وفاداریاں بے نقاب ہوئیں تو القاعدۃ نے انہیں مسلمان عوام سے الگ کرنے کے لیے تکفیر کا ہتھیار استعمال کیا۔ پھر مسلح افواج، مذہبی جماعتوں اور اسلامی مدارس کے ہمدرد طبقات کو مقتدر طبقات کے خلاف فعال کیا گیا اور اس طرح مغرب کے خلاف القاعدۃ کی عالمگیر جنگ میں ان لوگوں کی شمولیت آسان ہو گئی۔

تکفیر کا دوسرا مقصد عالم اسلام کے تمام وسائل اکٹھے کر کے انہیں مغربی قوتوں کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ لیکن القاعدۃ بڑی اچھی طرح جانتی تھی کہ مسلم اکثریتی ریاستوں کی حکومتوں پر غلبہ پانا ایک سست اور تھکا دینے والا عمل ہو گا اور اس کے لیے بہت زیادہ علمی مہارت درکار ہو گی۔ مقصد یہی تھا کہ اسلامی انقلاب لایا جائے اور عالمی جہاد برپا کرنے کے لیے خلافتِ اسلامیہ کا احیا کیا جائے۔ عالمی خلافت اسلامیہ کے احیا کے لیے جو جدوجہد ۱۹۲۰ سے ۱۹۷۰ کے درمیان کی گئی وہ نظریاتی تحریکوں کا پہلا مرحلہ تھا جس میں اسلامی ذہن سے مغربی فکر کو ختم کرنے پر کام ہوا۔ تاہم ۱۹۷۰ کے بعد مسلم ممالک میں احیائے اسلام کی تحریکوں نے مغربی جمہوریت سے بددل ہونا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے اسلامی تحریکوں کے داعی سید مودودی جمہوریت کو اسلام کاری کا بہترین ذریعہ قرار دے چکے تھے۔ سید مودودی کا خیال تھا کہ ایک دفعہ اسلامی قوتیں انتخابات کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ نفاذِ اسلام کے لیے آئین میں بنیادی ترامیم کر سکیں گی اور پھر سیاست میں صرف اسلام پسند ہی شامل ہو سکیں گے۔ اس طرح نظام سے سیکولر جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اخوان المسلمون نے بھی ۷۰ کی دہائی میں یہی خیال اپنایا۔ مکہ محاصرہ سے یہ سوچ ختم ہو گئی اور خروج کے نظریات نے تقویت پکڑی۔ یہ نظریات افغانستان کے عسکری کیمپوں میں (جہاں

پر مابعد خلافت جدوجہد کا مکمل جائزہ لیا گیا) ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کی دہائیوں میں پختہ اور بالغ ہو چکے تھے۔

تاہم اس طرح کے خیالات اخوان پہلے ہی پیش کر چکی تھی۔ افغانستان میں عرب جنگجو سید قطبؒ کی تحریریں پڑھ رہے تھے جن میں المعالم فی الطریق سب سے نمایاں تھی۔ اس کے علاوہ عبد الوہاب کی کتب بھی زیرِ مطالعہ تھیں ۔ عبد الوہاب کی تحریریں اب بھی عقیدۂ توحید مضبوط کرنے کا ذریعہ تھیں۔ جنگجوؤں کا مؤقف تھا کہ ایک اسلامی ریاست کے لیے جو قوانین انہوں نے بیان کیے ہیں مسلمان حکومتیں ان پر عمل نہیں کر رہیں۔ دوسری طرف عبد الوہاب کی تحریروں کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کے دور میں لکھی گئی تھیں اور بیسویں صدی میں بہت کم مؤثر تھیں۔ اسی طرح سید قطب کا ادب انقلابی سوچ کی واضح بنیاد تھا لیکن جنگجوؤں نے محسوس کیا کہ اسلامی فکر کی نئی تعبیر کے لیے ایسی تحریروں کی ضرورت ہے جن میں اسلامی اور غیر اسلامی سیاست کے درمیان فرق نہایت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ پھر موجودہ مسلمان حکومتوں کی مغرب کے ساتھ دوستیوں کی وجہ سے ان کی تکفیر کرنے اور القاعدۃ کی حکمت عملی پر عمل کرنے کے لیے ان تحریروں کو مستقبل کی دوستی اور دشمنی کے معیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ افغانستان میں روسی شکست کے بعد عرب جنگجو عالم اسلام میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی سوچ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے فکر و خیالات جمع کیے اور ۱۹۹۴ میں قواعد التکفیر شائع کی۔

تکفیر: تصادم کے مرتب اصول

خلافت کے تحت تمام مسلمان ذات، نسل اور قبیلے سے بالاتر ہو کر ایک امت تھے۔ خلیفہ سیاسی سربراہ تھا۔ سیاسی طور پر دو ہی قومیں تھیں: مسلمان اور کافر۔ مسلمانوں کے تمام

مفادات بطور ایک قوم کے تھے اور دیگر اقوام عالم سے مختلف تھے۔ یہ مسلم سوچ عالم اسلام میں تیرہ سو سال تک غالب رہی لیکن ۱۹۲۰ کی دہائی میں خلافت عثمانیہ کے بعد ختم ہو گئی۔

خلافت عثمانیہ کے زوال کے دوران مغربی نو آبادیات کا ایک طویل دور شروع ہوا جس میں نو آبادیاتی نظام کے تحت حکومت کرنے کے لیے مسلمان ریاستوں کو کئی چھوٹی بڑی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان ریاستوں کی آزادی کے بعد بھی یہ نو آبادیاتی نظام موجود رہا۔ مسلمانوں کو اپنے پرانے سیاسی نظام کی طرف رجوع کرنے ہی نہیں دیا گیا۔ زیادہ تر مسلمان ممالک میں مغربی نو آبادیاتی طاقتوں مثلاً فرانس، برطانیہ اور اٹلی نے مغربی سوچ کی حامل قیادت کو اقتدار منتقل کیا۔ نتیجہ کے طور پر نئی آزاد ہونے والی مسلم ریاستوں نے مغربی نظام حکومت رائج کیا خواہ وہ جمہوریت کی شکل میں تھا یا آمریت کی شکل میں۔ بیسویں صدی کے اختتام تک اسلامی سیاسی نظام، کسی بھی شکل اور ہیئت میں قصۂ پارینہ بنا دیا گیا۔ نئے نظامِ سیاست میں تمام ممالک "قومی ریاستیں" تھیں جن کی بنیاد نسل پرستی تھی۔ عالمی تعلقات کی بنیاد باہمی مفادات کی سودے بازی تھی۔ عالم اسلام بھی اسی عالمی نظام کا حصہ بن گیا۔ مسلم ممالک کی جدیدیت میں شمولیت کو عالمی برادری کی حمایت حاصل تھی جس میں روایتی اسلام پسندوں کو نکال باہر کیا گیا۔ شمالی افریقہ سے ایشیا تک تمام اسلامی ریاستوں نے عالمی سیاست میں رہنے کے لیے مغربی جمہوری اقدار اپنا لیں۔ تاہم مسلم علماء کے ایک بااثر گروہ نے خلافت پر اپنا عقیدہ قائم رکھا اور خود کو اس "جمہوری عمل" سے الگ رکھا۔

۱۹۷۹ میں مکہ محاصرہ سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا اور افغان اسلامی مزاحمت نے انہیں خلافت کی طرف پلٹ جانے کا موقع فراہم کیا۔ دس سال تک جنگجوؤں نے بحث مباحثہ کیا اور بعد از خلافت "بدعات" کا مقابلہ کرنے کے طریقے سوچے۔ اس سے ۱۹۹۰ کی دہائی میں

افغانستان میں کمیونسٹ زوال خوردہ ہوا اور مجاہدین کے دورِ حکومت میں بڑے پیمانے پر نئے ادب کی اشاعت ہوئی۔

ادب جو سوچ بدل دے

عالم اسلام کو کئی مسائل در پیش ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ دوسروں کی تکفیر کرنے کا ہے۔ تاہم وہ لوگ جو علمائے سلف کے قائم کردہ تکفیری معیارات پر پورا نہیں اترتے وہ خارجی گروہ کے راستے پر چلتے ہیں۔ خارجی گروہ اس وقت ظاہر ہوا تھا جب خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں تقسیم ہو گئی اور ان حضرات کے مابین جنگ ہوئی۔ ان دنوں میں خارجی ظاہر ہوئے اور بہت سخت اصول و قوانین بنائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو کافر قرار دیا اور ان دونوں کے قتل کا فتویٰ جاری کر دیا۔ خارجیوں نے تمام بے عمل بے مسلمانوں کی تکفیر کی اور ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ان لوگوں نے الولا والبراء کا عقیدہ اپنایا اور اس کی بنیاد پر یہ حکم لگایا کہ بہت سی روایتی اقدار غیر اخلاقی ہیں۔ تاہم پیغمبر علیہ السلام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی اکثریت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کی حقیقی علم بردار تھی اور ان کا عقیدہ یہ نہیں تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منحرف گروہ کی نشان دہی کر دی تھی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو خبر دار کر دیا تھا کہ وہ ہر مسلمان کے خلاف لڑیں گے لیکن بت پرستوں پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ میرے عہد میں ظاہر ہو جائیں تو میں انہیں قومِ عاد قرار دے دوں۔

بعد ازاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے واضح کیا کہ یہ گروہ قرآن پاک کی وہ آیات مبارکہ جو کفار کے لیے ہیں، ان کا اطلاق سچے مسلمانوں پر کرے گا۔ اب ایک طرف تو خارجی گروہ ہے جو تکفیر کے مسئلے کو نمایاں کرتا ہے اور دوسری طرف جہمیہ اور مرجیہ فرقے ہیں جو تکفیر پر بالکل ہی یقین نہیں رکھتے اور مسلمانوں کا سا نام رکھنے والے سیکولر اور کمیونسٹ لوگوں کو بھی مسلمان ہی کہتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو جب ایک دفعہ قومی شناختی کارڈ جاری ہو جاتا ہے کہ ان کا مذہب اسلام ہے تو یہ لوگ پھر اسلام مخالف قوتوں کے لیے کام کرتے ہیں اور کوئی بھی انہیں اسلام سے خارج کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

(ابو بصیر الطرطوسی، پیش لفظ قواعد التکفیر)

شیخ عبد المنعم مصطفیٰ حلیمہ ابو بصیر المعروف بصیر الطرطوسی ایک شامی اسلام پسند ہیں اور لندن میں مقیم ہیں۔ آپ جہادی تحریک کی رہنمائی کے لیے بنیادی سلفی آراء پیش کرتے ہیں۔ آپ کی کتاب قواعد التکفیر القاعدۃ کے نصاب کا حصہ ہے اور ان اولین کتابوں میں سے ہے جن میں تکفیر اور خروج کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۹۹۴ میں لندن میں لکھی جانے والی یہ کتاب اسلامی عقیدے کی نئی تعبیر کرتی ہے۔ یہ کتاب اسلام کی توحید اور مغربی فلسفے کے شرک میں فرق کو بیان کرتی ہے۔ مغربی فلسفے میں جمہوریت، سیکولرازم اور وہ تمام سیکولر بادشاہتیں شامل ہیں جو وحی کا انکار کرتے ہوئے انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر انحصار کرتی ہیں۔ اس کتاب کا ہدف مسلم اکثریتی ریاستوں میں قطبیت کو فروغ دینا ہے۔ اس کتاب میں مسلم ریاستوں کے جدید اسلامی نظام بشمول خارجی اور دفاعی پالیسیوں کی تکفیر کی گئی ہے۔

طرطوسی نے تمام بنیادی تعریفوں کی وضاحت کی ہے۔ مثال کے طور پر الکفر کی روایتی طور پر مجرد تعریف کی گئی ہے لیکن اس کی وضاحت اگلے درجے کی تعریفوں میں کی گئی ہے۔ یعنی کے کفر کے یہ درجات ہیں:

کفر اکبر، کفر عمد، کفر تکبر، کفر جھود، کفر تہلی

آپ نے ان تمام تعریفوں کی سیاسی تناظر میں وضاحت کی ہے اور کفر کے ان درجوں میں ریاستوں کے ملوث ہونے پر بحث کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ان ریاستوں اور معاشروں کو اسلامی نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح شرک، فسق، ظلم، نفاق، زندقہ، ارتداد، ہوا، موالات اور ایمان جیسی اسلامی اصطلاحات تفصیلاً بیان کی ہیں اور ہر اصطلاح قرآن، احادیث اور علمائے سلف کے اقوال کی روشنی میں واضح کی گئی ہے اور ان کا تعلق جدید دنیا سے جوڑا گیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے سورۃ توبہ کی آیت ۴۵-۴۴ کا حوالہ دیا ہے اور پھر ابن تیمیہؒ کی تفسیر بیان کی ہے کہ

> اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ سے فرماتے ہیں کہ جو کوئی بھی جہاد سے رخصت مانگتا ہے، کافر ہے۔ اگرچہ یہ قرآنی حکم ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوا جو مجبوری کی بنا پر جہاد سے رخصت چاہتے تھے۔ جن لوگوں نے بلا اجازت اپنی مرضی سے جہاد ترک کیا ان کے بارے میں قرآنی حکم اس سے بھی سخت تر ہے"

طرطوسی، ابن تیمیہؒ کی تشریح میں موجود عالمی تناظر کا اضافہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

> وہ لوگ جو جہاد کے خلاف ہیں ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟ یعنی ان لوگوں کے بارے میں حکم جو مجاہدین کو دہشت گرد، مجرم اور غنڈے کہتے

ہیں، وہ لوگ جو جہاد کے لیے فرضی شرائط بیان کرتے ہیں؛ مثلاً یہ کہ جہاد صرف ریاست کے حکم سے ہی جائز ہوتا ہے اور ریاست بھی وہ جو جمہوری نظام حکومت پر قائم ہے اور یہ جمہوری نظام بذاتِ خود غیر اسلامی اور جاہلانہ خیالات پر قائم ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگ منافق ہیں اور عقیدے سے منحرف ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ جو جہاد سے منع کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے اندر احساسِ جوابدہی پیدا کریں، خدا کے دشمنوں کی کسی بھی طریقے سے حمایت سے باز آ جائیں، چاہے یہ حمایت لسانی ہو یا عملی طور پر مجاہدین کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا ہو۔ ایسے لوگوں کو اپنے عقیدے کی تجدید کر لینی چاہیے کیونکہ اگر وہ مسلمان تھے تو ان کا ایمان ضائع ہو چکا۔

طرطوسی کا تکفیر پر ہدایت نامہ اور دوسرا ادب جو ۱۹۹۰ سے بعد میں لکھا گیا، بر محل تھا۔ کیونکہ افغانستان میں مجاہدین فتحیاب ہو چکے تھے اور اب ان کے ٹھکانے بھی تھے۔ اسی طرح کے خیالات تکفیر والہجرۃ نے پیش کیے۔ یہ ساٹھ کی دہائی میں بننے والی ایک خفیہ تحریک تھی جب نصر نے اخوان کے خلاف وحشیانہ طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اس کی قیادت اور کارکنان کا قتل عام کیا۔ شام، مصر، عراق اور لیبیا کی سوشلسٹ حکومتوں نے اسلام پسندوں کو بدمعاشوں اور غنڈوں کے طور پر پیش کیا۔ مجاہدین سعودی عرب، کویت، قطر، امریکہ اور برطانیہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے لیکن ان جگہوں پر پناہ صرف رہائش تک محدود تھی۔ انہیں کسی جدلیاتی عمل میں حصہ لینے کی اجازت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۹۷۹ میں مکہ میں اٹھنے والی لہر نے انتہا پسندانہ سوچ کو مقبول بنا دیا جس نے یہ سوال اٹھائے:

ا۔ کیا وہ شخص مسلمان کہلائے گا جو مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہو لیکن اس کا اسلام پر کوئی ایمان نہ ہو؟

۲۔ کیا وہ ریاست سچ مچ اسلامی ریاست ہو گی جہاں پر لوگوں کی اکثریت خود کو مسلمان ظاہر کرتی ہو لیکن سیاسی طور پر ایک غیر اسلامی آئین کے تحت زندگی بسر کرتی ہو؟

۳۔ کیا وہ ریاست اسلامی ریاست ہو گی جہاں پر اگرچہ اسلامی عبادات ہوتی ہوں لیکن وہ ریاست اسلام کے خلاف غیر مسلم طاقتوں کا اہم ترین حصہ بن گئی ہو؟

تکفیر والہجرۃ اور مصر، شام، عراق، تیونس اور لیبیا کی دوسری خفیہ اسلامی تحریکوں نے جو خیالات پہلے ۱۹۶۰ کی دہائی میں پھیلانے کی کوشش کی تھی، ۱۹۷۹ میں مکہ المکرمہ کے واقعے سے ان میں جان پڑ گئی۔ اتفاق سے جب روس نے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ کو افغانستان پر حملہ کیا تو اسلام پسندوں کو کام کرنے کے لیے ایک ٹھکانہ مل گیا۔ پھر مسلمان نوجوانوں کو افغان بھائیوں کے ساتھ دہریے کمیونسٹوں کے خلاف لڑنے کی عالمگیر دعوت دی گئی، جس میں پاکستان اور سعودی عرب پیش پیش تھے۔ چند ہی برسوں میں مسلمان نوجوانوں نے اسلامی نظام سیاست کے احیا اور مسلم معاشروں میں اپنی جدوجہد ترتیب دینے کے لیے پوری دنیا میں اپنے آزادانہ کیمپ قائم کر لیے۔ ان کا مقصد دوبارہ منظم ہو کر نئے انداز اور نئی سوچ کے ساتھ ایک نئے مقصد کی خاطر اسلام پسند مسلمانوں کے ساتھ جُڑنا تھا۔ پھر انہوں نے عالم اسلام کی مقتدر جماعتوں کے خلاف اپنی ناپسندیدہ حیثیت قائم کی اور اپنی اپنی مسلمان حکومتوں کو مغربی معاشروں اور حکومتوں سے تعلق توڑنے پر مجبور کیا۔ تاہم اس جدوجہد کا حتمی مقصد القاعدۃ کے تحت عالم اسلام میں مغرب کی موجودگی کے خلاف جنگ لڑنا تھا۔ یہ مقصد اب بھی ہے اور رہے گا۔

جس وقت طرطوسی اور دوسرے عرب علماء نے ایمان اور کفر کی تعریف واضح کرنے کے لیے کتابیں لکھیں، اس وقت ہزاروں نوجوان پاکستان، فلپائن، فلسطین، مصر، شام، سعودی عرب، یمن اور دوسرے ملکوں سے افغان جہاد میں شامل ہونے کے لیے پہنچ گئے

تھے۔ ان نوجوانوں نے امریکا مخالف اور حکومت مخالف نظریات اپنائے۔ جب ۱۹۹۴ میں یہ نوجوان خواہ افغانستان چھوڑ چکے تھے یا افغانستان چھوڑنے پر تیار تھے، قواعد التکفیر نے روس افغان جنگ کے بعد بھی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے مضبوط نظریاتی مؤقف فراہم کیا۔

نظریاتی ارتقاء کی ابتدا

مختلف علاقوں میں مسلمان مصلحین کی طرف سے مسلمان معاشروں کے تجزیے میں ۱۹۷۹ کی مکہ بغاوت بھی اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں کئی ایسے مواقع آئے جب مسلمان مصلحین نے مسلمان حکومتوں میں پھیلے غالب نظریات کو چیلنج کیا۔ تاہم ۱۹۷۹ سے شروع ہونے والے اور گیارہ ستمبر کے بعد کے واقعات میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس صورتحال کا تجزیہ بھی منفرد قسم کا ہے۔ یہ فرض کیا گیا کہ دنیا کے تمام مسلمان ممالک مغرب کے حلیف ہیں اور ان کے معاشرے غیر اسلامی عقائد پر چل رہے ہیں لہٰذا ان کو اپنا حال اور مقام بدلنے کی دعوت دی گئی۔ جنہوں نے انکار کیا انہیں مرتد قرار دیا گیا اور ان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا۔ یہ سخت ترین مؤقف تھا جو چودہ سو سال کی تاریخ میں پہلی بار اپنایا گیا اور اسلامی عقیدے کی معاصر حالات اور مسائل کے تناظر میں تشریح کی گئی۔ یوں پہلی مرتبہ نئے عالمی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت مرتد قرار پائی۔ تاہم بنیادی طور پر یہ فکر نئی نہیں تھی۔ اس مؤقف سے اسلام کے آغاز سے لے کر اب تک کی اصلاحی تحریکوں کے طویل المدتی تجزیے کو اظہار ہوتا ہے جو مسلمان علماء کے ذہنوں میں آہستہ آہستہ واضح ہوا۔

عالم اسلام میں پہلے اموی اور پھر عباسی ادوارِ حکومت میں مسلمان بادشاہوں کا رجحان اسلام کی عامیانہ تشریح کی طرف رہا۔ اس عامیانہ تشریح کا مقصد ابھرتے سیاسی مسائل، معیشت، اور معاشرتی زندگی کے بارے میں اسلامی قوانین کی انقلابی تعبیروں کا رد

کرنا تھا تاکہ حکمران نظمِ ریاست اپنے ذاتی مفادات کے لیے چلاتے رہیں۔ خلافت عباسیہ میں چار مسلم فقہا امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام حنبلؒ ادوار میں پیدا ہوئے اور اس عوامی تشریح کو رد کیا۔ انہوں نے بادشاہوں کی مخالفت کے باوجود اپنی اپنی انفرادی حیثیت سے تحقیق کی اور نئے نئے مسائل کی تشریح کی اور معاصر حکومتی ضروریات کے لیے اسلامی قوانین کی تدوین کی۔ اسی طرح مصری، عباسی اور ترکی سلطنتوں میں یونانی، رومی اور مشرقی فلسفوں کا زور بھی مسلمان اہلِ علم کے لیے ایک چیلنج تھا۔ ان فلسفوں کی روشنی میں درجنوں اسلامی اصولوں پر بحث چھڑ گئی۔ صوفی ازم میں نئے نئے مکاتبِ فکر پیدا ہو گئے جو قدیم زرتشت روایات یا یونانی فلسفے سے متاثر تھے۔ نئے اسلامی ادب میں یونانی فلسفہ سرایت کر گیا۔ کچھ مسلمان علما نے ان رجحانات کی حمایت اور بعض نے مخالفت کی۔ نتیجہ یہ کہ گاہے گاہے کفر کے فتوے جاری ہوئے اور عالم اسلام میں تفرقہ آسمان کو چھونے لگا۔ مسلمان بادشاہ اس فرقہ بازی کے سب سے بڑے حمایتی اور سرپرست تھے کیونکہ اس سے عوام کی توجہ نظام حکومت اور سیاست کے اصل مسائل سے ہٹ گئی۔ مشہور عالم اور فقیہہ امام غزالیؒ نے ان چیلنجز کا مقابلہ کیا۔ آپ نے اسلامی فکر کی روح پیش کی اور واضح کیا کہ کس طرح یہ فکر دوسرے فلسفوں کی ضد ہے۔ آپ نے کفر کے مسئلے کی بھی چھان بین کی اور اس بارے میں (تکفیر کے) شرعی اصول بتائے تاکہ مسلمان ناجائز طور پر فرقہ بازی کی بنیادوں پر ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے نہ لگائیں۔

امام ابنِ تیمیہؒ

نبی کریم ﷺ کے بعد اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لیے نظریاتی ارتقاء تاتاری دور میں اپنے عروج پر تھا۔ تاتاریوں نے یورش کی اور خلافت عباسیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۔ اسلامی تاریخ کا یہ بدترین دور تھا۔ مسلمان پوری دنیا میں غالب قوت تھے لیکن تاتاری حملے

کے بعد ایک دم انہیں زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ عباسی خلافت ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اسلامی سیاسی نظام، اسلامی قوانین، ثقافت اور روایات بھی منسوخ ہو گئیں۔ ہر چیز تاتاری سوچ کے تابع ہو گئی۔ عالم اسلام کے مختلف خطے تاتاریوں سے محفوظ رہے لیکن مقامی حکمرانوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ تاتاریوں کے خلاف کھڑے ہو سکیں۔ وہ منگول طاقت اور بربریت سے خوفزدہ ہو چکے تھے۔ وہ بغداد والی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے جہاں پر لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا اور پوری تہذیب تباہ کر دی گئی۔

اسلامی تاریخ کے اس اہم موڑ پر مسلمان معاشروں اور مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اس غیر فعال رویے، عباسی خلافت کے زوال اور بغداد کی تباہی نے رضاکاروں کی ایک اسلامی تحریک مزاحمت کو جنم دیا۔ تاتاریوں اور ان کے مسلط کردہ قوانین کے خلاف اٹھنے والی اس تحریک کے داعی اور سپہ سالار امام ابنِ تیمیہؒ (۱۳۲۸-۱۲۶۳) تھے۔ ابنِ تیمیہ عالم اسلام میں نظریاتی مزاحمت کا ایک عمدہ نمونہ تھے اور آپ کے خیالات اب بھی اسلامی انقلابیوں کے لیے بنیادی مآخذ ہیں۔ ابن تیمیہؒ تاتاریوں کے خلاف مسلم مزاحمت کو منظم کرنے اور حملہ آوروں کے خلاف اسلامی تحریک مزاحمت کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں (اگرچہ وہ خود کو مسلمان ہی کہتے تھے) کے لیے پہلی دفعہ تکفیر کے اصول کا استعمال کیا۔ ابن تیمیہؒ نے عوام کے سامنے ان منحرفین کو غیر مسلم قرار دیا تاکہ تاتاریوں کے خلاف مسلم مزاحمت تاتاریوں کو سرزمینِ اسلام سے نکالنے پر مرکوز ہو جائے۔

ابن تیمیہؒ ارسطو جیسے یونانی فلسفیوں کی منطق کے بہت سخت ناقد تھے۔ آپ نے ان فلسفیوں کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لکھا اور اس کے برابر معقول اسلامی فکر پیش کی۔ آپ نے اسلامی فکر اور یونانی فلسفے کا تقابلی جائزہ کیا اور منطقی طور پر اسلام کی برتری ثابت کی۔ جب ابن تیمیہؒ پیدا ہوئے تو اس وقت تاتاریوں نے مسلم دنیا کے زیادہ تر حصے فتح کر لیے تھے۔

اگرچہ تاتاری بعد میں مسلمان ہو گئے لیکن انہوں نے اسلامی معاشرے میں اپنی روایات اور ثقافت متعارف کروائی۔ تاتاری حکمرانوں نے مسلمانوں کے مذہبی اداروں پر مکمل کنٹرول کر لیا اور مسلمانوں کے مذہبی اکابرین نے ان کی اطاعت کی۔ ان علماء نے ہلاکو خان کو ایک عادل حکمران قرار دیا اور فتویٰ جاری کیا کہ مسلمان آمر حکمران سے کافر عادل حکمران بہتر ہے۔ تاتاریوں نے دو مختلف طرح کے قوانین رائج کیے۔ شخصی قوانین مثلاً شادی بیاہ وغیرہ کی اسلامی تشریح کی جاتی تھی لیکن عوامی قوانین جو معیشت، سیاست اور عدلیہ سے متعلق تھے ان کی تشریح مقامی قانون الیاسق (Yassa, Yasaq) سے کی جاتی تھی۔

ابن تیمیہؒ نے منگولوں کے خلاف جہاد کو فرض قرار دیا۔ آپ کے اس فتوے کی بنیاد یہ تھی کہ اگرچہ منگول سنی اسلام قبول کر چکے ہیں لیکن اس کے باوجود سچے مسلمان نہیں ہیں کیونکہ انہوں نے اسلامی شریعت کے بجائے انسانی وضع کردہ قوانین رائج کیے ہیں لہٰذا دورِ جاہلیت میں رہ رہے ہیں۔ اسی طرح آپ نے صوفی ازم کے بہت سے مشرب بھی غیر اسلامی قرار دیے اور ان کا رد کیا۔ آپ نے شیعوں کو مرتد اور اسلامی شریعت کے غدار قرار دیا اور ان کے خلاف کارروائی کرنے کا اعلان کیا۔ آپ نے اعلان کیا کہ ہر وہ گروہ جو اسلامی حدود کو پامال کرتا ہے اس سے جنگ کی جائے گی اگرچہ وہ اسلامی عقیدے کی پیروی کا اعلان کرتا ہو۔ آپ کا جاری کردہ تکفیر کا فتویٰ سید قطب سے ہوتا ہوا القاعدۃ تک پہنچا۔

مملوک حکمران نصیر الدین نے تاتاریوں کے خلاف جنگ نہ کرنے اور غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی۔ ابن تیمیہؒ نے اس مصری حکمران کو تاتاریوں کے خلاف لڑنے پر مجبور کیا اور اسے خبردار کیا کہ اگر اس نے غیر جانبدارانہ پالیسی جاری رکھی اور تاتاریوں کے خلاف جنگ نہ کی تو آپ سب سے پہلے اس کے خلاف جنگ کریں گے اور طاقت حاصل کر کے خود تاتاریوں سے لڑیں گے۔ آپ پہلے مسلمان عالم دین تھے جو بیک وقت سپہ

سالار (مسلح) اور مصلح تھے۔ ابن تیمیہؒ کی فکر تاتاریوں کے خلاف جدوجہد پر مرکوز تھی اور آپ نے اسلام کے عقیدۂ توحید اور منگولوں کے مشرکانہ عقاید کو واضح کرتے ہوئے اس جدوجہد کی نظریاتی بنیادیں قائم کیں۔ عقیدۂ توحید پر زور دیتے ہوئے آپ نے ہر اس چیز کو جو آپ کے خیال میں مشرکانہ تھی، اسے ارتداد قرار دیا یہاں تک کہ لبنان کے شیعہ، اشاعرہ، جہمیہ کے صوفی اور معتزلہ عقاید کے لوگ بھی کافر ٹھہرے۔ القاعدۃ نے آپ کے نظریۂ مزاحمت میں دلچسپی دکھائی اور اپنے مؤقف کی حمایت میں ابن تیمیہؒ کے دلائل پیش کیے۔ بیسویں صدی میں بعد از خلافت کی اسلامی تحریکوں کا زیادہ تر حصہ امام ابن تیمیہؒ کے خیالات کا علمبردار رہے۔

جنوبی ایشیا میں جماعت اسلامی کے بانی سید مودودی اور اخوان کے داعی سید قطب نے امام ابنِ تیمیہؒ کے نظریات کو عصری اسلامی فکر میں ڈھالا۔ انہوں نے جاہلیت کی اصطلاح استعمال کی جسے ابن تیمیہؒ نے اس وقت یونانی، رومی اور تاتاری فلسفے، روایات اور قوانین کے لیے استعمال کیا تھا۔ بیسویں صدی کے ان مسلمان مبلغین نے سوشلزم ، سیکولر ازم اور جمہوریت کو بھی جاہلیت میں شمار کرتے ہوئے ابن تیمیہؒ کے اصول و نظریات میں توسیع کی۔ مولانا مودودی نے مغربی جمہوریت، سوشلزم اور مغربی معاشرتی نظام پر تنقید کی۔ آپ نے اسلامی طرزِ زندگی کی کلیت پر زور دیا، تاہم آپ ارتقائی منہج پر یقین رکھتے تھے۔ آپ اسلام کے نفاذ کے لیے تشدد کے قائل نہیں تھے۔ آپ نے ان طریقوں کا مطالعہ کیا اور تحقیق کی جو جدید فکر اور جدید اداروں سے متصادم نہ ہوں۔ مثال کے طور پر آپ نے نفاذ اسلام کے لیے بالغ رائے دہی کے نظام کی حمایت کی اور خلافت کے احیا پر اصرار نہیں کیا۔ دوسری طرف سید قطب نے مولانا مودودی کی مغربی جمہوریت اور سوشلزم پر تنقید کو

وسعت دیتے ہوئے کہا کہ مسلم اقوام مغربی معاشی، اقتصادی اور سیاسی نظام کو مکمل طور پر رد کر دیں اور اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کریں۔

القاعدۃ کا نظریاتی سفر ابن تیمیہؒ سے شروع ہوتا ہے اور اس کا اختتام سید قطبؒ پر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ کوئی قابل عمل طریقہ کار یا کوئی واضح پالیسی یا رہنمائی نہیں دیتی کہ مابعد عصری مسائل کے لیے کس قسم کی جدوجہد ہو گی۔ اسی طرح القاعدۃ کے عملی فلسفے میں ابن تیمیہؒ یا سید قطب کے نظریات کا مکمل اظہار نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۶ میں سید قطب کی پھانسی کے بعد اخوان کی ساری قیادت ختم ہو گئی یا ترکِ وطن کر گئی۔ جماعت کے نچلے درجے یا تو تتر بتر ہو گئے یا دوسری خفیہ تنظیموں کا حصہ بن گئے۔ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے نصر حکومت اور اخوان قیادت میں ثالثی کا کردار ادا کیا اور اخوان کو مشورہ دیا کہ مصری معاشرے میں تبدیلی لانے کے لیے انتخابات کا طریقہ اپنائیں۔ ۱۹۶۰ کے بعد اخوان اور عالم اسلام کی دوسری تحریکوں نے انتخابی پالیسیاں اپنائیں اور اس طرح اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن گئیں۔ اس سارے وقت میں القاعدۃ کے مسلمان انقلابی جو خفیہ تحریکوں کا حصہ تھے، اس گم شدہ کڑی کی تلاش میں رہے جس سے ان کے نظریات ایک تحریک میں بدل جائیں۔ مکہ بغاوت اور افغان جہاد نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا۔

مکہ بغاوت نے واضح طور پر خروج کے لیے راہ ہموار کی اور اس بات کا ثبوت دیا کہ سعودی بادشاہت کتنا ہی اسلامی شناخت پر زور دے لے مغربی حلیف ہونے کی وجہ سے یہ مغربی قوتوں کی آلہ کار ہی ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست ہونے کا سعودی دعویٰ قابل قبول نہیں ہے۔ اس دوران افغان جہاد نے قبل از القاعدۃ اسلامی انقلابیوں کو افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں مضبوط پناگاہیں قائم کرنے کا موقع فراہم کیا۔ یہاں سے القاعدۃ نے پہلے افغانستان اور پاکستان اور پھر پوری دنیا کے لیے نئے نظریات اور عسکری حربے وضع کیے۔

باب نمبر 5

مزاحمت جائز ہونے کی بحث

مزاحمت جائز ہونے کی بحث

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کو جڑواں ٹاوروں پر حملے سے القاعدۃ اور امریکا کے درمیان کھلم کھلا دشمنی کا آغاز ہوا۔ امریکا نے اکتوبر ۲۰۰۱ میں افغانستان پر حملہ کیا اور دسمبر ۲۰۰۱ تک طالبان شکست کھا کر منتشر ہو گئے۔ واشنگٹن نے افغانستان میں فتح کا اعلان کیا اور جمہوری حکومتی عمل پر کام شروع کر دیا۔ طالبان اور القاعدۃ افغانستان، ایران اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں محفوظ مقامات پر چلے گئے اور نئی قابض فوجوں کے خلاف مزاحمت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ افغانستان مرکزی میدان جنگ تھا اور پاکستان عسکری پناہ گاہ۔ تاہم اس مزاحمت کو دو مسائل کا سامنا کرنا پڑا: افغانستان میں مقیم قابض فوجیں اور امریکا کے طاقتور حلیف پاکستان کی سکیورٹی فورسز۔ نتیجہ یہ کہ القاعدۃ کو ایسی حکمت عملی وضع کرنا پڑی جو ان دونوں مسائل کو بیک وقت حل کر سکے۔

افغانستان میں طالبان کی تحریک مزاحمت ۲۰۰۲ میں شروع ہوئی لیکن بہت کمزور تھی؛ القاعدۃ نے اسے مضبوط کرنے کے لیے کام کیا۔ القاعدۃ نے فوج میں اسلامی سوچ رکھنے والے افسروں، روس کے خلاف افغان جہاد کے بعد نئی تشکیل پانے والی جہادی تنظیموں، اسلامی مدارس اور اسلام پر ایمان رکھنے والے معاشرتی گروہوں کو مزاحمت میں شامل کرنے ، اپنی تربیت دینے اور جوش دلانے پر توجہ کی۔ اس عمل میں پاکستان القاعدۃ کا سٹریٹجک اڈا تھا اور امریکی دباؤ کے زیرِ اثر پاکستان القاعدۃ کے خلاف جنگ کرنے پر مجبور تھا جس نے میدان جنگ کو اتنا پھیلا دیا تھا کہ امریکا نے افغان جنگ کے متعلق پالیسی کو ایف پاک سٹریٹیجی کا نام دیا۔ جب امریکا نے ۲۰۰۳ میں عراق پر حملہ کیا تو ایک بار پھر القاعدۃ اسی طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ القاعدۃ اور عراقی مزاحمت کو ایک طرف تو عراق میں مقیم قابض فوجوں کا سامنا تھا اور دوسری طرف اردن اور سعودی عرب کی سکیورٹی فورسز ان کی دشمن تھیں۔ اس

لیے القاعدۃ نے ۲۰۰۳ کے بعد افغانستان والی حکمت عملی کو پوری اسلامی دنیا میں دہرانے کا فیصلہ کیا۔ افغانستان کی طرح القاعدۃ نے عراق کو اپنا مرکزی میدان جنگ بنایا اور ہمسایہ ممالک مثلاً سعودی عرب ، اردن ، شام اور مصر اور تمام مغربی اتحادی دشمن قرار پائے۔ عراق کے پڑوسی ملک ہونے کی وجہ سے ان ممالک کو عراقی مزاحمت کے سٹریٹجک اڈے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اسی وجہ سے القاعدۃ کو ان ریاستوں میں شدید قسم کی محاذ آرائی کا سامنا کرنا پڑا۔

پھر القاعدۃ نے جنگوں کے لیے امریکی سپلائی لائن تباہ کرنے کے ارادے سے صومالیہ اور یمن میں ٹھکانا بنایا۔ درحقیقت ۲۰۰۶ تک عالم اسلام کا زیادہ تر حصہ میدان جنگ بن چکا تھا۔ بغاوتیں، جھڑپیں اور خودکش حملے معمول بن چکے تھے۔ ان مسلمان ریاستوں کی حکمران جماعتیں واضح طور پر دیکھ سکتی تھی کہ مسائل کی جڑ افغانستان اور عراق میں تھی۔ اگرچہ ان ریاستوں کے حکمران اصولی طور پر افغانستان اور عراق میں امریکی جنگ کے خلاف تھے لیکن سیاسی اور معاشی دباؤ کی وجہ سے انہیں امریکا کا ساتھ دینا پڑا۔ پھر مسلم اکثریتی ریاستوں میں ان بغاوتوں کے خلاف سرکاری مذہبی فتوے جاری کیے گئے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے مذہبی علما نے جنگجوؤں سے مذاکرات کیے اور یقین دہانی کروائی کہ اگر وہ اپنی توجہ افغانستان اور عراق میں امریکی حملوں پر ہی رکھیں گے تو انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن پاکستان، اردن، کویت اور سعودی عرب جیسے ممالک بتدریج امریکی جنگ میں تعاون اور مدد فراہم کرنے لگے تو یہ بھی نشانے پر رکھ لیے گئے۔ القاعدۃ ایسی تنظیم نہیں تھی جو اس دلیل کو مان لیتی کہ ایک مسلم اکثریت والی ریاست ایک غیر مسلم حملہ آور کا ساتھ دینے پر مجبور ہے۔ القاعدۃ کے پاس ان کے لیے کوئی رعایت نہیں تھی۔ اس کے برعکس القاعدۃ نے جنگ میں ساتھ دینے والی مسلم اکثریتی ریاستوں کو مرتد قرار دیتے ہوئے

اپنا دشمن قرار دیا۔ القاعدۃ نے امریکا اور اس کے مغربی حلیفوں کی بہ نسبت ان مسلمان ممالک پر زیادہ حملے کیے۔ نتیجے کے طور پر ان ممالک میں القاعدۃ کی افغان اور عراق جنگ کی شرعی حیثیت پر بحث کا آغاز ہو گیا۔

اس نظریاتی جنگ کا پہلا دور مشرقِ وسطیٰ میں شروع ہوا۔ علامہ ناصر الدین البانی نے مسلمان انقلابیوں کو نئے خارجی قرار دیا اور کہا:

> "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اسلام کے بارے میں محدود رکھنے والی ایک نئی خارجی نسل سامنے آئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حکمران مکمل اسلامی نظام پیش نہیں کرتے۔ اس لیے اس نئی نسل نے مسلمان علماء، فقہا اور مستند علماء کی مشاورت کے بغیر مسلح بغاوت کر کے انتشار اور بحران پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے مصر، شام اور الجیریا میں قتل و غارت شروع کر رکھی ہے۔ پہلے انہوں نے مکہ معظمہ میں مسجد حرام پر حملہ کیا تھا۔ لہٰذا یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند احادیث کی مخالفت کرتے ہیں اور خارجی طریقوں کے علاوہ ہر اسلامی عمل کا انکار کرتے ہیں۔"

جب ایک سعودی سلفی عالم سے سوال کیا گیا کہ کیا اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو خوارج کی راہ پر چلتے ہیں تو انہوں نے جواب میں اس بحث کو مزید پھیلایا اور کہا:

> تو پھر خوارج کے عقاید اور عمل کیا تھے؟ یہی کہ مسلمانوں کو مرتد کہا جائے، جس کی بدترین شکل یہ ہے کہ مسلمانوں کو قتل کیا جائے اور ان پر مظالم ڈھائے جائیں۔ خوارج کا اصل عقیدہ ہے:
>
> ۱۔ مسلمانوں کو مرتد قرار دینا
>
> ۲۔ مسلح بغاوت کر کے سیاسی نظام اور حکومتی رٹ کو چیلنج کرنا

۳۔ مسلمانوں کے قتل کو جائز کہنا

اگر کوئی بھی شخص مذکورہ بالا عقاید کا حامل ہے تو وہ خارجی ہے چاہے وہ اس گمراہ فرقے سے اپنا تعلق ظاہر کرے نہ کرے۔

(شیخ صالح بن فروان، جہاد کے اصول وضوابط)

بلاشبہ، ریاستی سرپرستی میں القاعدۃ کے خلاف چھڑنے والی علمی بحث میں یہ بات مکمل طور پر نظر انداز کر دی گئی کہ مسلم اکثریتی ریاستوں میں القاعدۃ کی جنگ کسی اندرونی سیاست یا نظریاتی تضاد کی وجہ سے نہیں تھی۔ اس جنگ کا براہِ راست تعلق بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ تھا جس میں اسلامی حکومتیں کفار کی فوجوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اس سے القاعدۃ کو ان کے خلاف کفر کا فتویٰ لگانے میں آسانی ہوگئی۔ فلسطین، عراق اور افغانستان پر قبضے اسلامی بغاوتوں کا اصل مرکز رہے ہیں۔ سعودی عرب، اردن، پاکستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں تازہ ترین مصائب مغربی حمایت کا شاخسانہ ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد پاکستان نے افغان طالبان کے خلاف فضائی حملے کرنے کے لیے امریکا کو اپنے ہوائی اڈے فراہم کیے۔ پاکستان نے افغانستان تک نیٹو سپلائی کے لیے زمینی راستہ فراہم کیا۔ مزید بر آں، پاکستان نے القاعدۃ کے بہت سے رہنما اور کارکن گرفتار کر کے امریکا کے حوالے کیے۔ اردن، کویت، ترکی، سعودی عرب اور کسی حد تک ایران نے صدام حکومت کے خاتمے اور عراق پر قبضے کے لیے امریکہ کو لاجسٹک اور انٹیلی جنس معاونت فراہم کی۔

سعودی عرب اور پاکستان میں سیاسی مخالفت ان ریاستوں میں عدم استحکام پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔ جنگجوؤں نے سابق صدر پرویز مشرف اور سابق وزیر اعظم شوکت عزیز کو قتل کرنے کی کوشش کی اور پاکستان کی مغرب نواز سیاسی رہنما بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا۔ ۲۰۰۴ سے ۲۰۰۶ تک سعودی عرب کو شدید ترین شدت پسندی کا سامنا رہا۔

۲۰۰۷ تک مسلمان حکومتوں کو احساس ہو چکا تھا کہ جب تک عراق اور افغانستان کی جنگ جاری ہے، مسلمان ریاستوں میں اسلام پسندوں کی بغاوتوں اور سرکشیوں کو روکنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ریاستی سرپرستی میں کالم نگاری اور ٹی وی مذاکروں کا اہتمام کیا گیا جس میں صحافی پنڈتوں نے ''صحیح'' اسلامی مزاحمت کے اصل شرعی اصول بیان فرمائے۔ ان اقدامات سے یہ رائے عامہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ عراق اور افغانستان میں جاری اسلامی مزاحمت غیر شرعی ہے۔

مختلف علماء قرآن و حدیث کی روشنی میں جائز اسلامی مزاحمت کے درج ذیل اصول بیان فرماتے ہیں:

۱۔ جنگ کے لیے مناسب وسائل ہونے چاہئیں۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک جہاد نہیں کیا جب تک آپ نے مدینہ میں ریاست قائم کر کے وہاں ہجرت نہیں فرمائی لہٰذا جب تک کوئی ریاست یا قلعہ حاصل نہیں کیا جاتا کوئی بھی مزاحمت شرعی نہیں ہے۔

۳۔ اسلامی لشکر کی تعداد دشمنوں کے نصف سے کم نہ ہو۔

۴۔ ان چاروں شرائط کے پورا کیے بغیر کوئی بھی مزاحمت اسلامی مزاحمت نہیں ہو گی۔

ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور مذہبی فتووں میں ان خیالات کا بار بار ڈھنڈورا پیٹا گیا مگر یہ (القاعدہ کی) اسلامی مزاحمتی فکر کا خاتمہ نہ کر سکے۔

باب نمبر6

تطبیق وترکیب

تطبیق وترکیب

شمالی وزیرستان کے پرخطر خطے میں القاعدۃ کے رہنما ابو عمرو عبد الرحمان الحکیم حسن المعروف شیخ عیسیٰ مقیم ہیں جن تک پنجابی، پشتون اور افغان جنگجوؤں کے لیے رسائی بہت آسان ہے۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ تمام اسلامی تحریکوں کا آغاز ایک غیر اسلامی حاکم کی تکفیر اور انحراف سے ہوتا ہے۔ اس سے کھیل کے قوانین واضح ہوتے ہیں یعنی یہ پتا چلتا ہے کہ اسلام کی جنگ میں کون کس کے ساتھ ہے۔ افغانستان میں ۲۰۰۱ میں طالبان کی شکست کے بعد القاعدۃ بقا کی جدوجہد کررہی تھی۔ شیخ عیسیٰ نے جنوب ایشیائی میدانِ جنگ کو وسیع کرنے کے لیے عملی طور پر ایک جدلیاتی عمل کی بنیاد رکھی۔ اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے اسلام پسندوں اور سیکولر قوتوں کے مابین نزاعی کیفیت پیدا کی جائے اور یہ کیفیت اس درجے تک پہنچادی جائے کہ پاکستان یا تو امریکا کی حمایت ترک کردے یا القاعدۃ کی امریکا کے خلاف جنگ میں القاعدۃ کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے۔ نیٹو اتحاد کے خلاف لڑنے کے لیے القاعدۃ کا ہدف خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے صوبوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا تھا۔

ستر سالہ شیخ عیسیٰ کا بدن زخموں سے گندھا ہوا ہے۔ آخری دفعہ آپ کو پاکستانی فوج کی انگور اڈا کی کارروائی میں زخم آئے۔ آپ کو بلاشبہ جذبات کا سمندر کہا جاتا ہے۔ شیخ عیسیٰ مصر میں اخوان کے مبلغ عبد القادر عودہ کے ساتھی تھے۔ العودہ کو ۱۹۶۰ کی دہائی میں نصر حکومت نے قتل کر دیا۔ شیخ عیسیٰ قاہرہ کے کالج آف کامرس کے گریجوایٹ تھے، اس واقعے کے بعد مصری حکومت کے مخالف ہو گئے۔ آپ نے مسلمان حکومتوں کی تکفیر کے نظریات قائم کیے اور مصری حکومت کے ہاتھوں مظالم برداشت کیے لیکن ان مظالم نے آپ کے عزم کو تقویت دی اور مسلم ممالک کی حکومتوں سے آپ کی نفرت بڑھتی گئی۔ مصر میں انور سادات کے خلاف ہونے والی بغاوت میں شیخ عیسیٰ بھی شامل تھے اور سادات کے قتل کے بعد

آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد آپ نے الازہر یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور دینیات میں ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۶ میں آپ روس کے خلاف افغان جہاد میں شریک ہوئے اور عبد اللہ عزام اور سید امام کے قریبی ساتھی رہے۔ ۱۹۹۲ میں آپ مدارس میں تدریس کے لیے یمن چلے گئے لیکن ۱۹۹۶ میں طالبان کے طاقت حاصل کرنے پر دوبارہ افغانستان چلے آئے۔ جب امریکا نے طالبان حکومت کو شکست دی تو شیخ عیسیٰ شمالی وزیرستان ہجرت کر آئے۔

ضعیف العمری اور کمر درد کے باعث آپ شدید علیل رہنے لگے۔ آپ علالت کی وجہ سے کارروائیوں میں تو شریک نہ ہو سکتے تھے لیکن قبائلی علاقوں میں جانے والے جہادیوں کے لیے منبع فیضان تھے۔ پنجاب سے جانے والے جنگجو بھی آپ کی بہت زیادہ تکریم کرتے تھے۔ وہ مسحور بیٹھے آپ کی تکفیر کی تشریح سنا کرتے۔ وہ آپ کی مشہور کتاب الولاء والبراء پڑھتے۔ اس کتاب میں مسلم معاشرے کے مختلف گروہوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بنیادی دلائل اور اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں جمہوری نظام کلیتاً رد کیا گیا ہے کیونکہ اس نظام نے تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو لبرل ازم کے دھارے میں شامل کر دیا ہے۔ آپ کا نظریہ ہے کہ جمہوری نظام حکومت میں اگر اسلام پسند غالب ہو بھی جاتے ہیں تو پھر بھی وہ کوئی ایسا نظام حکومت کھڑا نہیں کر سکتے جو سیاسی اسلام کی روح کے مطابق ہو۔ آپ کے خیال میں اس طرح اسلام کا اثر سرحدی حد بندیوں میں مقید ہو کر رہ جائے گا اور عالمی جہاد کی پکار پر قومی ریاستوں کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکے گا۔ آپ کی کتاب میں غیر مسلموں اور غیر اسلامی نظام کے حامیوں کی تکفیر کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شیخ عیسیٰ نے وہ تمام اصول بیان کیے ہیں جن کے تحت پاکستان افغان اسلامی لشکر کے خلاف امریکی جنگ میں امریکی اتحادی ہونے کے باعث دارالحرب قرار پاتا ہے۔

جلد ہی پاکستانی جہادیوں خاص طور پر لشکرِ جھنگوی کے ارکان شیخ عیسیٰ کے حلقۂ تلمیذ میں شامل ہو گئے۔ آپ کے شاگردوں میں قاری ظفر، محمد افضل، ڈاکٹر عمر، فراز علی شامی، شعیب اسحاق، سعید، ڈاکٹر حمید، حاجی طارق، حکیم طاہر عبد اللہ، اشتیاق، ثناء اللہ، شیخ نثار اور افتخار قریشی شامل ہیں۔ اسی طرح شمالی وزیرستان کے کمانڈر اور علماء مولوی صادق نور اور عبد الخالق بھی آپ کے شاگردِ رشید ہیں۔ شیخ عیسیٰ نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں یہ سوال اٹھایا کہ کیا اتنا ہی کافی ہے کہ ایک شخص مسلمان خاندان میں پیدا ہو جائے یا کوئی ایسا ہی پیمانہ اور بھی ہونا چاہیے جس کی کسوٹی پر کسی فرد، گروہ یا ملک کے کفر اور ایمان کو پرکھا جائے؟ آپ نے ایک حقیقی مسلمان کے لیے تمام مطلوبہ معیارات الولاء والبراء میں مدوّن کیے اور یہ کتاب ترجمہ ہو کر بڑے پیمانے پر تقسیم ہوئی۔ تاہم یہ کتاب عام آدمی کے لیے نہیں تھی بلکہ عملی مسلمان ہی اس کا ہدف تھے۔ شیخ عیسیٰ سیکولر قوتوں کے ساتھ ان کا تنازعہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ افغانستان میں نیٹو کے خلاف جنگ جیتنے سے پہلے پاکستان آرمی پر فتح حاصل کرنا لازمی ہے۔ الولاء والبراء میں آپ نے ابنِ تیمیہؒ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے:

> یہاں تک کہ اگر ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے خلاف جنگ پر مجبور ہو جائے تو اس مسلمان پر لازم ہے کہ مسلمان ساتھیوں کے خلاف نہ لڑے یہاں تک کہ حکم عدولی کی وجہ سے اس کی جان جانے کا بھی خطرہ ہو۔ یہ لوگ تنخواہ کے لالچ میں لڑ رہے ہیں لہٰذا میں بے باک ہو کر انہیں مرتد کہتا ہوں۔

شیخ عیسیٰ نے اپنی کتاب میں قرآن و سنت اور مستند علماء کے اقوال درج کیے ہیں۔ آپ نے ان سب دلائل کو پاکستان کی امریکی وار آن ٹیرر کی حمایت کے خلاف استعمال کیا۔ شیخ عیسیٰ کی نظر پاکستانی فوج، مذہبی جماعتوں اور جہادی تنظیموں کے اسلام پسندوں پر

تھی۔ آپ کا خیال تھا کہ ایک بار پاکستانی اسلام پسند اس بات کے قائل ہو جائیں کہ مسلمانوں کے خلاف امریکی جنگ کی حمایت کرنے کی وجہ سے پاکستان اب ایک اسلامی ریاست نہیں رہا، تو خروج کی راہ آسان ہو جائے گی اور تین اہداف میں سے کم از کم ایک ہدف ضرور پورا ہو جائے گا:

۱۔ پاکستان افغان جنگ میں امریکا کی حمایت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

۲۔ اہم دفاعی عہدوں پر فائز اسلام پسند وسائل کا رخ جنگجوؤں کی طرف پھیر دیں گے۔

۳۔ اگر خروج کامیاب ہو جاتا ہے اور جہادی غلبہ پا لیتے ہیں تو عالمی جہاد کے لیے اہم مرکز بہم ہو جائے گا۔

شیخ عیسیٰ پاکستان کی تمام خفیہ ایجنسیوں کو مطلوب تھے۔ اگرچہ آپ روانی سے اردو اور پشتو بول لیتے تھے لیکن ایک عرب ہونے کی وجہ سے آپ بڑی آسانی سے القاعدۃ کے رکن کے طور پر شناخت ہو سکتے تھے۔ پھر بھی آپ نے خطرہ مول لے کر شمالی وزیرستان سے پاکستان کے شہروں ملتان، فیصل آباد اور لاہور کا سفر کیا۔ لاہور کے سفر میں آپ کی کتاب کی کئی کاپیاں بھی آپ کے پاس تھیں۔ آپ تنظیم اسلامی کے ڈاکٹر اسرار احمد، جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد اور لشکر طیبہ کے حافظ سعید سے ملے۔ آپ نے کتاب کے کچھ حصے پڑھ کر انہیں سنائے اور پوچھا کہ میں غلط ہوں یا درست۔ کسی نے بھی آپ کی بات کی تردید نہ کی۔ ''اگر یہ سب درست ہے تو آپ پاکستانی فوج کو مرتد کیوں نہیں کہتے جو جنوبی وزیرستان میں صرف اس لیے آپریشن کر رہی ہے کہ وہ لوگ اسلامی مزاحمت کی حمایت کرتے ہیں؟'' شیخ عیسیٰ نے سوال کیا۔

قاضی حسین احمد نے جواب دیا ''اصولی طور پر تو آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن موجودہ حالات میں آپ کے خیالات کا فائدہ صرف انڈیا اور امریکا جیسے دشمنوں کو ہو گا''۔ شیخ

عیسیٰ اس طرح کے جواب سے حوصلہ ہارنے والے نہیں تھے۔ آپ نے ملک کی مذہبی قیادت سے میل جول جاری رکھا اور اس سفر میں آپ اسلام آباد کی لال مسجد کے پیش امام تک جا پہنچے۔لال مسجد سے ملحق ایک سادہ سے مکان میں، جو آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر سے بمشکل ایک کلومیٹر کی دوری پر تھا، شیخ عیسیٰ نے وہی سوال مولانا عبد العزیز کے سامنے رکھے۔ عبد العزیز سادہ دل اور کھرے بندے تھے۔ شیخ عیسیٰ کی باتوں اور آپ کی کتاب نے عبد العزیز کو بہت متاثر کیا۔ عبد العزیز کوئی عام مولوی یا مذہبی عالم نہ تھے۔ آپ پاکستانی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے لاڈلے تھے کیونکہ آپ نے کشمیر کی تحریک کے لیے سیکڑوں نوجوان تیار کیے تھے۔ ہر سال کشمیری عسکری گروپ حرکت المجاہدین کے کمانڈر فضل الرحمان خلیل آپ کے در پر ستک دیتے اور چند ہی دنوں میں مولانا کی دعوت پر سینکڑوں طلباء مدرسوں سے اٹھ کر کشمیری جدوجہد میں شامل ہو جاتے۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کے مذہبی ذہن رکھنے والے فوجی اور بیوروکریٹ خاندانوں کی لڑکیاں مولانا کے جامعہ للبنات میں زیر تعلیم تھیں اور عبد الرشید کے ساتھ اسلام آباد میں شہری حقوق کی کمیٹی کے سربراہ بھی تھے۔ اس طرح مولانا عبد العزیز اسلام آباد میں پاکستان کی عسکری قیادت کا اہم اثاثہ تھے۔

شیخ عیسیٰ کا خیال تھا کہ لال مسجد سے بغاوت شروع ہو جائے تو پاکستان میں اسلامی انقلاب کا آغاز ہو جائے گا۔ شیخ عیسیٰ نے عبد العزیز کو ان عالمانہ ذمہ داریوں کے احساس دلاتے ہوئے پوچھا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد بھی آپ پاکستان کی فوج کو مسلمان خیال کرتے ہیں؟ شیخ عیسیٰ نے زور دیتے ہوئے کہا اگر آپ پاکستانی فوج کی تکفیر کا انکار کرتے ہیں تو اللہ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ عبد العزیز گہرا مذہبی لگاؤ رکھنے والے جذباتی انسان تھے۔ پاکستانی فوج کی تکفیر کا اعلان کرنے کا مطلب تمام عزت و رتبہ اور پاکستانی فوج سے تمام تعلقات کا خاتمہ تھا۔ لیکن اسلامی جنگجوؤں کے خلاف فوج کی کارروائیوں کے باوجود فوج سے

تعلقات کا مطلب اپنا عقیدہ ترک دینا تھا۔ عبد العزیز نے فوج کے خلاف جانے اور ایمان بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا نے ایک فرضی نام سے اپنے ہی دارالافتاء میں ایک خط لکھا کہ جنوبی وزیرستان میں آپریشن کے بعد پاکستان آرمی کے عقیدے کی کیا حیثیت ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فتوے میں کہا کہ:

جنوبی وزیرستان میں مجاہدین سے لڑتے ہوئے مرنے والوں کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور نہ ہی انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔

عبد العزیز نے یہ فتویٰ ۲۰۰۴ میں جاری کیا(یہ وہی مشہور فتویٰ ہے جس پر 500 مفتیان نے دستخط کیے تھے)۔ اس فتوے کا بڑا اثر ہوا۔ درجنوں فوجیوں نے اپنے افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور سینکڑوں افسروں اور جوانوں نے ملازمت سے استعفیٰ لینے کی درخواست دے دی۔ اس صورتحال سے آرمی سرنڈر کرنے اور جنگجوؤں سے معاہدہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس نظریاتی جنگ کا مقصد پاکستان آرمی کے عقیدے اور ایمان کا پول کھولنا تھا اور یہ بات قبائلی علاقوں میں فوج کی ناکامیوں سے زیادہ زخمانے والی تھی۔ مشرف حکومت نے قبائلی علاقوں میں فوج کی کارروائیوں کی حمایت کرنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کر کے علماء کو خریدا اور جنگجوؤں کے مذہبی عقائد کے خلاف فتوے جاری کروائے لیکن شمالی اور جنوبی وزیرستان میں بیٹھے القاعدۃ کے مبلغین نے ان کا منظم طور پر دفاع کیا۔

حرکت اسلامی ازبکستان کے رہنما قاری طاہر یلدوشیف اس وقت وزیرستان میں تارک وطن ہوئے بیٹھے تھے جنہوں نے شیخ عیسیٰ سے متاثر ہوتے ہوئے عبد العزیز سے رابطہ کیا۔ آپ نے ازبک افراد مولانا کے پاس بھیجے اور پاکستان آرمی کے خلاف آپ کے فتوے پر تحریری طور پر آپ کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ نے کہا کہ:

یہ صحیح وقت ہے کہ اس فتوے کو ایک منظم تحریک میں بدلا جائے۔ آپ اپنے مدارس کا نیٹ ورک استعمال کریں اور طالبعلموں اور علماء کو اسلامی انقلاب کے لیے مجاہدین کی حمایت اور اس مرتد فوج کے خلاف ، جو افغانستان میں جاری امریکی جنگ میں معاونت کرتی ہے، کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر اکسائیں۔

شیخ عیسیٰ نے بھی عبد العزیز کو نصیحت کی کشمیر میں نوجوان بھیجنے کی بجائے آپ انہیں اسلامی انقلاب میں کردار ادا کرنے کی ہدایت کریں۔ اپریل ۲۰۰۷ تھا۔ میں لال مسجد سے ملحق عبد العزیز کے گھر میں ایک درخت تلے ایک بوری پر ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آپ اپنے طلباء سے کہہ رہے تھے کہ مدرسے میں اعلان کر دیں کہ وہ شام کے وقت ان سے خطاب کریں گے۔ عبد العزیز نے مجھے بتایا کہ مدارس کے طلباء سے روزانہ خطاب کرنا ان کا معمول ہے۔ میں نے پوچھا کہ مولانا آپ افغان طرز پر نفاذ اسلام کے لیے کوئی طالبان تحریک تو شروع نہیں کر رہے؟ آپ نے جواب دیا، بے شک۔ اور یہی راستہ ہے کہ پاکستان کی سالمیت کو بچایا جائے جو نسلی اور سیاسی تعصبات کی وجہ سے بڑی تیزی سے انتشار اور بد نظمی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔

بلاشبہ پاکستانی ایجنسیاں صدارتی محل میں رپورٹیں دے رہی تھیں کہ لال مسجد نفاذِ شریعت کا مطالبہ کر رہی ہے لیکن در حقیقت لال مسجد القاعدۃ کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ جب بھی پاکستانی فوج نے جنوبی وزیرستان میں کوئی کارروائی شروع کی، لال مسجد والوں نے کوئی عمل کر کے القاعدۃ کی طرف سے توجہ منحرف کر دی۔ انٹیلی جنس رپورٹیں جزوی طور پر درست تھیں۔ لال مسجد کو یہی ایک ذمہ داری نہیں دی گئی تھی۔ القاعدۃ لال مسجد کے خطیبوں کو نفاذِ اسلام کی تحریک کے رہنماؤں کے طور پر کھڑا کر کے ملک کے مدارس کے جال

کو استعمال کرنا چاہتی تھی۔ ملک میں تقریباً تیرہ ہزار پانچ سو مدارس ہیں جو طالبان حمایتی دیوبندی مکتبِ فکر کے ہیں۔ یہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں اٹھارہ لاکھ سے زائد طالب علم زیرِ تعلیم ہیں۔ لال مسجد کا ہدف تھا کہ ان مدارس کو امریکی وار آن ٹیرر میں پاکستان کی حمایت کے خلاف بغاوت پر تیار کیا جائے۔ یہی وجہ تھی لال مسجد کے رہنما بنیادی طور پر نفاذِ شریعت پر زور نہیں دے رہے تھے بلکہ ان کا مقصد تھا کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور ملک کے اسلام پسندوں کے درمیان فاصلے بڑھا دیے جائیں یہاں تک کہ پاکستانی قیادت دباؤ میں آکر وارآن ٹیرر کی حمایت سے دستبردار ہو جائے۔

شمالی وزیرستان میں القاعدۃ کے مفکرین نے مولانا عبدالعزیز جیسے علماء کو متاثر کرنے کے لیے تکفیری ادب کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔ ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ عبدالعزیز ان تحریروں کو خالص علمی شکل میں اپنے خطبات میں بیان کریں بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ عملی طور پر کام ہو اور یہ نظریہ ایک حکمت عملی بن جائے۔ ۲۰۰۴ سے ۲۰۰۷ تک مولانا عبدالعزیز نے پاکستان کی عسکری قیادت کے خلاف منفرد بیانات دینے جاری رکھے اور ایسے کام کیے جو ان سے پہلے کسی اسلامی اسکالر نے نہیں کیے تھے۔ اسی بنا پر ۲۰۰۷ میں لال مسجد کے خلاف گھیر اتنگ کر دیا گیا۔ پاکستانی عسکری قیادت نے لال مسجد کے علماء کو ہدایت کی کہ قانون اپنے ہاتھوں میں نہ لیں اور امن عامہ قائم کرنے والی سکیورٹی فورسز کو اپنی کارروائی کرنے دیں۔ اس کا ثبوت دینے کے لیے پاکستانی پولیس نے اسلام آباد کے گیسٹ ہاؤسز پر چھاپے بھی مارے جہاں سے گاہکوں کو کسبیاں فراہم کی جاتی تھیں۔

ہوتا تو یہ کہ لال مسجد پاکستانی انتظامیہ کی ان کوششوں کا خیر مقدم کرتی لیکن ان کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اضطراب پیدا کرنے کے لیے مزید کارروائیاں کی جائیں۔ لال مسجد کے نگرانوں نے اسلام آباد کی مارکیٹوں پر حملے کر کے فحش فلمیں بیچنے والوں

کی دکانیں جلادیں۔ اس دوران عبد العزیز ہر روز پورے ملک کے مدارس سے خطاب کرتے رہے۔ آپ نے جمہوریت اور وار آن ٹیرر میں پاکستانی حمایت کے خلاف اعلانیہ بیانات دیے اور بلاخوف وخطر پاکستانی طرزِ حکومت کو کفر قرار دیا اور مؤقف اختیار کیا کہ قبائلی علاقوں میں طالبان اور القاعدۃ کے خلاف فوجی آپریشن بھی کفر ہے۔

لال مسجد اسلام آباد کے عین وسط میں جو کچھ کر رہی تھی وہ ہر شخص کی فہم سے بالا تر تھا۔ ملک کی سرکردہ مذہبی قیادت کو بھی کوئی سمجھ نہیں آرہی تھی ۔ صرف القاعدۃ کے مبلغین اس نافرمانی کے اصل محرکات اور عوامل سے واقف تھے۔ پاکستان کے سرکاری لوگ مثلاً وزیر مذہبی امور اعجاز الحق اکثر لال مسجد کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ یہ کوئی حیرانی والی بات نہیں تھی کہ عبد العزیز کے والد مولانا عبد اللہ اور جنرل ضیاالحق میں گہرے مراسم تھے اور یہی تعلق ان دونوں کے بیٹوں میں موجود تھا۔ ”مولانا! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، خدا کے لیے یہ سب کرنا چھوڑ دیں۔ اس سب کا نتیجہ آخرکار ایک شدید تنازع ہو گا۔ مجھے آگ کا سمندر نظر آرہا ہے“۔ کہا جاتا ہے کہ اعجاز الحق نے مولانا کے قدموں میں بیٹھ کر یہ درخواست کی تھی۔ لیکن ان کی سب التجائیں بے سود رہیں۔ اعجاز الحق کو کیا خبر تھی کہ آگ بھڑکانا ہی مولانا کا مقصد تھا۔ آپ نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا کہ آپ اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ وفاقی کابینہ میں مذہبی ذہن رکھنے والے وزراء اور پاکستان مسلم لیگ کے چودھری شجاعت حسین نے مشرف کو یہ تناؤ کم کرنے کے لیے خصوصی کوششیں کرنے پر مائل کیا۔ آخرکار مولانا عبد العزیز کے روحانی مرشد اور ممتاز عالم دین مفتی تقی عثمانی صاحب کو اسلام آباد آکر اس تنازع کو کم کرنے کی دعوت دی گئی۔ تقی عثمانی صاحب کراچی سے اسلام آباد تشریف لے آئے۔

”آپ کیا چاہتے ہو؟“ تقی عثمانی صاحب نے عبد العزیز سے سوال کیا۔

"میں پاکستان میں اسلامی طرزِ زندگی والا نظام چاہتا ہوں۔" عبد العزیز نے جواب دیا۔

"لیکن آپ کون سے طریقے پر چل رہے ہیں؟ پیغمبر کے طریقے پر یا اپنے طریقے پر؟"

"بے شک حضرت محمد ﷺ کا اسوۂ ہی قابل تقلید ہے۔"

"کیا آپ چلڈرن لائبریری پر قبضہ کرنے، طوائفوں کو اغوا کرنے، مسجد میں پولیس کو یرغمال بنانے اور فحش فلموں والی دکانیں جلا کر امن و امان کی صورتحال خراب کرنے پر کوئی توجیہہ پیش کر سکتے ہیں؟ کیا نبی کریم ﷺ کے دورِ جہاد سے ایسی کوئی مثال ملتی ہے؟ کیا سلف کے ہاں اس طریقِ جہد کا کوئی نمونہ پایا جاتا ہے؟ کیا آپ کو نفاذِ اسلام کی جدوجہد اور ملک میں انتشار پیدا کرنے میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟"

عبد العزیز نے سر جھکا لیا لیکن کوئی جواب نہ دیا۔

"مجھے جواب چاہیے۔" تقی عثمانی صاحب نے اصرار کیا۔

"آپ میرے استاد اور مرشد ہیں، میں آپ سے بحث کی جرأت نہیں رکھتا۔"

"تو پھر کیا آپ مجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ آئندہ ایسی کارروائیوں سے باز رہیں گے؟"

"میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے جاری رکھوں گا کیونکہ میرے خیال میں یہی صحیح راستہ ہے۔"

"قرآن و سنت سے ایسے کاموں کی کوئی توجیہہ اور دلیل پیش نہ کرنے کے باوجود بھی آپ ایسے کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

عزیز خاموش رہے۔

”عبد العزیز میں نے سنا ہے کہ تم اب بھی لوگوں سے کہتے ہو کہ میں تمہارا روحانی مرشد ہوں لیکن اب میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ رشتہ ختم ہو گیا۔ اب کسی سے مت کہنا کہ تم میرے مرید ہو۔“

یہ سب سے بڑی سزا تھی جو کوئی استاد اپنے شاگرد کو دے سکتا تھا۔ تقی عثمانی صاحب نے عبد العزیز کو اپنے حلقۂ ارادت سے نکال دیا۔

عبد العزیز کی آنکھیں اشکبار تھیں لیکن آپ خاموش تھے۔

تقی عثمانی صاحب مزید کچھ نہ بولے اور چلے گئے۔ عبد العزیز نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔

مشرف انتظامیہ کے پاس اب کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ آخری چارے کے طور پر امامِ کعبہ عبد الرحمان السدیس کو دعوت دینے کا فیصلہ کیا گیا کہ شاید لال مسجد کے رہنما ان کی بات کا ہی احترام کر لیں۔ تاہم السدیس کی عبد العزیز سے ملاقات بھی بے سود رہی۔ آخر کار مشرف کی فوجی حکومت نے خود لال مسجد کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ رینجرز اور پولیس نے لال مسجد کا محاصرہ کر لیا اور حکم دیا کہ لال مسجد کے طالب علم اور اساتذہ ہتھیار ڈال دیں۔ مولانا عبد العزیز اور ان کے بھائی عبد الرشید غازی نے انکار کر دیا اور جواباً شعلہ بیان خطاب کیے۔ اگرچہ مسجد میں صرف گیارہ عدد اے کے ۴۷ گنیں تھیں لیکن امام صاحبان نے فون پر میڈیا کو اطلاع دی کہ فورسز کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس اسلحہ اور خودکش حملہ آور تیار ہیں۔ فوج نے پھر کالعدم حرکت المجاہدین کے سربراہ مولانا فضل الرحمان خلیل کو لال مسجد بھیجا کہ وہ ان علما کو منالیں۔ فضل الرحمان خلیل نے خبردار کیا کہ تم لوگ اپنی حماقتوں کی وجہ سے لال مسجد کو عالمی توجہ کا مرکز بنا چکے ہو اور فوج کارروائی کرنے پر مجبور ہے۔ اس فوجی آپریشن سے بچنے کا ایک ہی راستہ کہ ہتھیار ڈال دو۔ آپ نے انہیں یقین دہانی کروائی کہ

دورانِ حراست آپ سے باعزت سلوک کیا جائے گا اور چند ماہ بعد آپ کی ضمانت کروالی جائے گی۔

لال مسجد کے گرد گھیرا تنگ ہوا تو عبدالعزیز کو بالآخر احساس ہو گیا کہ طویل دورانیے تک ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ نے سوچا کہ اگر آپ یہاں سے نکل جائیں تو آپ کے ساتھی آسانی سے ہتھیار ڈال دیں گے اور آپ باہر سے اس تحریک کو کمانڈ کرتے رہیں گے۔ آپ نے برقعہ پہنا اور مسجد سے چوری چھپے نکلنے کی کوشش کی لیکن قانون نافذ کرنے والے اداروں نے آپ کو پہچان لیا اور گرفتار کر کے اسی حالت میں سرکاری ٹی وی پر آپ کی تذلیل و تحقیر کی۔ عبدالعزیز کی فرار کی کوشش سے وزیرستان میں بیٹھی القاعدۃ قیادت طیش میں آ گئی۔ ازبک رہنما قاری طاہر نے خود عبدالرشید غازی اور ان کے نائب عبدالقیوم کو فون کیا اور خبردار کیا کہ اب انہیں آخری دم تک ٹھہرنا ہو گا۔ یہی اس تحریک کا اہم موڑ ہو گا۔ اگر انہوں نے آئندہ بھی ایسے ہی ہتھیار ڈال دیے تو اسلامی انقلابی تحریک دم توڑ جائے گی۔ غازی عبدالرشید نے ہدایات کی پیروی کی۔ بعد میں جب کارروائی ہوئی تو غازی عبدالرشید، ان کے ساتھی، ان کی والدہ اور عبدالعزیز کے صاحبزادے شہید کر دیے گئے۔

تاہم لال مسجد آپریشن نے ملکی تحرکات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیے۔ اس نے تازہ عسکری جدوجہد کی بنیادیں رکھیں اور ملک کی مذہبی وسیاسی جماعتوں کو رد کر دیا۔ اس سب کے باوجود اور القاعدۃ اور مولانا عبدالعزیز کی توقعات کے برعکس ان اسلامی مدرسوں سے ایک بھی طالب علم نفاذِ اسلام اور لال مسجد کی حمایت کے لیے نہ نکلا، جہاں سے وہ ایک طالبان تحریک کی آس لگائے بیٹھے تھے، یہاں تک کہ اسلام آباد اور راولپنڈی کے اٹھارہ مدرسوں میں بھی کوئی ہلچل نہ ہوئی۔

بغاوت کا آغاز

القاعدة نے ہمت نہ ہاری۔ جب لال مسجد کے شہداء کی تدفین ہو رہی تھی تو القاعدة سوات وادی میں اپنے آدمی کے ساتھ رابطے میں تھی۔ سوات وادی اب مولانا فضل اللہ کی تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی کے ہاتھوں میں تھی۔ فضل اللہ، مولانا صوفی محمد کے داماد تھے۔ صوفی محمد کو پاکستانی سکیورٹی ایجنسیوں نے اس الزام میں گرفتار کیا تھا کہ انہوں نے ۲۰۰۱ میں امریکی حملے کے خلاف لڑنے کے لیے ہزاروں نوجوانوں کو غیر قانونی طور پر افغانستان بھیجا تھا۔ القاعدة نے میدان شاہ سے مفتی آفتاب کو روانہ کیا کہ سوات میں موجود اپنے آدمی کو مستقبل کے لائحہ عمل اور طرزِ جہد سے آگاہ کیا جائے۔ تاہم کہانی اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ لال مسجد کے خونیں واقعے کے بعد سوات تحریک کا مقصد اسلامی عدالتوں کا قیام نہیں تھا اور نہ ہی مولانا فضل اللہ القاعدة کے حقیقی لیڈر تھے۔ القاعدة کے اصل لیڈر بنیامین تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے آئی ایس آئی کے حراستی مرکز میں بنیامین کے ساتھ وقت گزارا تھا یا سوات میں ان کی زیرِ کمان کام کیا تھا یا جو لوگ آپ کو بچپن سے جانتے تھے، آپ کے بارے میں دو باتوں پر متفق تھے: پاگل پن کی حدوں کو چھوتی ہوئی تنک مزاجی اور دلکش نظریں۔ بنیامین کا قد ۶ فٹ ۲ انچ تھا، فراخ سینہ، گورا رنگ اور گھنے بال تھے۔ دلکش نظریں خدائی عطا تھیں لیکن تنک مزاجی ودیعت کردہ نہیں تھی۔

ایک ایسے بھلے شائستہ نوجوان کو ایک مضبوط نظریاتی بنانے کے ذمہ دار حالات و واقعات تھے۔ مفتی آفتاب ،بنیامین کے بارے میں رپورٹیں اکٹھی کرتے اور القاعدة کو بھیجتے۔ القاعدة قیادت پُر یقین تھی کہ بنیامین ہی وہ آدمی ہے جو مستقبل میں سوات میں ریاستی حکام اور عوام کے درمیان دوریاں پیدا کر سکتا ہے۔ آپ محاز آرائی کو اس درجہ تک لے جانے میں متوقع تھے کہ جہاں پر پاکستان افغان امریکی جنگ کی حمایت کرنے کے قابل نہ رہے۔

القاعدۃ کی ہدایات اور بنیامین کے جنون مل گئے اور سوات میں نفاذِ اسلام کا مطالبہ ریاست کے خلاف بغاوت میں تبدیل ہو گیا۔

پتا نہیں یہ ان کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ آپ سوات کی پیوچار وادی میں پیدا ہوئے جو عسکریت پسندی کا گڑھ تھی۔ روایت ہے کہ یہ علاقہ سید احمد بریلویؒ کا ہیڈ کوارٹر رہا تھا۔ سید احمد بریلویؒ انیسویں صدی میں سکھوں کے خلاف جہادی تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ بنیامین کا تعلق مٹہ کے کمل گاؤں سے تھا۔ بہلول زئی قبیلے میں جنم لینے والے بنیامین لڑاکا یا شاعر نہیں تھے۔ آپ نے میٹرک میں سکول چھوڑ دیا تھا۔ ابھی آپ کی جوانی کا آغاز تھا کہ آپ افغانستان چلے گئے اور طالبان کے ہمراہ احمد شاہ مسعود کی شمالی اتحادی فوج کے خلاف لڑے۔ آپ پہلی لڑائی میں ہی گرفتار کر لیے گئے اور سات سال کا طویل عرصہ شمالی اتحاد کی غیر انسانی جیلوں میں گزارا۔ بنیامین کو یاد ہے کہ ان کے طالبان ساتھی کس طرح ان جیلوں میں سسک سسک کر مر گئے۔ بسا اوقات تو بات کرتے کرتے ہی کوئی دم توڑ دیتا۔ طالبان کی شکست کے بعد امریکا نے بنیامین کو رہا کر دیا۔ لیکن شمالی اتحادی جیلوں میں گزرے یہ سات سال ان کی تلخی کی اصل وجہ نہیں تھے۔ پنجشیری جیل سے رہائی کے بعد بھی غیر معمولی طور پر شائستہ اطوار تھے۔ آپ ہمیشہ مہمان کا کھڑے ہو کر استقبال کرتے۔ شادی اور عشقیہ زندگی ہمیشہ سے ایک پشتون کا ذاتی اور نجی معاملہ رہا ہے۔ ایک دیہاتی پس منظر والا پشتون کبھی بھی اپنے دل کے معاملات میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لیکن بنیامین بڑے فخر سے بتایا کرتے کہ شادی سے پہلے ان کی بیوی ان کی محبت میں گرفتار تھی اور افغانستان میں قید کے دوران میں ان کی صرف منگنی ہوئی تھی۔ خاندان کے تمام افراد نے ان کی بیوی کو منگنی ختم کر دینے اور کسی دوسرے شخص سے شادی کر لینے پر دباؤ ڈالا۔ لیکن پشتون روایات کے برخلاف اس عورت نے اپنے خاندان کی بات نہ مانی اور کہا کہ اس کا نام ہمیشہ کے لیے بنیامین کے نام

سے جڑ چکا ہے، خواہ وہ زندہ یا مردہ۔ رہائی کے بعد بنیامین گاؤں واپس آئے تو سب سے پہلے شادی کی اور اس بات پر انہیں فخر تھا کہ اس لڑکی نے اپنے خاندان کی طرف سے انہیں بھلا دینے کے لیے ڈالے جانے والا دباؤ بڑی استقامت اور ثابت قدمی سے برداشت کیا۔ بنیامین کہا کرتے تھے کہ شادی کے بعد افغان قید کے تمام درد اور کرب بھول گئے۔ ایسا لگتا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک محبت کرنے والی بیوی کے ساتھ آپ نے نئی زندگی شروع کی۔ آپ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا اور آپ پشاور منتقل ہو گئے۔ بنیامین نے مشرف حکومت میں کالعدم قرار دیے جانے والے عسکری گروپ جیشِ محمد میں شمولیت اختیار کی۔ چونکہ افغان جیلوں کے نظام کے بارے میں آپ کی معلومات دوسروں کی نسبت وسیع تھیں اور سینکڑوں پاکستانی افغان جیلوں میں قید تھے اس لیے آپ جیشِ محمد کے امورِ اسیر ان کے انچارج بنا دیے گئے۔ آپ کے ذمے افغان جیلوں میں قید ساتھیوں کی رہائی کے لیے کام کرنا تھا۔

دسمبر ۲۰۰۳ میں جب مشرف پر دو ناکام قاتلانہ حملے ہوئے تو جہادیوں کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ ان کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک برتا گیا۔ وہ ریاست جو پاکستانی جہادیوں کی سب سے بڑی حامی اور خیر خواہ تھی، اب بدل چکی تھی۔ بہت سے جہادیوں نے جدوجہد ترک کر دی اور بہت سے ریاست کے مخالف ہو گئے۔ بنیامین اس مؤخر الذکر گروہ میں سب سے نمایاں تھے۔ ۲۱، اگست ۲۰۰۴ کو پاکستانی سکیورٹی فورسز نے پشاور میں بنیامین کے گھر چھاپہ مارا۔ آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ سو رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں دو جہادی آصف چکوالی اور مفتی صغیر تھے۔ آصف اور صغیر پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہو گئے لیکن پولیس نے گھر میں گھس کر بنیامین اور ان کی اہلیہ کو پکڑ لیا اور انہیں گھسیٹ کر گاڑیوں تک لائے۔ بنیامین نیم خوابیدہ حالت میں تھے، لیکن آپ نے دیکھا کہ غیر مرد ان کی اہلیہ کو چھو رہے ہیں۔ آپ نے ایک زخمی شیر کی طرح ان پر حملہ کر دیا اور ان کی بندوقیں چھیننے کی کوشش کی۔

انہیں درجنوں سکیورٹی اہلکاروں نے بڑی مشکل سے قابو کیا۔ آپ اور آپ کی اہلیہ کو قید میں ڈال دیا گیا۔ بعد ازاں آپ کی اہلیہ اور بیٹے کو رہا کر دیا گیا لیکن بنیامین سکیورٹی اہلکاروں کے ہاتھوں اپنی بیوی کی تذلیل کو بھول نہ پائے۔ آپ کو مشرف پر قاتلانہ حملے کا کوئی علم نہیں تھا اور دورانِ تفتیش آپ نے سوالات کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ آپ جواب میں تفتیشی افسروں کے منہ پر تھوک دیتے اور رہائی کے بعد انہیں اور ان کے خاندانوں کو تباہ و برباد کرنے کی دھمکی دیتے۔ اس وجہ سے آپ پر بدترین تشدد کیا گیا۔ آپ کے تفتیشی آپ کو الٹا لٹکا کر مار پیٹ کرتے لیکن آپ جواب میں چیخ چیخ کر ایک ہی بات دہراتے کہ اگر میں زندہ رہا تو اس سب کا انتقام لینے ضرور آؤں گا۔ آپ کو باندھا گیا اور بیڑیاں پہنائی گئیں لیکن آپ کا غصہ کم نہ ہوا۔ دو ماہ کے تشدد اور تفتیش کے بعد قید خانے کے محافظ اور تفتیشی افسر تھک گئے اور آپ کو آئی ایس آئی کے ایک سیل میں قیدِ تنہائی میں ڈال دیا۔ آپ کے خلاف کوئی مقدمہ درج ہوا نہ کوئی عدالتی پیشی ہوئی۔ آپ نے اڑھائی سال اس قید تنہائی میں گزارے، اس دوران کوئی تشدد اور تفتیش نہ ہوئی لیکن پاکستانی فوج کے خلاف آپ کی نفرت میں کمی نہ آئی۔ آپ کے پہرے دار آپ کے زبانی حملوں کے عادی ہو گئے تھے اور آپ کی دھمکیوں کا مذاق اڑاتے۔ رہائی سے چند دن پہلے جب آپ اپنے کپڑے اور دوسرا سامان سمیٹ رہے تھے تو ایک پہرے دار نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا "بنیامین، اگر کسی دن تم مجھے سڑک پر چلتے ہوئے دیکھ لو تو تمہارا ردِ عمل کیا ہو گا؟" بنیامین کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ نے سفاک آواز میں جواب دیا "میں تیرا گلا کاٹ دوں گا۔"

۲۰۱۰ میں ایک اعلیٰ طالبان رہنما نے مجھے انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ شمالی وزیرستان کا ماحول ایسا عجیب و غریب ہے کہ بیس دنوں کے اندر اندر کوئی بھی شخص تکفیری ہو سکتا ہے۔ جیسے ہی بنیامین آئی ایس آئی کی قید سے رہا ہوئے آپ کو شمالی وزیرستان بلا لیا گیا جہاں پاکستانی

فوج کے خلاف آپ کی نفرت پر نظریاتی رنگ چڑھ گیا۔ مفتی آفتاب شمالی وزیرستان سے القاعدۃ کے سفیر کے طور پر سوات میں موجود تھے۔ وہ بنیامین کو شمالی وزیرستان لے گئے۔ القاعدۃ کے داعی کے لیے بنیامین کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ ایک جنگجو تھے جو اسلام کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اسلام کے لیے ہی انہیں زندگی قربان کرنا تھی، اگرچہ اسلام کے بارے میں ان کا علم رسمی نوعیت کا تھا۔ تاہم پاکستانی فوج کے لیے آپ کی نفرت ناقابل یقین تھی اور القاعدۃ کو اسی چیز کی تلاش تھی۔ بنیامین کو اپنا معسکر چلانے کے لیے رقم اور ازبک اور عرب جنگجو فراہم کیے گئے۔ آپ کی پہلی ذمہ داری بہت سادہ سی تھی۔ آپ نے مولانا صوفی محمد کی تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی کو اپنے ہاتھوں میں لینا تھا جو مولانا صوفی محمد کی گرفتاری کے بعد فضل اللہ کے کنٹرول میں تھی۔ ہزاروں لوگ تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی سے وابستہ تھے اور سوات اور مالاکنڈ ڈویژن میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے پر عزم تھے۔ بنیامین کو چپکے سے اس گروپ میں داخل کر دیا گیا۔

لال مسجد آپریشن کے بعد القاعدۃ مضطرب تھی۔ درجنوں لوگ مارے گئے اور اسلام آباد میں القاعدۃ کا اہم اثاثہ بغیر مقصد پورا کیے قربان ہو چکا تھا۔ ایک بھی شخص بغاوت کے لیے کھڑا نہ ہوا۔ مولانا عبد العزیز گرفتار ہو کر ذلیل ہوئے اور عبد الرشید غازی بہتے اشکوں میں دوسرے شہداء کے ساتھ دفنا دیے گئے۔ اس موقع پر اسامہ بن لادن نے پاکستان میں امیرِ خروج کا تقرر کیا۔ ان کا نام عبد الحمید عرف ابو عبیدۃ المصری تھا۔ اسامہ بن لادن نے انہیں ہدایت کی کہ جتنی جلدی ہو سکے ملک میں خروج کی تحریک منظم کی جائے اور القاعدۃ نے مشرقِ وسطیٰ کے معطیوں کو ہنگامی بنیادوں پر فنڈز فراہم کرنے کی ہدایت کی۔ جب یہ فنڈز وصول ہوئے تو فوراً القاعدۃ کے تمام گروپوں، جن میں بیت اللہ محسود اور بنیامین بھی شامل تھے، میں تقسیم کر دیے گئے۔ اہداف یہ تھے کہ ملک میں سیاسی ابتری پیدا کی جائے اور

ریاست کی رِٹ ختم ہو جائے۔ ان اہداف میں سے ایک بینظیر بھٹو بھی تھی۔ یہ واحد پاکستانی سیاست دان تھی جس نے لال مسجد آپریشن کی حمایت کی تھی۔ تاہم پاکستانی فوج کو ایک طویل مدت الجھائے رکھنے لیے سوات وادی میں بغاوت لازمی تھی۔ لال مسجد آپریشن کے فوراً بعد القاعدۃ نے اپنی صفوں کو سوات میں بغاوت کے لیے متحرک کر دیا۔ لال مسجد کے شہداء کی تدفین کے تیسرے روز یہ بغاوت شروع ہو گئی۔

سوات وادی میں امام ڈھیری میں مولانا فضل اللہ اور ان کے ساتھی مغموم بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ حکومت سے آپ کا کیا اختلاف ہے؟ (لال مسجد آپریشن کے فوراً بعد میں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر سوات پہنچ گیا تھا جو میرے اندازے کے مطابق اگلا میدان جنگ تھا)۔ مولانا فضل اللہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ حکومت میرے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن پر اعتراض کرتی ہے۔ میں ان اعتراضات کو نہیں مانتا۔ میرے ریڈیو اسٹیشن غیر تجارتی ہیں جہاں سے میں صرف اسلامی پروگرام نشر کرتا ہوں۔ لیکن بہت سے دوسرے ایف ایم ریڈیو بھی غیر قانونی ہیں مگر وہ موسیقی اور فحاشی پھیلاتے ہیں اس لیے حکومت ادھر توجہ نہیں کرتی۔ مجھے فضل اللہ کی وضاحت عجیب سی لگی۔ سوات میں پر تشدد واقعات کئی بار ہو چکے تھے۔ جنگجو فلموں والی دکانیں تباہ کر رہے تھے اور حکومتی رٹ پر سوالیہ نشان لگ چکا تھا۔ مزید یہ کہ لال مسجد آپریشن کے بعد پہلا ردِ عمل سوات میں سامنے آیا جہاں جنگجوؤں نے فوج کے قافلے پر حملہ کیا۔ فضل اللہ نے کہا کہ پاکستانی فوج سے ان کے اختلافات ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ برطانوی استعماریت کا تسلسل تھی لیکن انہوں نے صریحاً انکار کر دیا کہ پر تشدد واقعات میں ان کا کوئی ہاتھ ہے۔ جب میں نے اس دن فوج پر ہونے والے حملے کا ذکر کیا تو فضل اللہ کہنے لگے کہ فوجی قافلے پر ہونے والے آج کے حملے کا الزام بھی ان پر لگایا جائے گا۔ میں آپ کو بتا دوں کہ میں مولانا عبد العزیز کے ساتھ تھا اور اب بھی ان کے ساتھ

ہوں۔ لیکن میرا یہ ماننا ہے کہ نفاذِ شریعت حکومت کی ذمہ داری ہے کسی فرد کی نہیں۔ ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ حکومت شریعت کا نفاذ کرے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

انٹرویو کے دوران جب میں نے ان پر تشدد کے فروغ کا الزام لگایا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ سوات میں کئی دوسرے گروپ بھی کام کر رہے ہیں جن پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ فضل اللہ کھڑے ہوئے، معذرت کی اور یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ مجھے اسی وقت اپنے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن پر جا کر یہ اعلان کرنا ہے کہ ان حملوں میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور سوات میں فوج کی موجودگی سے عوام برہم نہ ہوں۔ مجھے علاقے کے لوگوں سے مسلسل رابطے میں رہنے کی ضرورت ہے اور میں انہیں جوابی حملوں اور تشدد سے باز رہنے کو کہتا ہوں۔

سوات میں جنگجوؤں کے ساتھ چند دن گزارنے کے بعد میں یہ جان گیا تھا کہ فضل اللہ اور اس کے گروپ کا اسلام کے بارے میں تصور سوات میں نفاذِ اسلام تک محدود تھا۔ یہ سوات کے عوام کا دیرینہ مطالبہ تھا اور اس وقت سے تھا جب ۱۹۶۰ کی دہائی میں ریاست سوات کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہوا تھا۔ اس وقت تک عدالتیں بہر حال اسلامی شریعت کے مطابق چل رہی تھیں لیکن یہ واضح تھا کہ سوات سے باہر جنگجو طالبان مزاحمت کی اسی طرح حمایت کرتے تھے جیسے بلوچستان اور پختونخوا کے پشتون کرتے ہیں۔ سوات میں تشدد کی لہر کے باوجود انقلاب ایک سوال بنا کھڑا تھا۔ فوجی آپریشن ناگزیر ہو چکا تھا۔ دسمبر ۲۰۰۷ میں پہلی فوجی کارروائی میں ہی فضل اللہ کا گروپ تتر بتر ہو گیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سوات وادی میں حالات بدل گئے۔ سوات وادی میں یہ عسکریت پسندوں کا سب سے بڑا گروپ تھا اور پاکستانی خفیہ ایجنسیوں نے اسے تورا بورا گروپ کا نام دیا تھا کیونکہ اس گروپ میں مقامی پشتون، ازبک اور عرب شامل تھے جن کی قیادت بنیامین کر رہے تھے۔

دسمبر ۲۰۰۷ میں فضل اللہ کی شکست کے بعد بنیامین ایک بڑے رہنما بن کر ظاہر ہوئے اور جنوری ۲۰۰۸ تک لوگ حیران تھے کہ سوات کے ان درویش صفت لوگوں کو ہو کیا گیا ہے۔ بنیامین گروپ نے فوجی قافلوں پر حملے کیے اور فوجیوں کو ذبح کیا۔ انہوں نے فلم بندی کی اور سارے ٹی وی چینلز کو بھیج دی۔ قاری حسین اور بنیامین نے سوات میں دہشت کا راج قائم کر دیا۔ انحراف کا مطلب تھا دردناک موت۔ چند ہی ہفتوں میں سوات سے پولیس محکمے کا صفایا ہو گیا اور فوجی سوات میں تعیناتی سے ڈرنے لگے۔ پاکستانی حکومت نے مقامی آبادی کو جنگجوؤں کے خلاف مسلح کرنے کی کوشش کی لیکن جس نے بھی اسلحہ لیا، اذیت ناک موت اس کا مقدر بنی۔ بریلویوں کے ممتاز روحانی پیشوا پیر سمیع اللہ اور ان کے مریدوں کو جدید ترین اسلحہ فراہم کیا گیا لیکن اس سے پہلے کہ پیر صاحب کے مرید کوئی کارروائی کرتے، دربار پر حملہ ہو گیا۔ پیر سمیع اللہ اور اس کے درجنوں مرید مار دیے گئے۔ بنیامین مجنونانہ پیر سمیع اللہ کی نعش ڈھونڈتے رہے لیکن نہ ملی۔ آخر انہیں پتا چلا کہ پیر سمیع اللہ کو دفنا دیا گیا ہے۔ بنیامین نے قبر کھود کر نعش نکالی اور کئی دن تک اسے کھمبے پر لٹکائے رکھا تاکہ ان سے دشمنی کرنے والے عبرت حاصل کریں۔ بنیامین گروپ نے سوات کے سارے بنک اور پشاور سے حکومتی ملازمین کی تنخواہیں لے کر آنے والی گاڑیاں لوٹ لیں۔ اس طرح انہوں نے اپنا اسلحہ خانہ بڑھایا اور اپنے گروپ کے روزانہ خورد و نوش کا انتظام کیا۔

۲۰۰۸ کے آخر تک سوات مکمل طور پر باغیوں کے کنٹرول میں تھا اور حکومت بے بس ہو چکی تھی۔ حکومتی رسد کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ فوج نے تمام میدانی چیک پوسٹیں خالی کر دیں اور پہاڑی چوٹیوں پر جا ٹھہری جہاں سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے خوراک اور اسلحہ پہنچایا جاتا۔ پاکستانی فوج کے لیے یہ حالت بند گلی جیسی تھی۔ اس پر عالمی میڈیا نے خبریں نشر کر دیں کہ سوات طالبان کے قبضے میں آ چکا ہے۔ راولپنڈی کے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے

ہکا بکا ملٹری کمانڈر پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔ تاہم اس بات پر اجماع تھا کہ بہت بڑی فوج کے بغیر جنگجوؤں سے لڑنا ممکن نہیں ہے اور اس کام کے لیے انڈین سرحدوں سے فوج ہٹانا پڑے گی۔ پاکستانی مسلح افواج کے دانشور مغزماری کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس صورتحال کا حل یہی ہے کہ سوات میں جنگجوؤں کا نفاذِ اسلام کا مطالبہ مان لیا جائے۔

آئی ایس آئی کے داخلی سکیورٹی سیکشن کے مطابق یہ کام مولانا صوفی محمد کے ذریعے کروایا جاسکتا ہے۔ آئی ایس آئی کے صوفی محمد سے پرانے رابطے تھے اس لیے جیل میں انہیں آرام دہ رہائش دی گئی تھی۔ صوفی محمد کو جیل میں رکھ کر یہ دکھاوا دیا گیا تھا کہ ۲۰۰۱ میں امریکا کے خلاف ہزاروں نوجوان افغانستان بھیجنے پر ان کے خلاف کارروائی کی گئی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آئی ایس آئی کے ایجنٹ انہیں ترپ کے پتے کے طور پر انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے جسے وہ بوقتِ ضرورت کام میں لا سکیں۔ لیکن صوفی محمد آئی ایس آئی کے ایجنٹ نہیں تھے۔ آپ واقعی ایک سادہ لوح مسلمان تھے جو سوات میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے تھے جیسا کہ سوات ریاست میں پہلے سے موجود تھا۔ بے شک آپ پاکستانی فوج کے وفادار تھے اور ۱۹۹۰ میں بینظیر بھٹو کی حکومت غیر مستحکم کرنے کے لیے شاہراہِ ریشم بند کرکے بڑی مکاری سے آپ سے فائدہ اٹھایا گیا۔ پاکستانی فوج کے میجروں اور کرنیلوں نے صوفی محمد کو قائل کیا کہ وہ سوات میں جاری تشدد کی مذمت کرتے ہوئے اپنا بیان جاری کریں اور اپنے داماد فضل اللہ سے لاتعلقی کا اعلان کریں۔ چونکہ صوفی محمد نے ہی فضل اللہ کی تربیت کی تھی اور ہزاروں جنگجو ان کے جان نثار تھے اس لیے آئی ایس آئی پُراعتماد تھی کہ ایک بار صوفی محمد نے سوات میں ذمہ داری قبول کرلی تو حالات تبدیل ہو جائیں گے۔

شمالی وزیرستان میں بیٹھی القاعدۃ نے اسے مختلف انداز سے دیکھا۔ القاعدۃ نے بڑی کامیابی سے تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی کو ہائی جیک کیا اور سوات کے جنگجوؤں کے ذہنوں میں

اپنے نظریات ڈال دیے۔ پاکستانی مسلح افواج دلدل میں پھنس گئی۔ رسد منقطع ہونے کی وجہ سے فوج جنگجوؤں کی دوبارہ تنظیم کو روک نہ پائی اور جنگجوؤں نے افغانستان میں نیٹو اور ایساف کے خلاف تازہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ حالات زیادہ خراب ہوئے تو عام آدمی نے اپنی بقا کے لیے مختلف انداز سے سوچنا شروع کر دیا۔ انہوں نے عسکریت پسندی کی ابدی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے پاکستانی فوجی قیادت سے اصرار کیا کہ وار آن ٹیرر میں امریکی حمایت ترک کی جائے۔ صوفی محمد کی رہائی اور فعالیت سے امن یقینی تھا اور اس دوران فوج کو مہلت ملتی کہ وہ معاملات پر درست حکمت عملی اپنائے۔ لیکن القاعدۃ صوفی محمد کی مخالفت نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسے پاکستانی فوج کا مبلغ بنتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

پھر القاعدۃ نے صوفی محمد کو گھیرنے اور سوات کو الگ کرنے پر کام کیا۔ جنوری ۲۰۰۹ میں سوات وادی بھوت بنگلہ بن چکی تھی جس کے چپے چپے پر عسکریت پسندوں کا قبضہ تھا۔ لیکن صوفی محمد کے آنے سے حالات یکدم پلٹا کھا گئے۔ کل کے مجرم کو آج پورے سرکاری تشریفات (Protocols) کے ساتھ پشاور لایا گیا اور یہاں پر سوات، مالاکنڈ اور کوہستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا معاہدہ دستخط کیا گیا۔ صوفی محمد نے رپورٹروں کو بتایا کہ:

> ہم جلد ہی طالبان سے مذاکرات شروع کریں گے۔ ہم انہیں ہتھیار رکھ دینے کو کہیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری بات مان لیں گے۔ ہم امن کی بحالی تک سوات میں موجود رہیں گے۔

راولپنڈی میں بیٹھی عسکری قیادت نے معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد سکھ کا سانس لیا۔ انہوں نے کامیابی سے اپنا پتا پھینکا تھا اور اب حالات قابو میں تھے۔ ملا فضل اللہ جنگ بندی کا اعلان کر چکے تھے۔ سوات میں زندگی معمول پر آ گئی۔ لوگوں نے وادی میں امن پر شکر ادا کیا۔ مگر عالمی میڈیا نے سوات میں اسلامی قوانین کے نفاذ پر پاکستانی حکومت

کے خلاف مہم شروع کر دی۔ انہوں نے اسے آنے والے حالات کا پیش خیمہ کہا۔ پاکستان نے وار آن ٹیرر میں اپنے اتحادیوں کے ساتھ اس مسئلے پر بات چیت کی اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ سوات میں امن کے قیام کے لیے یہ چیز ناگزیر تھی۔ پاکستان نے اپنے دستے سوات سے نکال کر انہیں نیٹو سے لڑنے والے عسکری گروپوں کے خلاف دوبارہ سے قبائلی علاقوں میں تعینات کر دیا۔ عالمی برادری نے اس اقدام کی حمایت کی۔

تاہم القاعدۃ سوات میں تیزی سے معمول پر آتی صورتحال پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اسلام کا جو ورژن وہاں پر نافذ کیا جا رہا تھا، اس کے لیے ناقابل قبول تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ سوات میں امن ہوتا تو پاکستان کی مسلح افواج وادی سے نکل کر قبائلی علاقوں میں جنگجوؤں کے خلاف آپریشن شروع کر دیتی جس سے القاعدۃ کی افغان لڑائی پر زد پڑتی۔ القاعدۃ کے سفیر ایک بار پھر متحرک ہو گئے۔ بنیامین کو اپنا کردار ادا کرنے کے لیے کہا گیا۔ جب ہر کام امریکی اور پاکستانی حکام کے منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا تو بنیامین کی زیرِ قیادت جنگجوؤں نے بونیر پر دھاوا بول دیا۔ اپریل ۲۰۰۹ کا پہلا ہفتہ تھا اور اسلام آباد بونیر سے محض ۶۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ جنگ بندی کا معاہدہ ختم ہو گیا اور پاکستانی میڈیا نے شہ سرخیاں جمانا شروع کر دیں کہ اسلام آباد طالبان کے قبضے سے صرف ۶۵ میل کی دوری پر ہے۔ فروری ۲۰۰۹ میں بہتر ہونے والے حالات ڈرامائی انداز سے اپریل ۲۰۰۹ میں ابتر ہو گئے۔ حکومت دوبارہ میدان میں اتر آئی اور صوفی محمد سے رابطہ کیا لیکن ان کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ان کا فون اٹھانے والے نوجوان مطلوبہ شخص سے رابطہ کروانے سے انکار کر دیتے۔ حالات پلٹا کھا گئے۔ خاص طور پر اس وقت جب صوفی محمد نے امن کی حمایت ختم کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت نے مختلف ذرائع کے ذریعے صوفی محمد کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ صوفی محمد کی حمایت حاصل کرنے کے لیے لبرل اور سیکولر جماعتوں اور فوج کے دباؤ کے باوجود صدر

پاکستان آصف زرداری نے مالاکنڈ، سوات اور کوہستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا آرڈیننس جاری کیا۔ القاعدۃ کا یہ مقصد ہی نہیں تھا۔ اس کا مقصد تو ایسے حالات پیدا کرنا تھا کہ پاکستانی حکومت وار آن ٹیرر کی حمایت سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو جائے۔

آخر کار جب صوفی محمد منظر عام پر آئے تو مینگورہ (سوات) کے میدان میں ہزاروں لوگ ان کی تقریر سننے کے لیے جمع ہو گئے۔ سوات کے عوام اور پاکستانی فوج کی ساری امیدیں صوفی محمد سے وابستہ تھیں کہ وہ بونیر پر طالبان کے قبضے سے پیدا ہونے والی محاذ آرائی کا خاتمہ کر دیں گے۔ لیکن جب صوفی محمد سٹیج پر آئے تو وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ساتھ آٹھ خودکش حملہ آور بھی تھے۔ بنیامین صوفی محمد کے پاس آئے اور انہیں ایک لکھی ہوئی تقریر تھمائی اور کہا کہ یہ مجاہدین کی طرف سے ہے۔ براہِ کرم یہ تقریر پڑھیے۔ صوفی محمد نے رضامندی سے سر ہلایا۔ پھر انہوں نے مجمعے سے خطاب شروع کر دیا۔ ہر لفظ گویا ایک دھماکا تھا۔ اس تقریر نے بے رحمی سے امن معاہدے کے پرخچے اڑا دیے۔ صوفی محمد نے کہا:

"اسلام میں جمہوریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مغربی جمہوریت کافروں کا نظام ہے جس نے مسلمان علماء اور عوام کو گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ بھی بتکدے ہیں جو اللہ کے راستے سے انحراف پر مبنی نظام ارتداد کو مضبوط بنا رہے ہیں۔"

آپ نے مالاکنڈ اور کوہستان کے ججوں کو چار دن کی مہلت دیتے ہوئے کہا کہ مقدمات سننے کے لیے دارالقضا قائم کیا جائے اور حکومت کی قاضی عدالتوں کے خلاف فیصلے سنائے جائیں۔ آپ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ دوسرے ضلعوں اور تحصیلوں میں بھی قاضیوں کا تقرر کیا جائے۔ آپ نے خبردار کیا کہ اگر ہمارے مطالبے پورے نہ کیے گئے تو نتائج کی ذمہ دار حکومت ہو گی۔ پوری دنیا میں اسلامی نظام کا قیام ضروری ہے کیونکہ یہ زمین اللہ کی ہے اور

موجودہ قوانین ناقابل قبول ہیں۔ آپ نے کہا کہ صدر اور قومی اسمبلی کے زبانی کلامی کہنے سے نظام عدل آرڈیننس کی کوئی وقعت نہیں ہے کیونکہ پولیس اور فوج کی حمایت ہی نہیں ہے۔

صوفی محمد کی تقریر نے حالات بدل دیے۔ عالمی میڈیا نے شور مچا دیا کہ سوات میں طالبان حکومت قائم ہو گئی ہے اور عالمی خلافت کا آغاز ہو چکا ہے۔ امریکا کی طرف سے شدید ترین ردعمل سامنے آیا۔ امریکی سینیٹر Ted Kaufman نے بیان دیا کہ امریکا کے لیے سب سے بڑا چیلنج پاکستان میں طالبان سے لڑنا ہے۔ پاکستان اب ایک بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ امریکی سینیٹر نے کہا کہ سوات میں طالبان کے ساتھ صلح نامے سے انہیں بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستانی حکومت طالبان سے دو ہاتھ کرنے پر تیار نہیں ہے لیکن یہاں آکر مجھے پتا چلا کہ در اصل اس کے پاس یہ صلاحیت اور اہلیت ہی نہیں ہے۔ حکومتِ پاکستان اور طالبان کے مابین سوات معاہدے سے اسلام آباد پر بھی اثرات پڑیں گے جو اس وادی سے صرف ۱۰۰ کلو میٹر دور ہے۔

القاعدۃ نے اپنی حکمت عملی کے لیے ساز گار حالات پیدا کرنے کے لیے جدلیاتی عمل کا کامیاب استعمال کیا۔ مئی ۲۰۰۹ میں سوات میں دوسری بڑی لڑائی شروع ہو گئی اور فوج نے آپریشن راہِ راست کا آغاز کر دیا۔ اس آپریشن سے سوات اور مالاکنڈ کے تقریباً ۲۲ لاکھ لوگ نقل مکانی کرنے اور پناہ گزیں کیمپوں میں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے۔ پاکستان آرمی نے منگلا سٹرائک دستے بھی صفوں میں شامل کر دیے جو صرف انڈیا سے لڑائی میں استعمال ہوتے تھے۔

فوج نے پیش قدمی کے لیے فضائی مدد کا سہارا لیا اور جنگجوؤں کے ٹھکانوں پر بمباری کی۔ سوات آپریشن میں ایس ایس جی کمانڈو بھی شریک ہوئے۔ سیکڑوں جنگجو پکڑ کر بنا کسی مقدمے اور تفتیش کے قتل کر دیے گئے۔ یہ لڑائی جولائی ۲۰۰۹ کے آخری ہفتے تک جاری

رہی اور جنگجو پسپائی اختیار کرتے ہوئے کوہ ہندوکش اور افغان صوبوں کنڑ اور نورستان میں چلے گئے۔ القاعدۃ کے نقطہ نظر سے یہ ایک کامیابی تھی کیونکہ پاکستانی فوج کی توجہ مہمند اور باجوڑ کے لائن ہارٹ آپریشن سے بٹ چکی تھی۔ جنگجو قبائلی علاقوں میں دوبارہ منظم ہو گئے اور قریبی افغان صوبوں میں بھرپور حملے کیے۔ سوات آپریشن القاعدۃ کے جدلیاتی عمل کے لحاظ سے مکمل کامیابی تھا کیونکہ پوری قوم نظریاتی طور پر تقسیم ہو چکی تھی۔

پھر پاکستانی سیکولر پاکستان میں جاری اسلام کاری کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے پاکستانی مدارس کے پر کاٹنے کا واویلا کرنا شروع کر دیا۔ حکومت نے ماڈرن صوفیوں کے مذہبی اجتماعات کروائے جہاں طالبان کے خلاف بولا گیا۔ طالبان نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے انکے ممتاز مذہبی رہنماؤں مثلاً مولانا سرفراز نعیمی کو شہید کر دیا۔ بظاہر نظر آتا تھا کہ فضا جنگجوؤں کے لیے ناساز گار ہو چکی ہے لیکن پسِ پردہ القاعدۃ پاکستانی معاشرے کے نظریاتی تضادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نظریاتی تقسیم کو مزید واضح کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ پاکستانی اسلام پسندوں اور سیکولروں کے مابین اس تنازع سے القاعدۃ کے جدلیاتی عمل کا ہدف یہ تھا کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ پاکستان پر حکومت کرنا مشکل ہو جائے اور جنگجو بلوچستان اور خیبر پختونخوا کا کنٹرول سنبھال لیں۔ یہ دونوں صوبے افغانستان میں نیٹو کے خلاف جنگ میں القاعدۃ سرگرمیوں اور تربیتی مراکز کا گڑھ بننے جا رہے تھے۔ القاعدۃ کے اس جدلیاتی عمل اور اہداف کے عملی حصول میں ہزاروں لوگ بے گھر ہوئے، سیکڑوں قتل ہوئے، قومی معیشت تباہی کے دہانے پر جا پہنچی اور پاکستان مکمل طور پر امریکی امداد کا محتاج ہو گیا۔ لیکن ان سب چیزوں سے القاعدۃ صرف محدود کامیابی کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ القاعدۃ پاکستان کے قبائلی علاقوں اور بنوں، لکی مروت اور پشاور کے شہری علاقوں پر کنٹرول حاصل

کرنے میں ضرور کامیاب ہوئی لیکن اسے معلوم تھا کہ ان علاقوں پر اس کا کنٹرول چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چلے گا۔

تاہم اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے القاعدۃ نے نیٹو رسد پر حملے کیے ، اپنے لوگوں کو دوبارہ منظم کیا اور افغانستان میں نیٹو فوج پر حملے کیے اور افغانستان کے ۸۰ فیصد علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان حالات میں امریکا مزید فوج افغانستان میں بلانے پر مجبور ہوگیا۔ اس جدلیاتی عمل کا اطلاق وحشیانہ اور ظالمانہ نظر آتا ہے لیکن القاعدۃ کے لیے دنیا کے امیر ترین اور طاقتور ترین ملک کا مقابلہ کرنے اور جنگ کو فیصلہ کن مرحلے میں لانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

باب نمبر 7
عقابوں کے نشیمن

طالبان نے ۲۰۰۶ میں کامیاب واپسی کر کے ان لوگوں کو حیران کر دیا جو ۲۰۰۱ میں امریکی حملے کے بعد ان کی مکمل تباہی کی پیش گوئیاں کر رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پناہ لی، نئے لوگ بھرتی کیے، تربیتی پروگرام چلائے اور وسائل کی فراہمی کے نئے طریقے اپنائے۔ اگلے پانچ برسوں میں یہ لوگ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا سامنا کرنے کے قابل ہو گئے۔ مغربی اتحادیوں کو اس بات کی خبر ہوئی تو انہوں نے نئی حکمت عملی سوچنا شروع کر دی۔ اس نئی حکمت عملی کا نام ایف پاک سٹریٹیجی رکھا گیا یعنی افغانستان اور پاکستان ایک ہی میدان جنگ قرار پائے۔ یہ حکمت عملی اس حقیقت کی غماز تھی کہ اصل میدان جنگ ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف واقع پہاڑی سلسلے ہیں اور اگر جنوبی ایشیا اور وسط ایشیا سے عسکریت پسندی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرنا ہے تو ان علاقوں میں بھرپور جنگ لڑی جائے۔ ایف پاک اصطلاح ایک تجربہ کار امریکی سفیر رچرڈ ہالبروک کی اختراع تھی۔ اس نے کہا:

> "سب سے پہلے تو ہم افغانستان اور پاکستان کی صورتحال کو ایف پاک کا نام دیتے ہیں۔ اس کا مقصد اختصار پسندی نہیں ہے۔ اس کا مقصد اس بات کا اشارہ کرنا اور شعور میں یہ بات نقش کرنا ہے کہ میدان جنگ صرف ایک ہے۔ اس میدان جنگ میں ایک ڈیورنڈ لائن ہے جس کی مغربی جانب نیٹو اور دوسری فوجیں لڑنے کے قابل ہیں۔ مشرقی جانب یہ پاکستانی حکومتی خطہ ہے۔ لیکن یہ مشرقی خطہ ہی ہے جہاں پر عالمی دہشت گرد تحریک واقع ہے۔ اس شعور کے ساتھ امریکا نے ۲۰۰۸ کے بعد ایسی پالیسی اپنائی جس میں نیٹو فورسز سرحد کے دونوں طرف کارروائیاں کر سکیں۔ انسانی اور

تکنیکی شعبوں میں معلومات کی شراکت کا ایک نیا نظام وضع کیا گیا اور ہندوکش کے پہاڑوں میں جنگجوؤں کے ٹھکانون پر حملے کرنے کے لیے نئی عسکری حکمت عملی ترتیب دی گئی۔ سب سے پہلے سرحد کے دونوں طرف جنگجوؤں کی رسد منقطع کرنے اور پھر ان کی محفوظ پناہ گاہوں کو ختم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ پاکستان اور امریکہ کے مابین خفیہ معاہدہ ہوا جس کے بعد پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملوں میں القاعدۃ کے اہم ترین رہنما مارے گئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق یہ خفیہ معاہدہ صدر آصف زرداری کے دورۂ امریکا میں کیا گیا۔ مشترکہ مطلوبہ اہداف کی فہرست بنائی گئی اور ڈرون حملوں میں باہمی تعاون کے نئے طریقے اپنائے گئے۔ اس معاہدے کے پیچھے زرداری حکومت اور اشفاق پرویز کیانی کی یہ سوچ تھی کہ داخلی طور پر واضح ترین خطرہ اسلامی عسکریت پسند ہیں نہ کہ جدی پشتی دشمن ہندوستان۔" (David Ignatius, Washington Post, 4 November, 2008)

مئی ۲۰۰۴ سے ۳۰ اگست ۲۰۰۸ تک پاکستان کے قبائلی علاقوں میں صرف ۱۳ ڈرون حملے ہوئے تھے لیکن ۸ ستمبر ۲۰۰۸ سے ۱۶ اپریل ۲۰۱۰ تک ۸۶ ڈرون حملے ہوئے۔ ان ڈرون حملوں کے ساتھ بیک وقت امریکی اور پاکستانی فوج نے آپریشن کیا جسے پاکستان میں آپریشن شیر دل اور افغانستان میں آپریشن لائن ہارٹ کا نام دیا گیا۔ شیر دل آپریشن فروری ۲۰۰۹ تک جاری رہا اور اس کے نتیجے میں ۳لاکھ لوگ بے گھر ہو کر دربدر ہوئے۔ پاکستانی فوج اور نیٹو نے ان علاقوں میں طالبان اور القاعدۃ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ لیکن جیسے ہی پہاڑوں پر برف پگھلی اور بہار کا آغاز ہوا تو جنگجو منظم انداز میں پہلے سے بھی زیادہ خطرناک کھیل کھیلتے

ہوئے دکھائی دیے۔ اگست اور ستمبر میں افغانستان میں ان کے حملوں نے نیٹو کو دہلا دیا۔ امریکا نورستان میں اپنے بیس خالی کرنے پر مجبور ہو گیا اور نومبر کے آخر میں افغان طالبان نے نورستان میں اپنے قبضے کا نظارہ پوری دنیا کو دکھانے کے لیے عالمی میڈیا کو دعوت دی۔ آپریشن شیر دل کے بعد پاکستانی فوج نے نیٹو کے ساتھ مل کر باجوڑ اور مہمند میں زمینی دستے صف آرا کر دیے۔ لیکن حالات ابتری پذیر رہے اور بالآخر امریکا نے نورستان میں کورنگل وادی سے انخلا کا اعلان کر دیا۔ اس سے ۱۹۸۶ میں روسیوں کی کورنگل وادی سے پسپائی کی یاد تازہ ہو گئی کیونکہ اس واقعے سے مجاہدین کی فتح اور روسیوں کی شکست کا آغاز ہوا تھا۔ مجاہدین کے خیال میں انہوں نے کابل تک روسیوں پر اتنے حملے کیے تھے کہ تین برسوں کے اندر اندر روسی بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

اگست ۲۰۰۶ سے امریکی ڈرون قبائلی علاقوں پر بمباری کرتے رہے اور پاکستانی سکیورٹی فورسز نیٹو کے ساتھ مل کر زمینی کارروائیاں کرتی رہی۔ جنوبی وزیرستان، باجوڑ، مہمند اور خیبر ایجنسی اور اور کزئی ایجنسی سے تقریباً دس لاکھ لوگ بے گھر ہوئے لیکن اس کے باوجود بھی دنیا کی بہترین فوجیں طالبان اور القاعدۃ کی کٹی پھٹی فوجوں کو شکست نہ دے پائیں۔ درحقیقت ان حملوں سے القاعدۃ کوہ ہندوکش اور ملحقہ پہاڑی سلسلوں میں مزید مضبوط ہوئی اور اس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ بغیر کوئی ہزیمت اٹھائے وہ دنیا کی بہترین افواج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا ہے کہ تنہا مادی وسائل ہی نہیں بلکہ غیر معمولی حالات، جغرافیہ اور شاہین جیسی آزاد مزاجی کسی بھی مزاحمتی تحریک کے لازمی اجزائے ترکیبی ہیں۔ اپنی مشہور نظم "شاہین" میں آپ لکھتے ہیں کہ:

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا

جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو

ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

افغانستان اور پاکستان کے درمیان واقع پہاڑوں میں محفوظ پناہ گاہیں بنانے والے القاعدۃ کے لوگوں کی زندگیاں اقبال کے الفاظ کے عین مطابق ہیں۔ وہ ہندوکش کی پہاڑی چوٹیوں میں اپنے نشیمن سے اپنے شکار نیٹو اور پاکستانی فوج پر جھپٹتے ہیں۔

گیارہ ستمبر کے بعد القاعدۃ کے ارکان کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ القاعدۃ کی بیرونی کارروائیوں کا ذمہ دار تھا اور القاعدۃ کے عالمی نیٹ ورک کا حصہ تھا۔ دوسرا گروہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو طویل عرصے تک افغانستان میں الجھائے رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ خالد شیخ محمد، رمزی اور ابوعبیدۃ اور دوسرے لوگ بیرونی کارروائیوں سے منسلک تھے اس لیے ان کا پاکستان کے شہری علاقوں میں رہنا زیادہ مناسب تھا۔ یہ سب کے سب پاکستانی شہروں سے گرفتار ہوئے۔ لیکن القاعدۃ کے عسکری کمانڈر مثلاً خالد حبیب اور ابولیث اللیبی جو القاعدۃ کی افغان حکمت عملی سے جڑے ہوئے تھے اور قبائلی علاقوں میں رہ رہے تھے، وہ سب کے سب پہاڑوں میں شہید ہوئے۔ پاکستانی شہر ہوں یا اس کے قبائلی علاقے، القاعدۃ کے ارکان کا مقصد چھپ کر زندگی گزارنا نہیں بلکہ امریکی مفادات کے خلاف مشن سرانجام دینا تھا۔ القاعدۃ کے جو لوگ شہروں میں گرفتار ہوئے ان کی گرفتاری کی وجہ یہی تھی کہ وہ میدان میں فعال ہوئے تو خفیہ ایجنسیوں کی نظروں میں آ گئے۔ اسی طرح القاعدۃ کے جو کمانڈر قبائلی پہاڑوں میں شہید ہوئے وہ بھی میدان جنگ میں لڑ رہے تھے۔

پاکستان کے قبائلی علاقوں میں رہنا القاعدۃ کا عسکری فیصلہ تھا۔ گوریلا جنگ لڑنے کے لیے ان علاقوں سے زیادہ موزوں جگہ پوری دنیا میں نہیں ہے۔ یہ ایک قدرتی خطہ ہے جہاں پر دفاعی اور اقدامی دونوں طرز کی جنگیں لڑی جا سکتی ہیں۔ اس میں ایسے ایسے خفیہ راستے ہیں جہاں سے دشمن پر مہلک حملے کر کے فرار ہونا اور بے نام ونشان رہنا بہت آسان ہے۔ جب القاعدۃ مغربی فوجوں کو للکار رہی تھی تو اس کے لیے مناسب خطے کا انتخاب کلیدی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ الف لیلوی داستان کے جادوئی قلعے جیسا ہے کہ جس کے گرداگرد ایسی بھول بھلیاں ہیں کہ دشمن کے لیے رسائی حاصل کرنا ناممکن سے بھی آگے کی چیز ہے۔ القاعدۃ کو اس سے بہتر خطہ کہیں اور میسر نہیں آ سکتا تھا چاہے یہ یمن کے پہاڑ ہوں، عراق کے شہر اور صحرا ہوں یا صومالیہ کے جنگل۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں پر کوئی بھی روایتی فوج یا سپیشل فوج کام نہیں دے سکتی خواہ وہ کتنے ہی جدید اور حساس ہتھیاروں سے مسلح کیوں نہ ہو۔ صرف کٹی پھٹی ملیشیا جو عقاب کی طرح آزادانہ گھومتی پھرتی ہو، زندہ رہ سکتی ہے اور لڑائی لڑ سکتی ہے۔

طالبان کی جدوجہد

کوہ ہندوکش، کنڑ، مہمند اور باجوڑ میں صبح سے شام تک سفر کریں تو پتا چل جائے گا کہ ہندوکش میں جنگ کا کیا مطلب ہے۔ ایک طرف دنیا کی امیر ترین، سب سے بڑی اور بہترین اسلحے والی فوج ہے اور دوسری طرف دنیا کی غریب ترین ملیشیا۔ کنڑ وادی میں میرا صحافتی کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا جب میرے میزبان زبیر نے مجھے گاؤں پر ممکنہ حملے کی اطلاع دی۔ زبیر، میں اور دوسرے دو طالبان شام کی نماز پڑھ کر زبیر کے گھر سے نکل پڑے۔ یہ ۱۵ مئی ۲۰۰۸ کا دن تھا اور ہم گاؤں سے پہاڑوں کی طرف جانے والے رستے پر چل رہے تھے تاکہ مہمند پہنچا جائے۔ میں ایک شہری باشندہ تھا اور پہاڑی راستوں سے بالکل نابلد، لہٰذا میری وجہ سے طالبان کی رفتار بھی سست رہی۔ جب ہم نے سفر شروع کیا تو سبز وادی پر شام کے

اندھیرے گہرے ہو رہے تھے۔ ہمیں دھماکوں کا شور سنائی دیا اور گولیاں چلنے لگیں اور ہم درختوں میں چھپ گئے۔ ہمارے اوپر فضا میں گن شپ ہیلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے اور ہمارے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ طالبان نے قریبی گاؤں میں نیٹو کے کسی ٹھکانے پر حملہ کر دیا ہے لیکن ہمیں یہ پتا نہیں تھا کہ حملہ کس طرف ہوا ہے۔ آگے چلنے سے پہلے ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ لڑائی کہاں ہو رہی ہے۔ جلد ہی ہیلی کاپٹروں کے شور میں ڈرون طیارے اڑنے کی آواز بھی شامل ہو گئی اور ہم تیز رفتاری سے چلنے پر مجبور ہو گئے۔ طالبان کے حملوں کے بعد اکثر نیٹو اس علاقے کا فضائی گشت کرتی ہے تاکہ مشتبہ افراد پکڑے جائیں۔ ہم کسی ایسی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے ہم نے ایک محفوظ ٹھکانے کی طرف چلنا شروع کر دیا جہاں سے ہم بلا رکاوٹ پاکستان میں داخل ہو سکیں۔ میرے رہبروں نے یقین دہانی کروائی کہ ہم جلد ہی کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے لیکن اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے انسانی زندگی کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ تنگ وادیوں، پہاڑوں میں بہتی ندیوں، اور پتھریلی چٹانوں پر لڑکھڑاتے ہم درختوں میں گھری ایک جگہ پر پہنچے۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو ہمیں گارے سے بنی ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ یہ تھا طالبان کا محفوظ ٹھکانا۔

میرے طالبان رہبر زبیر نے وائرلیس پر مختصر سی گفتگو کی اور مجھے بتایا کہ طالبان نے کورنگل وادی میں مختلف اطراف سے حملہ کر دیا ہے جس میں مہمند بارڈر کے قریب نواپاس بھی شامل ہے جہاں سے ہم افغانستان میں داخل ہوا کرتے تھے۔ زبیر نے بتایا کہ اس نئی صورتحال کی وجہ سے اب ہمیں پاکستان میں داخل ہونے کے لیے باجوڑ کی طرف لمبا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ہم نے مشرق کی بجائے مغرب کا رخ اختیار کیا، بالکل اسی طرح جس طرح طالبان تعاقب کی صورت میں اپنا مقام تبدیل کر لیتے ہیں۔ اگر انہیں پاکستان میں مہمند

میں لڑائی کرنی ہو تو وہ باجوڑ سے داخل ہوتے ہیں۔ تھوڑا سفر طے کرنے پر مجھ پر عیاں ہوا کہ روایتی فوج اس کھلے علاقے میں کیوں کر کامیاب نہیں ہو سکتی، وہ بھی اس صورت میں جب طالبان نے تمام راستوں پر ڈیرہ جمایا ہوا ہو۔ جنگجو جس مقام پر تھے وہاں سے وہ غیر ملکی فوج کو آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ اس کے برعکس اگر کوئی بھی حملہ آور فوج تنگ پہاڑی راستوں، تیز بہتی ندیوں اور گھنے جنگلوں میں پیدل جنگجوؤں کا تعاقب کرنے نکلے تو یہ علاقہ اس کے لیے موت کا پھندا ثابت ہو گا۔

زبیر نے گھنے پہاڑی جنگل والے رستے کا چناؤ کیا۔ اب باجوڑ ہماری منزل تھی۔ مجھ پر مزید واضح ہوا کہ یہ خطہ تو بذاتِ خود حملہ آور فوجوں کے خلاف جنگجو ہے۔ ہم گھنے درختوں میں رستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے رہے لیکن یہ سفر بہت سست رہا۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں ہمارے لباس پھٹ گئے اور جسم پر خراشیں آ گئیں۔ زبیر نے مجھے بتایا کہ اگر امریکا اوپر سے اس جنگل میں فوج اتارتا ہے تو جنگجوؤں کے چھپ کے جانے کے لیے درجنوں غار ہیں جہاں کوئی انہیں تلاش نہیں کر سکتا۔ صبح کے وقت ہم بہت سے دیہاتیوں کے ساتھ، جو اس وقت خریداری کرنے باجوڑ جا رہے تھے، پاکستان میں داخل ہوئے۔ چوٹیوں پر صبح کی نماز ادا کی تو پورا خطہ نگاہوں میں تھا۔ ہمیں کنڑ، نورستان، مہمند اور باجوڑ صاف نظر آ رہا تھا۔ طالبان کا اس خطے کا چناؤ کرنا بڑے معنی رکھتا تھا۔ یہاں ایسے ایسے ویران علاقے ہیں جہاں سے مہینوں تک کوئی نہیں گزرتا لیکن اس خطے میں خود رو وسائلِ زندگی کی بہتات ہے۔ چشموں کا پانی، میوہ دار درخت، سبزیاں اور بہت کچھ۔۔۔

یہ جنگلی علاقہ القاعدۃ کے لیے لوگ شامل کرنے، ملیشیا منظم کرنے اور انہیں تربیت دینے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ القاعدۃ کے اہم ترین رہنما اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری ان علاقوں میں طویل عرصے تک مقیم رہے۔ الظواہری باجوڑ کے پاس دو دفعہ

شناخت کیے گئے اور ان پر سی آئی اے نے ڈرون حملے کیے لیکن یہ اس وقت ہوا جب انہوں نے شام کا کھانا کسی گنجان شہری آبادی میں کھانے کا پروگرام بنایا۔ اگرچہ امریکا کو یہاں پر القاعدۃ کے رہنماؤں کی موجودگی کا علم تھا لیکن وہ ان کے خلاف مؤثر کارروائی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ امریکا نے کوہ ہندوکش میں اسامہ بن لادن کو زندہ یا مردہ پانے کے لیے کئی آپریشن کیے لیکن اس کی فوج ہمیشہ گوریلے طالبان کے گھیرے میں آئی اور سخت ہزیمت سے دوچار ہوئی۔

ہندوکش کی جنگجو دنیا

ہندوکش کئی چھوٹے پہاڑی سلسلوں (سپین غر، تورابورا، سلیمان سلسلہ، ٹوبہ کاکڑ) سے مل کر ایک راستہ بناتا ہے جو پاکستان کے قبائلی علاقوں اور افغان سرحدی صوبوں سے گزرتا ہوا بلوچستان کے ساحلی علاقوں میں جا نکلتا ہے۔ یہ تقریباً ۱۵۰۰ کلومیٹر طویل رستہ پاکستان، افغانستان، ایران اور بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایسی حیران کن بھول بھلی ہے جس میں ایک دنیا چھپ سکتی ہے۔ اسی علاقے سے مجرم اور اسمگلر افغانستان اور ایران کے راستے سے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور سکیورٹی فورسز کی نظروں میں نہیں آتے۔ پاکستان کے سات قبائلی علاقے برطانوی استعماری دور میں افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان بفر زون تھے۔ ان علاقوں کا انتظام بیوروکریٹس کے ہاتھوں میں تھا جو سیاسی ایجنٹ کہلاتے تھے اور گورنر سرحد کے نمائندے ہوتے تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد تقریباً یہی سلسلہ جاری رہا۔ سیاسی ایجنٹ صوبہ خیبر پختونخوا کے گورنر کو رپورٹ کرتا تھا اور قبائلی پٹی میں بالکل مختلف قوانین تھے۔ قبائلی سردار انتظامیہ کے اہم ترین کارندے تھے۔

۲۰۰۱ میں طالبان کی پسپائی کے بعد القاعدۃ نے اپنا سرمایہ اور توانائی ان علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے پر صرف کر دی اور اس علاقے کو افغانستان میں لڑائی کے لیے

کامیابی سے استعمال کیا۔ القاعدۃ کو یقین تھا کہ دنیا کی جدید ترین فوج بھی اس علاقے میں جنگجو تحریک کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ گیارہ ستمبر سے پہلے پاکستانی فوج کو اپنی مغربی سرحدوں یعنی قبائلی علاقوں میں فوجیں لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم گیارہ ستمبر کے بعد امریکی دباؤ میں آکر پاکستان نے یہاں پر اپنے ۸۰ ہزار فوجی تعینات کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ نفری بڑھتی گئی۔ القاعدۃ کی پیش گوئی تھی کہ گیارہ ستمبر کے بعد اس علاقے کے تحرکات بدل جائیں گے اور پاکستانی فوج اس کے خلاف دشمنی کا کردار نبھائے گی۔ اس لیے القاعدۃ نے ۲۰۰۱ کے بعد پوری توجہ سے اس علاقے کا مکمل کنٹرول حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ یہی وجہ تھی کہ ۲۰۰۲ سے ۲۰۰۴ تک افغانستان میں نیٹو کے خلاف لڑائی میں کوئی شدت دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس علاقے پر اپنا کنٹرول کر کے ہی القاعدۃ افغانستان میں نیٹو کے خلاف لڑائی پر توجہ دے سکتی تھی۔ القاعدۃ نے افغانستان میں نیٹو کے خلاف لڑنے کے لیے گوریلا جنگ کی تیاری میں پورے دو سال صرف کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ القاعدۃ نے محفوظ ٹھکانے بنائے جہاں سے جنگجو وقت آنے پر پاکستانی اور امریکی فوجوں کے خلاف لڑ سکیں۔

ابتدا میں القاعدۃ کا اثر ورسوخ شمالی اور جنوبی وزیرستان اور باجوڑ کے کچھ حصوں پر تھا۔ لیکن القاعدۃ نے بڑی ہوشیاری سے ایسے حالات پیدا کیے کہ پرانے استعماری نظام کے سیاسی ایجنٹوں کے بجائے مقامی جنگجو ملیشیا منظر عالم پر چھا گئے۔ پھر القاعدۃ نے اسی ترتیب کو پاکستان کے دوسرے قبائلی علاقوں میں پھیلایا اور ۲۰۰۸ تک پاکستان کی ساتوں قبائلی ایجنسیاں القاعدۃ کے جنگجوؤں کے زیرِ اثر تھیں۔ ۲۰۰۲ سے ۲۰۰۸ تک مسلسل جدوجہد کی گئی۔

پاکستان اپنے قبائلی علاقوں میں القاعدۃ کو اپنے ٹھکانے مضبوط کرنے سے روک سکتا تھا اور بلاشبہ اس تنظیم کی کارکردگی سے آگے نکل سکتا تھا۔ لیکن پاکستانی حکام القاعدۃ کی اس

حقیقت کو بھول گئے کہ القاعدۃ ایک نظریاتی تحریک تھی جسے سیاسی تدبر کے بغیر کی جانے والی صرف فوجی کارروائیوں سے نہیں ہرایا جا سکتا۔ پاکستان نے شمالی اور جنوبی وزیرستان میں ۲۰۰۴ سے ۲۰۰۷ تک باقاعدہ فوجی مہمات کی طرز پر کئی فوجی آپریشن کیے ۔ ان کارروائیوں میں وسیع تناظر اور مربوط حکمت عملی کا فقدان تھا۔ مثال کے طور پر مشرف حکومت نے جنگجوؤں کے خلاف عسکری کارروائیاں کسی فیصلہ کن سیاسی عمل اور قومی حمایت کے بغیر کیں۔ اس کے برعکس جنگجوؤں نے اسلامی نظریہ حیات کو اپنے اہم ترین ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ یوں وہ اپنی ابتدائی شکستوں یا پسپائیوں کے بعد دوبارہ واپس آنے اور باجوڑ ،اور کزئی، کرم، مہمند اور خیبر ایجنسیوں پر جارحانہ پیش قدمی کرنے میں کامیاب رہے۔ قصہ مختصر، جنگجو ہمیشہ ایک وسیع حکمت عملی اور نظریات اپنے ذہن میں رکھتے ہیں جبکہ پاکستانی فوج ایک محدود زاویے اور محدود سوچ کے ساتھ آپریشن کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی تھی جو آخر کار القاعدۃ کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

گیارہ ستمبر کے بعد پاکستانی عسکری قیادت نے اندازہ لگایا کہ امریکا پانچ سال کے اندر اندر شکست کھا جائے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھتے ہوئے مشرف نے سرکردہ جہادیوں اور مذہبی رہنماؤں سے ملاقاتیں جاری رکھیں۔ ان میں مولانا فضل الرحمان، مولانا سمیع الحق، حافظ سعید، قاضی حسین احمد اور مولانا فضل الرحمان خلیل جیسی شخصیات شامل ہیں۔ مشرف نے ان لوگوں کو پانچ سال تک چپ رہنے کا کہا کہ پانچ سالوں میں حالات بدل جائیں گے۔ مشرف کا خیال تھا کہ امریکا آخر کار افغانستان چھوڑ جائے گا اور پاکستان افغانستان میں اسلام پسندوں کی حمایت والی پالیسی دوبارہ اختیار کر لے گا اور کشمیر میں علیحدگی کی تحریک کو دوبارہ مضبوط کر دے گا۔ اس عسکری نظریے کی بدولت پاکستان نے قبائلی علاقوں میں جنگجوؤں کے خلاف بھرپور جنگ سے پرہیز کیا۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے پاکستانی فوج نے

عسکریت پسندوں سے دشمنی کی سطح کم رکھی اور یہ آس لگائے رکھی کہ امریکا نکلے تو قبائل سے دوبارہ تعلق جوڑا جائے۔ بہر حال، یہ ابھرتے ہوئے حالات کی غلط تعبیر تھی۔ امریکا کسی بھی صورت پانچ سالوں میں افغانستان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ در حقیقت پانچ سال بعد جنگ مزید بھڑک اٹھی اور امریکا کے لیے مستقبل قریب میں انخلا کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔ آہستہ آہستہ خطے کی تمام ریاستیں اسلام پسند باغیوں کے ساتھ لڑائی میں الجھ گئیں۔ خاص طور پر پاکستان اس برے طریقے سے پھنس گیا کہ جنگجوؤں کے خلاف بھرپور کارروائی کے سوا کوئی راستہ نہ بچا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ جنگجو اپنی جوابی اہلیت و قابلیت اس حد تک بڑھا چکے تھے کہ وہ جنگ کو اپنے انداز سے لڑ سکتے تھے۔ پہلے پہل انہوں نے اپنی کارروائیاں صوبہ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے مخصوص علاقوں تک محدود رکھیں۔ تاہم جب پاکستانی فوج کے آپریشن وسیع ہوئے تو جنگجوؤں نے اپنی کارروائیوں میں شہروں کو بھی شامل کر لیا۔ اس عسکری حکمت عملی نے عسکری قیادت کو حیران کر دیا۔ جنگجوؤں نے صوبہ سرحد کے بڑے شہروں میں حملے کیے اور وہاں اپنے مضبوط ٹھکانے بنائے۔ ۲۰۰۸ میں لوگ ڈرنے لگے کہ پشاور پر بھی طالبان کی حکومت آنے والی ہے۔

اس سے قبل جولائی ۲۰۰۷ میں القاعدۃ نے اسلام آباد میں لال مسجد کا نیا محاذ کھول کر حکومت کے اعصاب تھکا دیے تھے۔ اس کے بعد القاعدۃ نے اپنی جنگ پورے پاکستان میں پھیلا دی اور طویل مدتی محاذ کھول دیا۔ جنوری ۲۰۰۹ میں القاعدۃ یہ جنگ سوات کے سیاحتی مقامات سے بونیر تک لے آئی۔ بونیر، اسلام آباد سے صرف ۶۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ سارا منصوبہ افغانستان اور پاکستان کی سرحدوں سے مغربی فوجوں کے ٹھکانے تباہ کرنے اور القاعدۃ کو مستحکم کرنے کے لیے تھا۔ گھبرائی ہوئی پاکستانی فوج جنگجوؤں کی بانسری پر ناچتی چلی گئی۔ اسے وہاں پر لے جایا گیا جہاں جنگجو لے جانا چاہتے تھے۔ جب پاکستانی قبائلی

علاقوں سے جانے والے گوریلوں نے افغانستان میں اتحادی فوج پر تباہی مسلط کی تو واشنگٹن میں بیٹھے فیصلہ ساز جنگجوؤں کی اصل طاقت کا اندازہ لگانے بیٹھ گئے۔ واشنگٹن نے فوری طور پر نئی حکمت عملی اپنانے کا فیصلہ کیا۔

۲۰۰۷ کے آخر میں وضع کی جانے والی اس حکمت عملی میں پاکستانی مسلح افواج کو گوریلا مخالف کارروائیوں کی تربیت دی گئی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے اندر جنگجوؤں کی نشاندہی کرنے اور انہیں گرفتار کرنے کے لیے فوج کی قابلیت میں اضافہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے امریکا نے سیکڑوں نجی دفاعی ٹھیکیدار پاکستان روانہ کیے۔ ان ٹھیکیداروں نے پاکستان میں زمین خریدی اور مسلح افواج کو گوریلا مخالف چالیں سکھانا شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے جنگجوؤں کی نقل و حرکت کی کھوج لگانے کے لیے جدید ساز و سامان بھی نصب کیا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں ملک خفیہ معلومات کے تبادلے کے ساتھ زیادہ بہتر طریقے اپنانے کے قابل ہو گئے۔ اگست ۲۰۰۸ تک جنگ کے لیے منظم، مربوط اور مشترکہ انتظامی امور طے پا گئے تھے۔ اس نئی تربیت اور جنگجوؤں کے ٹھکانوں کی پرانی معلومات کی بدولت امریکا مخصوص اہداف کو سی آئی اے کے ڈرون طیاروں سے نشانہ بنانے لگا۔

امریکی اور پاکستانی افواج سرحد پار اپنے اپنے انداز سے مشترکہ جنگ لڑتی رہیں لیکن فوائد کم حاصل ہوئے اور ان کے وسائل اور توانائی زیادہ خرچ ہوئی۔ ۲۰۰۸ تک القاعدۃ کے نظریات کوہستانی مرد کے ذہن پر اس قدر گہرے نقش ہو چکے تھے اور قبائلی علاقے کی ہر پہاڑی، پتھر اور چٹان پر ان کی حکمت عملی اس طرح کندہ ہو چکی تھی کہ جنگجو رہنما دنیا کی بہترین فوج کا سامنا کرنے سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ انہیں عقاب کی سی برتری حاصل تھی جو ایک چوٹی سے دوسری چوٹی تک اپنی مرضی اور آزادی سے اڑتا ہے، جبکہ گھنے جنگل اور فلک

بوس پہاڑ اس کے جنگجوؤں کو منظم ہونے اور اگلے دن تازہ دم ہو کر لڑنے کے لیے مدد فراہم کر رہے تھے۔ ۲۰۰۸ سے ۲۰۱۰ تک نیٹو اور پاکستانی فوج نے افغانستان اور پاکستان میں تین بڑے طاقتور اور اہم عسکری آپریشن کیے۔ ہر مرتبہ پاکستانی فوج نے کامیابی کا دعویٰ کیا لیکن ہر دفعہ پردہ اٹھنے پر القاعدۃ جنگ کے امور و معاملات پر غالب نظر آئی۔

قبائلی بغاوت

امریکی فیصلہ سازوں نے ۹-۲۰۰۸ میں افغانستان اور پاکستان میں جاری جنگ کو ایک ہی جنگ کا نام دیا تھا۔ یہ صورتحال کی تاخیری تفہیم تھی۔ ۲۰۰۷ تک افغانستان کی جنگ نے القاعدۃ کو اپنی قوت مضبوط کرنے کا موقع فراہم کیا اور جس وقت حقیقت کھلی تو امریکا موقع ضائع کر چکا تھا۔ القاعدۃ تو گیارہ ستمبر کے حملے کرتے وقت ہی افغانستان اور پاکستان کو ایک ہی میدان جنگ سمجھتی تھی۔ القاعدۃ کے مطابق ان دونوں ملکوں میں بیک وقت جنگ نہ کرنے کا مطلب تھا کہ مغرب کے خلاف جنگ چھیڑی ہی نہ جائے۔ القاعدۃ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں ہجرت نہ کرتی اور نیٹو اور پاکستانی فوج کو ایک ہی دشمن تصور نہ کرتی تو افغانستان میں اس کی گوریلا کارروائیاں ۲۰۰۲ تک ہی دم توڑ دیتیں اور اس کی پسپا فوجیں ۲۰۰۳ کے آغاز میں ہی گرفتار ہو چکی ہوتیں۔ لیکن القاعدۃ پہلے افغانستان اور پاکستان کو ایک ہی میدان جنگ تصور کر چکی تھی اور اس کی ساری حکمت عملی اسی بنیاد پر تھی۔ اس کی ابتدائی توجہ قبائلی علاقوں میں اپنی حیثیت اور ٹھکانے مستحکم کرنے پر تھی تاکہ وقت آنے پر پاکستانی فوج سے لڑا جا سکے، لیکن افغانستان میں نیٹو کے خلاف جنگ ہمیشہ سے اس کا اصل مقصد رہا اور اسے پتا تھا کہ ہندوکش اور اس کے پہاڑی سلسلوں میں مضبوط ٹھکانوں کے بغیر یہ لڑائی نہیں لڑی جا سکتی۔ خطے کا جغرافیائی مطالعہ اس وجہ کی وضاحت کرتا ہے۔

جنوب مشرقی افغانستان اور پاکستان کی شمال مغربی سرحدوں کے سنگم پر افغان صوبہ ننگرہار پاکستان کی اور کرزئی اور خیبر ایجنسی اور کرم ایجنسی کے ساتھ لگتا ہے۔(کچھ دروں کے ذریعے دونوں اطراف جڑی ہوئی ہیں)۔ افغان صوبے کنڑ اور نورستان پاکستان کی مہمند اور باجوڑ ایجنسیوں اور چترال کے علاقے کے ساتھ ہیں۔ افغان صوبے خوست اور پکتیکا پاکستان کے جنوبی اور شمالی وزیرستان کے ساتھ ہیں۔ جنوبی وزیرستان سے ایک راستہ غیر قبائلی علاقوں سے ہوتا ہوا جنوب مغربی بلوچستان جا نکلتا ہے جہاں قندھار اور ہلمند صوبوں کی سرحدیں ہیں۔ افغان صوبوں سے طالبان کا ایک طرح سے روحانی تعلق ہے جبکہ شمال مغرب میں پاکستان کے قبائلی علاقے اور جنوب مغرب کے غیر قبائلی علاقے طالبان حمایت کا مرکز ہیں۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں نے جو جنگ لڑی اس کا ہدف طالبان کے افغان صوبوں کا کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ اس لیے نیٹو کی ساری فوج اور اس کی تمام کارروائیاں جنوب مشرقی اور جنوب مغربی افغانستان پر مرکوز تھیں۔ اگر جنوب مشرقی یا جنوب مغربی افغانستان میں نیٹو کے خلاف محاذ آرائی کا کوئی امکان ہوتا تو طالبان ۲۰۰۱ میں پسپا نہ ہوتے۔ وجہ یہ ہے کہ جنوب مشرقی افغانستان میں کنڑ اور نورستان کے صوبوں کے سوا سارے کا سارا علاقہ میدانی ہے۔ جنوب مشرقی افغانستان کا کوئی صوبہ بھی مسلسل گوریلا جنگ کے لیے سازگار ماحول فراہم نہیں کرتا۔ ہندوکش اور اس کے ملحقہ پہاڑی سلسلے اس سے مستثنیٰ ہیں جو قدرتی تحفظ اور راستے فراہم کرتے ہیں جہاں سے طالبان پسپا ہو کر قبائلی علاقوں میں آتے ہیں اور تازہ دم ہو کر پھر افغانستان میں لڑتے ہیں۔

ہندوکش کے باسی قبائل میں اسلامی روحانیت روایتی اور طبعی طور پر موجود ہے۔ یہ جذبہ القاعدۃ اور طالبان کی پسپائی اور جارحیت میں حمایت کا ضامن ہے۔ جبکہ علاقے کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے مدارس قدرتی طور پر القاعدۃ اور طالبان کے لیے ابطال پیدا کرنے کی

پرورش گاہیں ہیں۔ اسلامی عسکریت کے لیے ان تقریباً مکمل انتظامات کے ساتھ صرف یہی مسئلہ تھا کہ ان ساتوں ایجنسیوں کے قبائلی علاقوں میں حکومتی پشت پناہی سے چلنے والا قبائلی نظام موجود تھا۔ القاعدۃ خوب واقف تھی کہ اگر امریکی آشیرباد سے پاکستانی حکومت نے مداخلت کی تو اس کی ساری جغرافیائی، نظریاتی اور وسائلی برتری ختم ہو جائے گی۔ لیکن دوسری طرف یہی قبائل پاکستانی ریاست کی کمزوری بھی ہیں۔ ان علاقوں میں اندازاً ۳۳لاکھ لوگ آباد ہیں اور یہ قوم کے بہترین لوگ ہیں۔ پاکستان کی کل آبادی کا صرف ۳فیصد ہونے کے باوجود کل ملکی پیداوار میں ان کا حصہ ڈیڑھ فیصد ہے۔ خواندگی کی شرح ۴۲.۱۷فیصد سے بھی کم ہے جو قومی شرح خواندگی سے کہیں کم ہے۔

قبائلی علاقے ایک خاص انتظام کے تحت پاکستان کا حصہ بنے۔ یہاں کوئی پاکستانی قانون لاگو نہیں تھا۔ انتظامیہ برطانوی نوآبادیاتی نظام کے تحت چل رہی تھی اور وہی پرانے نوآبادیاتی قانون رائج تھے۔ کہنے کو تو قبائل کو خودمختاری حاصل تھی لیکن دراصل یہ قبائلی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی آہنی گرفت میں تھے۔ پاکستان ان علاقوں کو اسی طرح کنٹرول کر رہا تھا جیسے ایک دشمن فوج کسی نئی آبادی کا انتظام سنبھالتی ہے۔ پرانے قبائلی نظام کی رو سے وفاقی حکومت کی طرف سے تعینات سیاسی ایجنٹ کی حاکمیت "محفوظ علاقوں" کے معاملات کی نگرانی تک ہی محدود تھی یعنی صرف سڑکیں اور حکومتی املاک، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ قبائلی علاقے بذاتِ خود رواج کے تحت چل رہے تھے۔ سیاسی ایجنٹ جب ان علاقوں میں کام کرتا تو اسے بھی رواج پر چلنا پڑتا۔ اسی وجہ سے اسے انتظامی افسر کے بجائے پولیٹکل ایجنٹ کہا جاتا۔ یہ ایجنٹ سیاسی طور پر قبائل سے معاملات کرتا۔ یہاں تک کہ آج بھی ان علاقوں میں کوئی تھانہ، کوئی کچہری یا پولیس فورس نہیں ہے۔ تمام تنازعات رواج کے تحت حل کیے جاتے ہیں اور

رواج کی نگرانی جرگہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ ٹیکسوں میں بڑی بڑی رعایتیں ہیں لیکن یہ سب کچھ مفت میں نہیں مل رہا۔

ان رعایتوں کے بدلے میں ایک اجتماعی ذمہ داری بھی ہے۔ ہر قبیلہ اپنے علاقے کے تحفظ کا خود ذمہ دار ہے جسے "اپنی دھرتی کی ذمہ داری" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ ان علاقوں کی سڑکیں سیاسی انتظامیہ کے تاریخی فرائض کی بلا رکاوٹ بجا آوری کے لیے ہر دم کھلی رہتی ہیں اور روایتی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو معاملات کی دیکھ بھال کے لیے آزادانہ رسائی حاصل ہے۔ فرنٹیئر کورپس ایک پیرا ملٹری فورس ہے جو صرف پشتونوں پر مشتمل ہے اور خاصہ دار قبائلی پولیس ہے۔ معاہدہ یہ ہے کہ ان رعایتوں کے بدلے تمام قبائل کی یہ اجتماعی ذمہ داری ہے کہ اپنے علاقوں کو مجرموں یا ریاست مخالف عناصر کی آماجگاہ نہ بننے دیں۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں ایف سی قانون لاگو ہو گا۔ لہٰذا جب کسی قبیلے یا فرد کی طرف سے کوئی خلاف ورزی سامنے آتی ہے تو ابتدائی طور پر جرگہ بلایا جاتا ہے اور قبائلی سرداروں کو مسئلہ حل کرنے کے لیے مناسب وقت دیا جاتا ہے۔ اگر مسئلہ حل نہیں ہوتا تو مجرم قبیلے کو ہرجانے کی سزا دی جاتی ہے اور اس سے رعایتیں واپس لے لی جاتی ہیں۔ اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو مجرم افراد کے قریبی رشتہ داروں کو سزا دی جاتی ہے۔ انہیں ایف سی آر کے تحت گرفتار کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ایف سی آر یعنی ریاست اس قبیلے کی معاشی ناکہ بندی کر دیتی ہے اور اس قبیلے کی دکانیں اور اثاثے ضبط کر لیے جاتے ہیں۔ اگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو فوجی کارروائی کی جاتی ہے۔

القاعدۃ نے قبائل کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے قبائلی نظام کی کمزوریوں کو سمجھا۔ اس نے یہ احساس پھیلا دیا کہ قبائل غیر ملکی تسلط میں رہ رہے ہیں اور انہیں پاکستانی ریاست کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے۔ القاعدۃ نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے پاکستانی

حکومت کو مرتد قرار دے دیا کیونکہ اس نے افغانستان میں اتحادی فوجوں کا ساتھ دیا تھا۔ پھر القاعدۃ نے قبائل پر زور دیا کہ پاکستان سے اپنے تعلقات ختم کر کے ساتوں ایجنسیوں میں اسلامی امارت قائم کی جائے اور ہر علاقے کا اپنا امیر ہو اور پورے قبائلی علاقوں کا ایک امیر اعظم ہو۔ یہ انتظام ۲۰۰۷ کے آخر میں شروع ہوا جب تک ہزاروں جوان جنگجوؤں کے ساتھ آن ملے تھے۔ ۱۰-۲۰۰۹ میں جنگجوؤں کی نفری ایک لاکھ مسلح افراد کے قریب قریب تھی۔ قبائلیوں کے لیے یہ نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ اور خود مختاری کا آغاز تھا جس کے لیے وہ القاعدۃ کے شکر گزار تھے۔

پہاڑوں میں انقلاب

۰۶-۲۰۰۵ تک پاکستان کے قبائلی علاقوں کی دنیا بدل چکی تھی۔ شمالی وزیرستان، جنوبی وزیرستان اور باجوڑ کے سیکڑوں قبائلی سرداروں اور ملاؤں کو پاکستان آرمی اور امریکہ کے جاسوس قرار دیا گیا۔ انہیں یا تو مار دیا گیا یا بھگا دیا گیا۔ یہ قبائلی سردار اور ملا پاکستانی قبائلی نظام کے پٹھو تھے۔ ان کے خاتمے سے قبائلی نظام کا ڈھانچہ ختم ہو گیا۔ القاعدۃ نے اس خلا کو پُر کیا۔ ہر قبیلے نے القاعدۃ کے لیے چند ایک مخصوص جنگجو پیدا کیے۔ انہوں نے خود کار طریقے سے نظام سنبھال لیا۔ کچھ واقعات ایسے رونما ہوئے کہ ان کا مکمل کنٹرول ہو گیا۔ ان واقعات میں نمایاں ترین واقعہ دسمبر ۲۰۰۵ میں رونما ہوا۔ طالبان لڑاکوں کا ایک گروہ افغانستان میں کارروائی کرنے خوست جا رہا تھا کہ کچھ مجرموں نے انہیں روکا اور محفوظ راستہ دینے کے لیے رقم کا تقاضا کیا۔ طالبان نے انکار کیا تو انہوں نے راستہ دے دیا۔ تاہم چند کلومیٹر دور جانے پر انہوں نے طالبان پر راکٹ مارا اور ان کی گاڑی تباہ کر دی۔ وزیر قبیلے سے تعلق رکھنے والے چار طالبان مارے گئے۔ اس واقعے سے طالبان حمایتی غضبناک ہو گئے۔ یہ لوگ میر ان شاہ کے قریب جمع ہوئے اور لوگوں کو خبردار کیا کہ اگر وہ مجرموں کے اڈوں کے آس پاس ہیں تو اپنے

اپنے گھروں سے باہر آجائیں۔ پھر مجرموں کے ایک ٹھکانے پر حملہ کیا گیا۔ پندرہ منٹ کی اس خوفناک لڑائی میں بہت سے غنڈے قتل ہوئے، کچھ پکڑ لیے گئے اور باقی فرار ہو گئے۔ ایک ویڈیو کے مطابق اگلے تین دنوں میں طالبان نے پورے شمالی وزیرستان میں مجرموں کے کئی ٹھکانے تباہ کر دیے۔ بہت سے مجرم میران شاہ بازار میں عوام کے مجمعے کے سامنے قتل کیے گئے۔

طالبان کے اس طاقت مظاہرے کے بعد القاعدۃ نے طالبان کو معاشرے میں نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کے اس پروگرام کو جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ پھر مقامی جنگجوؤں نے اپنی چیک پوسٹیں قائم کیں اور جنوری ۲۰۰۶ تک پاکستانی سکیورٹی فورسز کی چوکیاں خالی کروانا شروع کر دیں۔ مقامی جرگہ سسٹم کی جگہ اسلامی عدالتوں نے سنبھال لی۔ شمالی وزیرستان کی اسلامی ریاست ۲۰۰۶ کے آغاز میں وجود میں آئی اور اس کے ساتھ ہی جنوبی وزیرستان میں بھی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ ۲۰۰۷ کے اختتام تک یہ پیغام باجوڑ، مہمند اور اورکرزئی ایجنسی تک پہنچ گیا۔ القاعدۃ نے اس پوری تحریک کو تحریکِ طالبان پاکستان کے پرچم تلے اکٹھا کر دیا۔ ہر قبیلے کا ایک کمانڈر تھا اور یہ سارے کمانڈر ایک امیر کے تابع تھے۔ اس سیاسی عمل نے خاص طور پر پاکستان کا قبائلی نظام تبدیل کر دیا۔ قبائلی علاقے پہلے ہی القاعدۃ کی عالمی کارروائیوں کے لیے مرکزی اڈا بن چکے تھے۔ اس نئے نظام سے القاعدۃ اب پوری قبائلی پٹی کی مالک تھی۔ شمالی وزیرستان کا قصبہ میر علی القاعدۃ کا مرکزِ خاص تھا اور اس کے قرب وجوار کے دیہات القاعدۃ کی کالونیاں تھے۔ مقامی قبائلیوں نے القاعدۃ جنگجوؤں کو اپنے گھروں میں پناہ دی۔ بعد میں یہ انتظامات جنوبی وزیرستان، خیبر ایجنسی، اورکزئی ایجنسی، مہمند اور باجوڑ تک وسیع ہوتے چلے گئے۔ باجوڑ، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان میں القاعدۃ کے میڈیا ونگ السحاب اور امت کے اسٹوڈیو قائم کیے گئے (السحاب القاعدہ کا میڈیا

سٹوڈیو ہے جبکہ امت سٹوڈیو حرکت اسلامی ازبکستان اور تحریک طالبان پاکستان کا مشترکہ میڈیا ونگ ہے۔مترجم)۔ ان اسٹوڈیوز میں جہادی فلمیں بنائیں گئیں جو بعد میں پاکستان، عراق اور افغانستان میں تقسیم ہوئیں۔

۲۰۰۵ کے آخر تک طالبان اور القاعدۃ نے، جنہیں افغانستان سے مکمل طور پر بے دخل خیال کیا جاتا تھا، نہ صرف خود کو کامیابی سے دوبارہ منظم کیا اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں قدم جمائے بلکہ اپنی فوجوں کو تحفظ دینے کے لیے قدرتی قلعے بھی بنا لیے۔ کوئی بھی طاقت ان کی رسد نہیں روک سکتی تھی اور انہوں نے اپنے دشمنوں، پاکستانی فوج اور نیٹو پر لگاتار حملے کیے۔ تحریکِ طالبان پاکستان کے قبائلی نظام کو تبدیل کرنے سے پہلے بھی ۲۰۰۶ میں طالبان کے جارحانہ ظہور نے پوری دنیا کو ششدر کر دیا تھا۔ بقول مغرب، افغانستان میں صرف پچیس سو طالبان تھے لیکن ۲۰۰۶ میں پاکستانی قبائلی علاقوں سے ان کی نہ ختم ہونے والی صفیں نکلیں اور افغانستان میں نیٹو پر تباہ کن حملے کیے۔ اگرچہ طالبان کو بھی بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا لیکن وہ افغانستان میں اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب رہے۔ بوکھلائے امریکہ نے پاکستانی قبائلی علاقوں کے ساتھ افغان سرحد پر اپنے فوجی اڈے تعمیر کرنے شروع کر دیے لیکن یہ اڈے طالبان کے لیے لیٹی بطخیں ثابت ہوئے۔ جنگجوؤں نے اڈوں پر اتنے حملے کیے کہ ۲۰۰۹ میں نیٹو نے پاک افغان سرحد پر تمام اڈوں کی تعمیر ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔ نئی فضا نے تمام گذشتہ حکمت عملیوں اور طاقت کے توازن کو فرسودہ کر دیا۔ واشنگٹن اس نتیجے پر پہنچا کہ اس پورے خطے کو ایک ہی میدان جنگ قرار دیے بغیر افغانستان میں جنگ جیتنا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح ایف پاک اصطلاح وجود میں آئی۔ اس کے بعد امریکا نے ۱۸ ماہ میں پاکستانی حدود میں ۸۶ ڈرون حملے کیے اور کئی فوجی آپریشن کیے۔ لیکن ہر چیز، جغرافیہ اور قبائلی نظام سمیت ،جنگجوؤں کو راستہ دیتی گئی۔ یہاں تک کہ جب پاکستانی جانب سے پاکستان آرمی اور افغان

طرف سے نیٹو فوج حملہ کر رہی تھی اور فضا سے ڈرون طیارے میزائل اور پاکستانی فضائیہ بم برسا رہی تھی تو اس وقت بھی کوہ ہندو کش اور ملحقہ پہاڑی سلسلوں نے جنگجوؤں کو محفوظ رکھا۔

جنگجوؤں کا بہر حال نقصان بھی ہوا۔ ابو لیث اللیبی، خالد حبیب، بیت اللہ محسود اور طاہر یلدوشف سمیت ان کے ۱۸ سرکردہ رہنما ڈرون حملوں میں مارے گئے لیکن قبائلی علاقوں میں طبعی خدوخال کو ایک قلعے کے طور پر استعمال کرنے کا پنج سالہ القاعدۃ منصوبہ اتنا کامیاب رہا کہ لاتعداد فوجی آپریشن اور ڈرون حملے ان کے طویل المدتی مقصد پر ضرب نہ لگا سکے۔ اس دوران مغربی ممالک اور پاکستان قبائلی علاقوں میں جنگجوؤں کو فیصلہ کن شکست دینے کے لیے مشترکہ منصوبے بنا رہے تھے۔ اے این پی جیسی سیکولر پارٹی کے سہارے قبائلی علاقوں میں جگہ بنائی گئی اور مخصوص قبائل کو القاعدۃ اور طالبان کے خلاف کھڑا کیا گیا۔ دوسری طرف جنگجوؤں کا ناطقہ بند کرنے کے لیے فوجی مہم شروع کی گئی لیکن القاعدۃ مطمئن تھی کہ اگلے کئی سالوں تک اس قبائلی قلعے میں ٹکے رہنے کے لیے اس کے پاس وافر جنگی وسائل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ القاعدۃ ایک دوسرے منصوبے پر بھی کام کر رہی تھی۔ اس نے عرب دنیا، ترکی اور وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ جغرافیائی تعلقات بحال کرنے شروع کر دیے تا کہ نئے محاذوں کے لیے نئے قلعے تعمیر کیے جائیں۔ تمام راستے ایران سے ہو کر گئے۔

ایران کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے القاعدۃ کے اقدامات

۲۰۰۹ میں القاعدۃ نے عبد المالک ریگی کی زیرِ قیادت چلنے والی ایرانی جند اللہ سے اتحاد قائم کیا۔ معاہدہ یہ طے پایا کہ ریگی ترکی، وسط ایشیائی ریاستوں اور عراق جانے والے اسمگلنگ راستوں پر جنگجوؤں کی آمد و رفت میں سہولت دیں گے۔ بدلے میں، ایران میں

حکیم اللہ محسود کی تحریکِ طالبان پاکستان نے ایک ایرانی سفیر اغوا کر لیا: 13 نومبر 2008

۱۳ نومبر ۲۰۰۸ کی صبح تقریباً ساڑھے سات بجے ایرانی سفیر حشمت اللہ عطر زادہ پشاور میں ایرانی قونصلیٹ آنے کے لیے حیات آباد کے قریب سفر کر رہے تھے۔ انہیں یہاں کام کرتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے۔ پشاور صوبہ خیبر پختونخوا کا دارالحکومت ہے جہاں پشتون آبادی کی اکثریت ہے۔ دو کاریں عطر زادہ کی کار کے سامنے آئیں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں انہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ دو مسلح آدمیوں نے عطر زادہ کو پکڑا اور ایک گاڑی میں ڈال کر جنوبی وزیرستان روانہ ہو گئے۔ جنوبی وزیرستان تحریکِ طالبان پاکستان کا مرکز ہے۔ عطر زادہ کے محافظ پاکستانی پولیس افسر موقع پر ہی فائرنگ کے تبادلے میں مارے گئے۔

کارروائیاں کرنے کے لیے القاعدۃ ریگی کو سرمایہ اور تربیت فراہم کرے گی۔ القاعدۃ کو معلوم تھا کہ جند اللہ کی فراہم کردہ رسائی محدود ہو گی لیکن اسے توقع تھی کہ آنے والے برسوں میں وسط ایشیا، مشرق وسطیٰ اور ترکی اور پاکستانی قبائلی علاقوں میں روابط قائم کرنے کے لیے وافر انسانی اور مادی وسائل ہاتھ آ جائیں گے۔ اس کا منصوبہ طویل المدتی تھا لیکن ایک سفیر کے ملوث ہونے کی وجہ سے یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

یہ واقعہ عالمی میڈیا کی شہہ سرخیوں میں آیا اور ایرانی وزارتِ داخلہ نے اسے دہشت گردی کی کارروائی قرار دیا۔ عطر زادہ کے اغوا سے ایک دن پہلے پشاور میں ایرانی قونصلیٹ کے سامنے امریکی ایڈورکر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ عام طور پر اس طرح کے اغوا میں فوری طور تاوان کا مطالبہ کیا جاتا ہے لیکن اس معاملے میں مکمل خاموشی تھی۔ اس کے بعد ایرانی حکومت اور القاعدۃ کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے اور طرفین میں چپقلش پیدا ہو گئی۔ ایران اور القاعدۃ کے درمیان کبھی اچھے تعلقات بھی تھے لیکن یہ تعلقات طالبان دور حکومت میں ایک دو واقعات سے خراب ہو گئے تھے۔ پہلے واقعے میں آٹھ ایرانی سفیر قتل کر دیے گئے۔ (کہاں، کیسے اور کس نے مارے، اس کا کچھ پتا نہ چلا)۔ چونکہ اس وقت القاعدۃ طالبان کی اتحادی تھی اس لیے ایران بگڑ گیا۔ مزید بر آں، القاعدۃ کے اتحادی اردنی جنگجو مصعب الزرقاوی عراق میں امریکا کے خلاف کئی ایک کامیاب کارروائیاں کر چکے تھے۔ ان کارروائیوں میں الزرقاوی ایرانی شیعوں اور اہل بیت کے مزارات کو بھی ہدف بنا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ القاعدۃ اور ایران دور دور ہو گئے۔ تاہم بدلتے ہوئے عالمی حالات کی بدولت ایران اور القاعدۃ کا ایک دوسرے کے قریب آنا ناگزیر تھا۔ ایرانی سفیر کی رہائی کے بارے میں گفت وشنید سے القاعدۃ اور ایران میں اچھی تفہیم پیدا ہوئی۔

اس تفہیم کے نتیجے میں ایران نے اسامہ بن لادن کی بیٹی ایمان بن لادن اور القاعدۃ کے بعض دوسرے ارکان کو رہا کر دیا جو گیارہ ستمبر کے بعد براستہ ایران افغانستان سے باہر جاتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ بدلے میں القاعدۃ نے ایرانی سفیر کو مارچ ۲۰۰۸ میں رہا کر دیا۔ اگرچہ ایران اور القاعدۃ میں پیدا ہونے والے تعلقات خطے میں القاعدۃ کی نقل و حرکت کے لیے مفید ہو سکتے تھے لیکن القاعدۃ کے ایرانی جند اللہ سے بھی مضبوط تعلقات قائم رہے۔ اگر ایران کے ساتھ دوبارہ تعلقات خراب ہوتے تو جند اللہ سے تعلقات کام آ جاتے۔

۲۰۱۰ تک وسط ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں نئے محاذ کھولنے کے لیے القاعدۃ کی تیاریاں مکمل تھیں لیکن اس کا اصل محاذ جنوبی ایشیا خاص طور پر پاکستانی قبائلی پٹی ہی رہا۔ سیکڑوں ڈرون حملوں میں میزائلوں کی بارش برسائی گئی، درجنوں زمینی فوجی کارروائیاں کی گئیں اور بہت سی ہونے والی تھیں لیکن قبائلی پٹی میں القاعدۃ کا قلعہ اس طوفان بلاخیز میں ثابت کھڑا رہا۔ یہ ایسا پھندا تھا جو دنیا کی بہترین فوجوں کو یہاں کھپانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

حیرتناک بھول بھلیاں

ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ واقع کوہ ہندوکش اور دوسرے پہاڑی سلسلے القاعدۃ کا فطری قلعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سٹریٹجک کاریڈور بھی ہے جو ان کی لڑائی کو مشرقی افغانستان سے مغربی افغانستان تک اور جنوبی افغانستان سے شمالی افغانستان تک لے جاتا ہے۔ یہ ایسا طلسمی خطہ ہے جو جنوبی افغانستان کے بنجر پہاڑوں سے ایران، وہاں سے بحر ہند، چین اور وسط ایشیا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ پیچیدہ اور گنجلک خطہ پامیر سلسلے سے جڑا ہوا ہے جسے عرفِ عام میں بامِ جہاں کہا جاتا ہے۔

یہ وہ خطہ ہے جہاں کے تمام سیاسی اور ثقافتی تحرکات القاعدۃ کے قبضے میں ہیں۔ یہاں سے طالبان لڑائی پاکستان اورافغانستان کے جنوبی پشتون علاقے سے شمالی افغانستان کے طالبان مخالف خطے میں پھیلتی ہے۔ یہ القاعدۃ کا آہنی پردہ ہے جو نیٹو اور پاکستان کی طاقتور فوجوں کو پیچھے دھکیلنے میں مدد دیتا ہے اور طالبان / القاعدۃ کی پیش قدمی کو کابل تک لے جاتا ہے۔ کوہ ہندوکش میں پاکستانی مہمند، باجوڑ اور چترال کم از کم تین ایسے محفوظ راستے ہیں جہاں سے طالبان اور القاعدۃ کو افغان صوبوں کنڑ اور نورستان سے ہوتے ہوئے افغان صوبے کپیسا میں شمال مشرقی تغاب وادی تک آسان رسائی حاصل ہے۔ یہاں سے وہ کابل کے دروازوں تک جا پہنچتے ہیں۔ کپیسا میں تاجکوں کا غلبہ ہے جبکہ تغاب میں پشتون اکثریت ہے۔ ہر سال

تقریباً پانچ ہزار جنگجو اس راستے سے افغانستان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ جنگجو ہندو کش میں رہ کر منظم ہوتے ہیں اور تربیت پا کر یکے بعد دیگرے اپنے حملے جاری رکھتے ہیں۔ یہ جنگجو نورستان اور کنڑ کو غیر مستحکم کر کے اسی راستے سے تغاب وادی پر قبضہ جماتے ہیں اور یہاں سے بار بار کابل پر حملے کرتے ہیں ۔ نیٹو نے کئی عسکری آپریشن کیے جن میں طویل ترین آپریشن، آپریشن لائن ہارٹ تھا جو کنڑ اور نورستان میں شروع کیا گیا۔ پاکستان میں پاکستانی فوج نے یہی آپریشن، آپریشن شیر دل کے نام سے مہمند اور باجوڑ میں کیا۔ یہ آپریشن ۲۰۰۸ کے آخر میں شروع ہو کر جنوری ۲۰۰۹ کے آغاز میں اختتام پذیر ہو گیا لیکن جنگجوؤں کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ وہ صرف منتشر ہوئے اور بعد میں پھر منظم ہو گئے۔ نیٹو اور پاکستانی فوج نے ۲۰۰۹ اور ۲۰۱۰ میں کئی دوسرے آپریشن کیے لیکن جنگجو اس خطے میں غالب رہے۔ القاعدۃ ان ٹھکانوں سے نکل کر اسلام آباد اور پاکستان کے دوسرے علاقوں میں کارروائیاں کرتی ہے۔

اگر آپ افغانستان اور پاکستان میں ہونے والی دراندازی کا مطالعہ کریں تو ان کی کامیابی کی کہانی سامنے آتی ہے۔ دراندازی کی جگہیں پہاڑی درے ہیں لیکن ان کے ناموں کے برعکس یہ کوئی ایک مخصوص راستہ نہیں ہے۔ درجنوں ایسے درے ہیں جہاں سے دونوں ملکوں کے لوگ ادھر ادھر سفر کرتے ہیں خواہ یہ تاجر ہوں، اسمگلر ہوں یا جنگجو۔ اس خطے کو دیکھنے کے لیے بہت اچھا نقشہ اور طاقتور گاڑی درکار ہے۔ اس خطے کو دیکھ کر القاعدۃ کی دانائی اور بصیرت کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے کس دانشمندی اور ذہانت سے اپنے وسائل کی تیاری میں وقت گزارا اور لڑائی کی تیاری میں کئی برس صرف کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی غبی ذہنیت پر بھی حیرانی ہوتی ہے کہ دنیا کے امیر ترین اور مدبر ملک ہونے کے باوجود القاعدۃ کے افغان پھندے میں جا پھنسے اور اس حقیقت کو محسوس نہ کر پائے

کہ اصل لڑائی تو پامیر خطے کے جغرافیے میں پنہاں ہے۔ نیٹو اپنے وسائل کنڑ اور نورستان میں کھپاتی ہے اور پاکستانی آرمی کو مجبور کرتی ہے کہ مہمند اور باجوڑ میں جنگجوؤں کی ناکہ بندی کرے۔ ان کی اجتماعی فضائی قوت جنگجوؤں پر ایسے بم برساتی ہے اور زمینی فوج ان پر ایسے گولہ باری کرتی ہے گویا کہ وہ ان پر حملہ کرنے کے لیے پہاڑوں سے نیچے اتر رہے ہیں۔ دونوں طاقتیں اس حقیقت کو بھول رہی ہیں کہ گذشتہ کئی سالوں سے جنگجوؤں نے بچاؤ کے کئی طریقے اپنا لیے ہیں۔ اب وہ نیٹو کے ہاتھوں گرفتار ہونے اور مرنے کے لیے کنڑ اور نورستان میں نہیں جاتے اور نہ پاکستانی فوج کے ہاتھوں مرنے یا گرفتار ہونے کے لیے مہمند اور باجوڑ کا رخ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ مارتے ہیں اور جنگلوں اور پہاڑی دروں سے بھاگ کر چترال اور دیر میں آجاتے ہیں۔ فوج گھات میں بیٹھے دشمنوں کے خوف سے پہاڑوں اور جنگلوں میں ان کا تعاقب نہیں کرتی۔

گذشتہ دو سالوں میں پاکستان نے امریکی اصرار پر جنگجوؤں کا راستہ روکنے کے لیے اپنی فوج کا بڑا حصہ مغربی سرحدوں پر تعینات کیا اور پورے قبائلی خطے میں کئی محاذ کھولے۔ ہو سکتا ہے اس سے جنگجوؤں کی نقل و حرکت پر اثر پڑا ہو لیکن ان کی گرفتاری یا موت میں کوئی مدد نہیں ملی۔ خطے میں سفر کے لیے بکثرت استعمال ہونے والے راستے درج ذیل ہیں:

- ✓ ارندو چترال (پاکستان) سے نورستان (افغانستان)
- ✓ دیر (پاکستان) سے کنڑ (افغانستان)
- ✓ باجوڑ (پاکستان) سے کنڑ (افغانستان) دو راستے
- ✓ مہمند (پاکستان) سے کنڑ (افغانستان)
- ✓ خیبر (پاکستان) سے ننگرہار (افغانستان) دو راستے ہیں۔ ایک قانونی راستہ ہے جو طورخم کا ہے۔ دوسرا غیر قانونی راستہ ہے جو تیراہ وادی سے تورا بورا تک جاتا ہے۔

- ✓ تری مینگل (پاکستان) سے ننگر (افغانستان) چار راستے
- ✓ کرم ایجنسی (پاکستان) سے پکتیا (افغانستان) دو راستے
- ✓ کرم (پاکستان) سے خوست (افغانستان)
- ✓ شمالی وزیرستان سے چار راستے بکثرت استعمال ہوتے ہیں جو لوواره منڈی سے خوست اور پکتیا جاتے ہیں۔ شمالی وزیرستان سے پکتیا تک تین راستے ہیں اور جنوبی وزیرستان سے انگور اڈا تک دو راستے نمایاں ہیں۔
- ✓ خیبر پختونخوا اور فاٹا میں ۱۶ راستے ہیں۔
- ✓ بلوچستان میں ایک قانونی راستہ ہے جو چمن سے قندھار جاتا ہے۔ دوسرے تمام راستے غیر قانونی ہیں۔ چاغی میں نوشکی سے قندھار میں غزنالی تک اور دالبدین سے بارہ بیچا تک کے سارے راستے غیر قانونی ہیں۔

جنگجو ان راستوں اور دروں سے گزر کر کبھی افغانستان اور کبھی پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب نیٹو کارروائی کرتی ہے تو جنگجو بذریعہ ارندو چترال نورستان سے پاکستان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چترال پاکستان کا پر امن پہاڑی علاقہ ہے جہاں پر جنگجو وقفہ کرتے ہیں اور پھر دیر میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں سے وہ پھر کنڑ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ گول چکر چلتا رہتا ہے اور دونوں ملکوں کی فوج کے لیے اس اسفنجی سرحد کی حفاظت کرنا ممکن نہیں ہے۔

پاکستانی قبائلی علاقوں سے عسکریت پسندی کا صفایا کرنے کے لیے مقامی آبادی کو اپنے گھر بار چھوڑنے کے لیے کہا گیا۔ اقوام متحدہ کے انسانی امور کے دفتر کے مطابق کم و بیش ساڑھے چار لاکھ لوگوں نے جنوبی وزیرستان سے ہجرت کی۔ تقریباً ایک لاکھ افراد مہمند اور باجوڑ سے نکلے اور خیبر اور اور کزئی سے ہزاروں افراد بے گھر ہوئے۔ پاکستان آرمی اور

امریکی فوج میں اجماع تھا کہ ایک بار شہری یہ علاقہ چھوڑ دیں تو جنگجوؤں کے ٹھکانوں پر بمباری کرنا آسان ہو گا اور اگر جنگجوؤں نے افغانستان فرار ہونے کی کوشش کی تو امریکی فوج ان کی نشاندہی کر کے انہیں ختم کر دے گی۔ پھر پاکستانی آرمی پرانے قبائلی نظام کے تحت قبائلی سردار کھڑے کرے گی اور امریکی ڈالروں کی مدد سے قبائلی علاقوں کو دوبارہ پاکستان کی آہنی گرفت میں لے لیا جائے گا، پاکستانی محکمہ پولیس اور عدالتی نظام یہاں کے تمام معاملات کی نگرانی کرے گا۔ تاہم یہ سارا منصوبہ ایک خواب ہی رہا۔ جنگجو عالمی فوج اور پاکستان آرمی کے ساتھ ہندوکش کے دروں میں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتے رہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ شکار پر پلٹنا، جھپٹنا اور جھپٹ کر پلٹنا تھا۔

پاکستان میں مہمند اور باجوڑ اور افغانستان میں کنڑ اور نورستان میں فوجی کارروائی کے دوران میں جنگجوؤں نے جی جان سے حملے کیے۔ اے بی سی نیوز کے مطابق طالبان نے نورستان میں کمدیش کے امریکی اڈے پر حملہ کر کے آٹھ امریکی اور آٹھ افغان فوجی مار دیے۔ طالبان نے ۹ امریکی، سو سے زیادہ افغان فوجی مارنے اور ۳۰ افغان فوجی گرفتار کرنے کا دعویٰ کیا۔ یہ ایک شدید ترین حملہ تھا جس کے بعد جنرل میک کرسٹل نے سرحدی چوکیوں سے ساری فوج ہٹانے کا حکم دے دیا۔ اس کے نتیجے میں افغان صوبے نورستان کا ایک بڑا حصہ القاعدۃ جنگجوؤں کے ہاتھ آیا۔ پھر جنگجوؤں نے ۲۰۰۹ میں عالمی میڈیا کو دعوت دی کہ متروک امریکی اڈوں پر طالبان کے قبضے کا نظارہ کریں۔

۲۰۰۲ سے ۲۰۱۰ تک قبائلی علاقوں کے مختلف حصوں میں مختلف آپریشن کیے گئے لیکن جنگجوؤں کا اثر ورسوخ کم نہ ہوا۔ مثلاً ۱۰-۲۰۰۹ کا عرصہ جنگجوؤں کے لیے مشکل ترین وقت خیال کیا جاتا ہے کیونکہ پاکستان آرمی نے ان کے خلاف جنوبی وزیرستان، اورکزئی، خیبر ایجنسی، مہمند اور باجوڑ میں بیک وقت محاذ کھول رکھے تھے۔ اس کے ساتھ سی آئی اے بھی

روزانہ ڈرون حملے کر رہی تھی۔ جواب میں جنگجو تتر بتر ہو گئے اور ایک معیاری گوریلا حکمت عملی اپنائی۔ یہ جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان منتقل ہو گئے اور فوج کو خالی علاقوں پر قبضہ کرنے دیا۔ جب فوج نے زمینی صف بندی مکمل کر لی تو جنگجو شوال کے پہاڑی دروں سے بنجر پہاڑوں کا سفر طے کرتے ہوئے جنوبی وزیرستان میں جنگ کرنے اور فوجی اڈوں پر قبضہ کرنے پلٹ آئے۔ مہمند اور باجوڑ میں بھی اس سے ملتی جلتی چال چلی گئی۔ جوں ہی فوج نے زمین پر قدم رکھا، جنگجو نورستان اور چترال کے پہاڑوں سے ہوتے ہوئے آئے اور فوجی ٹھکانوں کو تباہ کر دیا۔ آنے والے مہینوں میں یہ کھیل یہاں تو نہ دہرایا گیا لیکن جنوبی ایشیا سے وسط ایشیا کی ریاستوں تک خراسان کی اسلامی امارت کی سرحدیں وضع کرنے والی ریاستوں میں پھیلا دیا گیا۔ یہ طلسمی خطہ دوبارہ القاعدۃ کی مدد کرنے پر تیار تھا۔

اس خطے نے طالبان بغاوت کو پہلے جنوب مغربی افغانستان سے شمالی افغانستان کے علاقوں بغلان اور قندوز تک، پھر وسط ایشیا میں ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، کرغزستان اور چیچنیا اور چینی صوبے سنکیانگ تک پھیلایا اور پامیر کے ذریعے امارتِ اسلامیہ خراسان کے احیا کے لیے خوابیدہ اسلام پسند تحریکوں کو بیدار کیا۔ یہ تحریک تاجکستان کے صوبے بدخشاں سے افغانستان کے صوبے بدخشاں تک پھیل گئی۔ دونوں بدخشاں آلے وادی کے ساتھ ساتھ تیان شان پہاڑی سلسلے کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔ جنوب میں یہ علاقہ واخان کے ساتھ ساتھ افغانستان اور پاکستان کے ہندوکش سلسلے سے جڑتا ہے۔ مشرق میں یہ سلسلہ چینی سرحد کنلون پہاڑوں میں کنگور تاغ تک پھیل جاتا ہے۔ یہ وہ قدرتی راستے ہیں جو القاعدۃ کے جنوب ایشیائی میدانِ جنگ کو مستقبل کے وسط ایشیائی میدانِ جنگ سے جوڑتے ہیں۔ ہندوکش اور پامیر کا یہ پہاڑی سلسلہ ہزاروں سال پرانا ہے لیکن یہاں پر القاعدۃ کی الف لیلوی کہانیاں گیارہ ستمبر کے بعد شروع ہوئیں۔ القاعدۃ نے اس خطے کی ساخت بدلنے کے لیے اپنے خون میں ڈوب کر

کئی برس طویل جدوجہد کی۔ ماضی میں ان پہاڑوں اور چٹانوں نے قبائلی بغاوتوں کو دفاعی تحفظ فراہم کیا تھا لیکن القاعدۃ کے انقلاب نے اس خطے کی ہر چٹان اور پتھر کو ناقابل تسخیر قلعے میں بدل دیا۔

باب نمبر 8

میدانِ جنگ

میدانِ جنگ

علماء کے مطابق اسلامی سرزمین کا تحفظ اسلامی عقیدے میں اولین فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ۱۹۷۹ میں افغانستان پر روسی حملے نے مسلمانوں میں جو جہادی روح پھونکی اس کی مثال گذشتہ پانچ صدیوں تک نہیں ملتی۔ پوری دنیا کے علمائے کرام نے جہاد کی فرضیت کا اعلان کیا اور روسیوں کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان پر واجب قرار دیا۔ جس کے نتیجے میں پوری دنیا کے ہزاروں مسلمان نوجوان اپنے افغان بھائیوں کی مدد کرنے کے لیے افغانستان آ پہنچے۔ افغان جہاد میں حصہ لینے کا جذبہ فلسطین کی آزادی کے لیے لڑی جانے والی اسلامی جنگوں سے بھی زیادہ تھا، اگرچہ افغانستان نہ تو کوئی مقدس ملک تھا، نہ اسلام کا مرکز تھا اور نہ ہی کوئی امیر ملک تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ افغانستان دنیا کا غریب ترین اسلامی ملک تھا اور عالمی یا عالمِ اسلام کی سیاست میں اس کا کوئی کردار نہ تھا۔

۲۰۰۱ میں جب امریکا نے اعلان کیا کہ افغانستان پر حملہ کیا جائے گا تو مسلمان نوجوان نسل میں اس اسلامی سرزمین پر حملے کی مزاحمت کرنے کا جذبہ پختہ ہو گیا۔ گھر گھر سے جہاد کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جو نوجوان نسل اس جہاد میں شامل ہوئی اسے امریکا کے خلاف لڑنے کے لیے کسی فتوے یا رسمی قیادت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مستقبل میں افغانستان اسلامی اور جہادی سرگرمیوں کا مرکز ہو گا نہ کہ بغداد کے شہر اور صحرا، یمن کے پہاڑ یا صومالیہ کے جنگل۔ ۱۹۸۰ میں روس کے خلاف افغان مزاحمت کے لیے امریکی حمایت دراصل ویت نام میں امریکی شکست کی انتقامی کارروائی تھی۔ لیکن اس کے لیے سوویت یونین کے تمام دشمنوں بشمول عالمی اسلامی تحریکوں کو افغان جہاد کی حمایت کے لیے تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ امریکا اگر روسی سلطنت کے وسائل کھپانے کے لیے ایک جہادی مرکز کی بنیادیں قائم کر لینے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے وسط ایشیا میں داخل ہونے کا موقع مل جاتا۔ پھر

امریکا اس خطے کو اس طرح تبدیل کر سکتا تھا کہ اس کے سوویت حریف اور اس کے نظریات کا زوال لازمی ہو جاتا۔ امریکا نے اسی سوچ کے ساتھ روسیوں کا خون خشک کرنے اور انہیں یہاں سے پسپا کرنے کے لیے افغانستان میں جہادی آپریشن کی حمایت کی۔ تاہم اس حکمت عملی کو مکمل کرنے کے لیے امریکا کے پاس مالی وسائل نہیں تھے۔

اصل میں جس چیز نے پوری دنیا کے مسلمان جنگجوؤں کو متحرک کیا وہ آخرت میں ملنے والے انعامات تھے۔ انہوں نے روسیوں کے خلاف افغان جہاد منظم کیا لیکن اپنی سوچ کے تناظر میں۔ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے جو ہر مسلمان کو معلوم ہے:

"ہم (اہل بیت) ایک ایسے خاندان کے فرد ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا پر آخرت کی زندگی کے لیے چن لیا ہے اور میرے گھرانے کے افراد سخت تکلیفیں اٹھائیں گے اور میری وفات کے بعد انہیں ان کے گھروں سے زبردستی بے دخل کر دیا جائے گا۔ پھر مشرق سے سیاہ جھنڈے اٹھائے کچھ لوگ اٹھیں گے اور اپنے لیے کچھ چیزوں کا سوال کریں گے۔ لیکن انہیں انکار کر دیا جائے گا۔ پھر وہ جنگ کریں گے اور فتحیاب ہوں گے، پھر انہیں وہ چیزیں پیش کی جائیں گی جن کا انہوں نے پہلے سوال کیا تھا۔ لیکن وہ اسے لینے سے انکار کر دیں گے یہاں تک کہ میرے گھر کا ایک فرد اٹھے گا اور زمین کو اسی طرح عدل سے بھر دے گا جس طرح یہ ظلم و عدوان سے بھری ہو گی۔ تو جو کوئی بھی وہ وقت پائے ان کا ساتھ دے خواہ برف پر رینگتا ہوا آئے کیونکہ خلیفۃ اللہ المہدی ان لوگوں میں ہوں گے۔" (سنن ابن ماجہ جلد ۲، روایت ۴۰۸۲، تاریخ طبری الصواعق المحرکتہ، ابن حجر، باب ۱۱، جلد ۱، صفحہ ۱-۲۵۰)

نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ میں قدیم خراسان کے علاقے سے اسلامی لشکر کے ظہور کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں خراسان کو مشرق کہا جاتا ہے اور اس میں افغانستان، پاکستان، ایران اور وسط ایشیا کے حصے شامل ہیں۔ سیاہ جھنڈا اسلامی لشکر کا جھنڈا ہے اور سفید جھنڈا اسلامی ریاست کا پرچم ہے۔ سیاہ جھنڈا جنگ کی علامت بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث آپ ﷺ کی ایک دوسری حدیث مبارکہ کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے تو میدانِ جنگ کی متعین سرحدوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

نعیم بن حمادؒ باب الفتن میں روایت کرتے ہیں کہ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے ایک گروہ ہندوستان فتح کرے گا، اللہ تعالیٰ ان کے لیے ہندوستان کے دروازے کھول دیں گے یہاں تک کہ وہ اس کے بادشاہوں کو زنجیروں میں جکڑ لیں گے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ جب یہ لوگ واپس پلٹیں گے تو شام میں ابنِ مریم کو پائیں گے۔" (کنز الاعمال)

مقبوضہ مسلم اکثریتی علاقوں کے حوالے سے اسلامی سرزمین کے دفاع کے لیے مذہبی علماء نے بارہا فتوے دیے ہیں۔ یہ فتوے مقبوضہ کشمیر، اراکان، فلپائن اور تھائی لینڈ کے مسلم علاقوں اور فلسطین کے بارے میں ہیں۔ جب اس فتوے میں افغانستان بھی شامل کیا گیا تو مسلمان نوجوانوں کی کثیر تعداد نے اس ملک کا رخ کیا۔ پاکستان ان ہزاروں نوجوانوں کا مقامِ روانگی بن گیا۔ یہ نوجوان پاکستانی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آٹھ مہینے تعلیم حاصل کرتے اور چار مہینے افغان جہاد میں شامل ہوتے۔ پوری دنیا میں مسلم آزادی کی تحریکوں مثلاً کشمیر اور فلسطین کی تحریکیں جو ماضی کا نشان تصور کی جاتی تھیں، انہیں افغان جہاد میں امید کی نئی کرن نظر آئی۔ ان تحریکوں کے حامیوں اور ارکان نے اپنے آبائی وطن چھوڑے اور افغان جہاد کو

اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ افغانستان میں کئی برس تک انہوں نے عسکری تربیت حاصل کی اور جب واپس اپنے علاقوں میں گئے تو نئے جذبے، تناظر اور عقیدے سے اپنی تحریکوں کا دوبارہ آغاز کیا۔ اس کی دو بہترین مثالیں فلسطین کی حماس اور کشمیر کی حزب المجاہدین ہیں۔

افغانستان کی طرف یہ ہجرت نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ کی وجہ سے تھی جس میں زمانہ آخر کی جنگوں کا میدان جنگ خراسان کو قرار دیا گیا ہے۔ یہاں سے یہ جنگ ہمسایہ علاقے ہندوستان میں جائے گی جہاں سے اسلامی فوجیں متحد ہو کر بلادِ شام کی طرف جائیں گی اور فلسطین کی آزادی کے لیے آخری لڑائی لڑ کر خلافت کا احیا کریں گی۔ جب یہ عالمی جہادی فوج افغانستان اور پاکستان میں منظم ہو رہی تھی تو اس وقت آئی ایس آئی میں ایسے اسلام پسند تھے جو افغان جہاد کو براہِ راست رہنمائی دے رہے تھے اور ان کی سوچ عالمی جہادیوں کی سوچ سے مختلف نہیں تھی۔ جب انہوں نے افغانستان میں سرخ فوج کو شکست دینے کے لیے سوویت یونین کے وسط ایشیائی علاقوں میں فارورڈ سٹریٹجی شروع کی تو اس کا مرکزِ ثقل بھی یہی حدیثِ مبارکہ تھی۔ اس حکمتِ عملی میں یہ بھی شامل تھا کہ افغانستان میں مرکزی جنگ لڑی جائے گی اور پاکستان کے قبائلی علاقے پشت پناہی کے لیے استعمال ہوں گے۔ یہاں سے میدان جنگ وسط ایشیا، انڈیا اور بنگلہ دیش میں پھیلایا جانا تھا۔ آئی ایس آئی نے پورا میدان جنگ وضع کیا اور اس کے مطابق رضاکار گروپ تشکیل دیے۔

حرکت الجہاد الاسلامی پاکستانی فوج کی پیدا کردہ عسکری تنظیم تھی۔ حرکت الجہاد الاسلامی پاکستان کی پہلی جہادی تنظیم تھی جو ۱۹۸۴ میں قائم کی گئی۔ اس کا تعلق دیوبندی مکتبِ فکر سے تھا۔ اس تنظیم میں روسیوں کے خلاف لڑنے کے لیے نوجوان بھرتی کیے گئے۔ ملک کی پہلی اسلامی جماعت، جماعتِ اسلامی رضاکار بھرتی کرنے اور انہیں افغانستان بھیجنے میں پہلے ہی فعال تھی۔ دراصل روسیوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے افراد اکٹھے کرنا کوئی مسئلہ ہی

نہیں تھا کیونکہ افغانستان میں مقامی افغانوں کی مزاحمتی تحریکیں پہلے ہی اتنی طاقتور تھیں کہ انہیں کسی بیرونی نفری کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ حرکت الجہاد کی تشکیل کے پیچھے یہ محرک تھا کہ میدان جنگ کی سرحدیں وسیع کرکے اس میں وسط ایشیائی ریاستیں اور ہندوستان کو بھی شامل کیا جائے۔ یہ خالصتاً اتفاق تھا کہ گیارہ ستمبر سے پہلے افغانستان میں پاکستانی عسکری قیادت کا سٹریٹجک خطہ اور پھر پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کا پورا جہادی نیٹ ورک جسے انہوں نے حرکت الجہاد کے ذریعے کھڑا کیا تھا، آئی ایس آئی کے ہاتھوں سے پھسل کر القاعدۃ کی گود میں جا گرا۔ اس کے بعد سے القاعدۃ نے افغانستان اور پاکستانی جہادی نیٹ ورک کو اپنے تناظر اور عسکری نظریے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

حرکت الجہاد کے نیٹ ورک نے دیوبندی مدارس سے جنم لیا تھا۔ اس کے کمانڈر مختلف دیوبندی مدارس کے تعلیم یافتہ (طلباء و علماء) تھے۔ مدارس کو بھرتی مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ دیوبندی مکتبِ فکر ہمیشہ سے جنوبی ایشیا اور وسط ایشیا کا بااثر سیاسی، مذہبی اور صوفی مکتبِ فکر رہا ہے۔ اگرچہ دار العلوم دیوبند کی بنیاد مولانا قاسم نانوتوی نے ضلع سہارن پور میں ۱۸۷۹ میں رکھی تھی، درحقیقت یہ گہری مذہبی، صوفیانہ اور سیاسی روایت تھی جسے وسط ایشیا کے نقشبندی صوفیوں نے اختیار کیا اور جنوبی ایشیا کے مختلف مصلحین نے اسے پروان چڑھایا۔ ان میں مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۴-۱۶۲۴)، شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲) اور شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ اسماعیلؒ (۱۷۷۹-۱۸۳۱) شامل ہیں۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے مغل بادشاہ اکبر کے دین الٰہی کے خلاف خالص توحیدی اقدار کی تبلیغ کی اور مغل سلطنت کو دوبارہ اسلامی نظام کی طرف موڑ دیا۔ سنی راسخ العقیدہ مغل حکمران اورنگزیب عالمگیرؒ شیخ احمد سرہندیؒ کی تعلیمات کی پیداوار تھے۔ اسی طرح ہندو مرہٹوں کے عروج اور مغل سلطنت کے زوال کے وقت شاہ ولی اللہؒ افق پر نمودار ہوئے۔ شاہ ولی اللہؒ بھی شیخ احمد سرہندیؒ کی طرح

نقشبندی صوفی تھے۔ انہوں نے شیخ احمد سرہندیؒ کی تعلیمی و تبلیغی روایت کو اپنی تحریروں میں جاری رکھا اور ان معاشرتی ، سیاسی ، تعلیمی، معاشی اور روحانی کمزوریوں کی نشاندہی کی جو ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کا باعث بنیں۔ شاہ ولی اللہؒ کا اثر پورے ایشیا میں پھیلا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو مفصل خط لکھ کر عیش کی زندگی ترک کرنے اور مرہٹوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا تو ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور مرہٹوں کا خاتمہ کر دیا۔ شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کو ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیزؒ اور پوتے شاہ اسماعیلؒ نے آگے بڑھایا۔ شاہ اسماعیلؒ انیسویں صدی کے آغاز میں جنوبی ایشیا میں جہادی تحریک کے بانی تھے۔ شاہ ولی اللہ خاندان کے اثرات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ دارالعلوم دیوبند شاہ ولی اللہؒ اور آپ کے خاندان کی روایت کا متولی تھا۔ اس دارالعلوم کی وجہ سے پورے جنوبی ایشیا میں مدارس کا جال بچھ گیا۔ یہیں سے قادری، چشتی، سہروردی اور نقشبندی تصوف کے مختلف مشرب ظہور میں آئے۔ آخری اور اہم بات یہ کہ یہ مکتبِ فکر انیسویں صدی کے بعد سے تمام جہادی تحریکوں کا علمبردار رہا ہے۔ سید احمد بریلویؒ تحریک، فرائضی تحریک، ریشمی رومال تحریک اور انیسویں صدی کی طالبان تحریک اسی مکتبِ فکر کی سرپرستی میں اٹھیں۔

دارالعلوم دیوبند نے تربیت یافتہ اساتذہ کے ذریعے مذہبی تعلیم کی تحریک چلائی اور شمالی قفقاز اور وسط ایشیا سے بنگال اور میانمار تک اسلامی مدارس کا جال پھیلایا۔ جب بیسویں صدی میں سابقہ سوویت یونین نے قفقاز اور وسط ایشیا کے علاقوں پر قبضہ کیا تو اس پورے علاقے کا سیاسی نقشہ تبدیل ہو گیا۔ کچھ علاقوں پر کمیونسٹ چین نے قبضہ کر لیا۔ روس اور چین دونوں نے مذہبی تعلیم پر پابندی لگا دی۔ تاہم شمالی افغانستان، بدخشاں، بلخ، مزار شریف اور تخار کے مہاجر وسط ایشیائی مسلمانوں نے اپنی سابقہ مذہبی روایات کو برقرار رکھا۔ دیوبند مکتبِ فکر ایک تعلیمی مکتبِ فکر تھا جس کے زیر سایہ وسط ایشیا کے منتشر مذہبی اور صوفی گروہ متحد ہو

گئے۔ یہاں پر مسلمان علماء کی تربیت کی گئی اور انہیں ہندوستان سے واپس افغانستان روانہ کیا گیا جہاں جاکر انہوں نے چھوٹے بڑے مدرسے قائم کیے اور پرانی مذہبی روایات، تصوف اور سیاست کا احیاء کیا۔ برطانوی ہند کی تقسیم کے بعد دارالعلوم دیوبند کے بہت سے سرکردہ علماء پاکستان آ گئے اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، دارالعلوم کراچی اور جامعہ اشرفیہ لاہور جیسے مدارس قائم کیے۔ ۱۹۷۰ میں قائم ہونے والی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اسی مکتبِ فکر کے زیرِ اثر قائم ہوئی۔ یہ مدارس پورے خطے کے مسلمانوں کے لیے تعلیمی مراکز بن گئے۔ ازبک، تاجک اور ترکمان نژاد مسلمان جو سوویت یونین کی مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے بھاگ نکلے، چینی صوبے سنکیانگ کے مسلمان، برما اور بنگلہ دیش کے مسلمان بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں آ گئے۔

ان مسلمانوں نے اپنے بچے دیوبندی مدارس میں داخل کروائے جہاں پر رہائش، کھانا پینا، کپڑے اور تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ پاکستانی انٹیلی جنس کے اداروں نے اس نیٹ ورک کو وسط ایشیا اور بنگلہ دیش تک رسائی حاصل کرنے میں استعمال کرنے کے لیے حرکت الجہاد الاسلامی بنائی۔ پھر انہوں نے ان مدارس کو وسط ایشیائی ریاستوں اور قفقاز میں سوویت یونین کے خلاف جنگوں میں وسط ایشیائی افراد کی بھرتی کے مراکز کے طور پر استعمال کیا۔ سوویت یونین کی شکست کے بعد حرکت الجہاد نے بیک وقت پاکستانی، کشمیری اور بنگالی بھرتی کیے اور Bleed India آپریشن کے لیے انہیں افغانستان میں تربیت دی گئی۔ لیکن جلد ہی یہ نیٹ ورک اس قدر وسیع ہو گیا کہ پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کے قابو میں نہ رہا۔ اسی دوران وسط ایشیا کے طالبعلموں کے ایک گروپ کو پوری دنیا میں گوریلا کارروائیاں کرنے کے لیے تربیت دی جارہی تھی۔ ان طالبعلموں کو پہلے ان تنظیموں کے تربیتی کیمپوں میں بھیجا جاتا جو تاجک اور ازبک ہوتیں۔ پھر انہیں مزید تربیت کے لیے گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی اور برہان

الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود کی جماعت اسلامی کے کیمپوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ ان دونوں مجاہدین تنظیموں کے پاس شمالی افغانستان میں کمانڈروں کی کافی تعداد تھی جن کے پاس پاکستانی مدارس کے طلبا ایشیا میں روس کے خلاف عسکری تربیت حاصل کرتے۔ حزب اسلامی اور جماعت اسلامی دونوں نظریاتی طور پر مصری اخوان المسلمون سے قریب تھیں۔ انہوں نے نہ صرف سید قطب اور حسن البنا کی انقلابی تحریروں کا مطالعہ کیا تھا بلکہ عرب انقلابی جنگجوؤں کے اثر میں بھی تھیں کیونکہ بہت سے عرب مجاہدین نے ان دونوں تنظیموں میں شامل ہو کر ہی افغان جہاد میں حصہ لیا تھا۔

وسط ایشیائی مسلمان جنگجو پہلے پہل دیوبندی صوفی مذہبی اقدار کی طرف مائل تھے۔ بعد میں حزب اسلامی اور جماعت اسلامی کے تربیتی مراکز میں داخلے اور عرب جنگجوؤں کے ساتھ تعامل کی وجہ سے یہ لوگ اخوان کے ادب سے بھی واقف ہو گئے۔ دراصل یہی تعلقات وسط ایشیا میں القاعدۃ کی بنیاد کا باعث بنے۔

آئی ایس آئی کا پہلا ہدف اس وقت کے سوویت مسلم خطوں کی خفیہ نقشبندی تحریکوں کو قابو کرنا تھا۔ حزب اسلامی، جماعت اسلامی افغانستان اور حرکت الجہاد الاسلامی سے نکلنے والے یہ طالب علم وسط ایشیا میں پھیلا دیے گئے۔ ان کی دہری ذمہ داری صوفی مشارب اور ان عام مسلمانوں کی ذہنی تربیت کرنا تھی جو سوویت سیاسی نظام کے جبر کے باوجود بھی اسلام پر عامل تھے۔ افغان جہادی کیمپوں میں تربیت پانے والے یہ وسط ایشیائی نوجوان روپوش صوفیا کے ساتھ جڑ گئے اور انہیں سوویت نظام کے خلاف بغاوت اور اسلامی اقدار کی بحالی پر اکسانے لگے۔ اخوان ادب کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کے ہزاروں نسخے وسط ایشیا کی ریاستوں میں اسمگل کیے گئے۔ یہ کوششیں وسط ایشیا کے سیاسی منظر نامے میں ثمر آور ہوئیں اور ۱۹۹۰ میں تاجکستان میں اسلامی مزاحمت پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد میں یہ تحریک

ازبکستان اور وسط ایشیا کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئی۔ اسلامی مزاحمت پارٹی کی تشکیل سوویت یونین کے خلاف ایک پراکسی آپریشن تھا جسے سی آئی اے کی سرپرستی حاصل تھی اور سعودی اور پاکستانی خفیہ ایجنسیاں افغان مجاہدین اور پاکستانی جہادی تنظیمیں اس کا تسلسل قائم رکھے ہوئے تھیں۔ لیکن انقلابی اسلام کے بیج بوئے جانے کی وجہ سے معاملات بگڑتے گئے اور بالآخر یہ لوگ ان ایجنسیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا اور وسط ایشیا کی اسلامی جہادی تحریکوں کو مزید حوصلہ ملا۔ ازبک، تاجک، ترک اور چیچن جو افغان جہاد میں شریک تھے، ستمبر ۱۹۹۱ میں اپنے خطوں کی آزادی کے بعد اپنے گھروں کو پلٹ گئے۔ پھر وسط ایشیا میں جمہوریت کے فروغ کے لیے امریکی مہم شروع ہو گئی لیکن اسلامی جہادی تحریکوں نے جمہوریت کو رد کرتے ہوئے پورے وسط ایشیا میں اسلامی انقلاب کے فروغ کے لیے خفیہ اسلامی گروپ قائم کر لیے۔ یہ خفیہ اسلامی گروپ نظریاتی طور پر اخوان تعلیمات سے متاثر تھے اور ابتدائی طور پر حزب التحریر کے حامی تھے۔ حزب التحریر ایک غیر عسکری اسلامی انقلابی گروپ ہے جو مسلح جدوجہد کے برعکس کثیر نفری مظاہرے کے ذریعے خلافت کا احیا چاہتا ہے۔ لیکن بعد میں یہ گروپ حزب التحریر سے ٹوٹنے والے گروپ اکرامیہ سے مل گئے۔ اکرامیہ گروہ عسکریت کا حامی ہے۔ اسلامی نشاۃ ثانیہ پارٹی کے بھی کافی لوگ ان خفیہ اسلامی جہادی تحریکوں میں شامل ہوئے۔

۱۹۹۰ کے آغاز میں تاجکستان کی خانہ جنگی میں ان خفیہ گروپوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۹۲ میں حملوں کی شدت کی وجہ سے اسلامی نشاۃ ثانیہ پارٹی اور دوسرے خفیہ اسلامی گروپوں کے لوگ افغانستان بھاگ گئے۔ جماعت اسلامی افغانستان کے کمانڈر احمد شاہ مسعود نے ان اسلامی گروپوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور از سرِ نو تنظیم کر کے انہیں متحدہ تاجک حزب کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ حزب اسلامی افغانستان کے سربراہ گلبدین حکمت یار کی بھتیجی

کے شوہر ہمایوں جریر نے شمالی افغانستان سے وسط ایشیائی ریاستوں میں رضاکار بھیجے جنھوں نے وہاں انتشار پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دوران وسط ایشیائی اسلامی جنگجوؤں کو مالی پشت پناہی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ افغانستان میں عرب کیمپوں کے سوا کوئی بھی شخص مدد دینے پر تیار نہ تھا۔ اسامہ بن لادن نے نظریاتی تعلق کو استعمال کیا اور اسے مضبوط بنانے کے لیے ازبک، چیچن، چینی اور تاجک جنگجوؤں کی مالی مدد کی۔ اس کے نتیجے میں یہ سارے گروپ شمالی افغانستان سے نکل کر کابل اور قندھار آ گئے اور پشتون طالبان کی حکومت کے ماتحت ہو گئے۔

افغانستان پر امریکی حملے کے بعد یہ وسط ایشیائی آبادی پاکستانی قبائلی علاقوں میں زیادہ تر شمالی اور جنوبی وزیرستان میں منتقل ہو گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکی حملے کے بعد ابتدائی لڑائی کے سوا افغان جنگ میں چیچن، ازبک اور چینی جنگجوؤں کو استعمال نہیں کیا گیا۔ القاعدۃ نے ارادتاً ان جنگجوؤں کو محفوظ رکھا۔ القاعدۃ کا منصوبہ تھا کہ بعد میں انہیں فرغانہ وادی میں بھیجا جائے گا اور یہاں سے پورے خطے میں جنگ پھیلائی جائے گی۔ فرغانہ وادی کی سرحدیں تقریباً تمام وسط ایشیائی ریاستوں کے ساتھ لگتی ہیں۔

غزوۂ ہند

۱۹۸۰ کی دہائی میں جماعت اسلامی کے البدر کیمپ کی کمان بخت زمین خان نے سنبھال لی اور افغانستان میں روسیوں کے خلاف لڑنے کے لیے ہزاروں پاکستانی رضاکاروں کا ایک نیٹ ورک تیار کیا۔ ان کے مرکزی معسکر پاراچنار کے قریب افغانستان کے صوبہ پکتیا میں تھے۔ ابتدائی طور پر آئی ایس آئی نے البدر کیمپ کو کشمیری علیحدگی پسندوں کے طور پر تیار کیا اور سب سے بڑی مقامی کشمیری تنظیم حزب المجاہدین افغانستان کے البدر کیمپوں سے نکلی۔ تاہم آئی ایس آئی کے نظریہ سازوں نے محسوس کیا کہ غزوۂ ہند کے لیے کسی ایسے مضبوط ڈھانچے کی ضرورت ہے جو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا ہو۔ البدر کیمپوں کو جماعتِ اسلامی

چلا رہی تھی اور اس کے ارکان مڈل کلاس شہری پس منظر رکھتے تھے۔ ان کی تربیت سیکولر تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی۔ ان کے اندر جہاد کا جذبہ موجود تھا لیکن یہ کوئی دوامی جذبہ نہیں تھا۔ شہری پس منظر ان کے وجود کا حصہ تھا اور اس وجہ سے ان کا جذبۂ جہاد زیادہ سے زیادہ پانچ سال زندہ رہتا۔

آئی ایس آئی کے غزوۂ ہند کے لیے نہ صرف کشمیر بلکہ پورے بھارت اور ہمسایہ ممالک نیپال اور بنگلہ دیش میں نیٹ ورک بنانے کی ضرورت تھی۔ یہاں پر ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو سادہ دیہاتی پس منظر رکھنے والے ہوں اور وہ "ترقی" کی طرف مائل نہ ہوں۔ چنانچہ وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک پھیلے ہوئے دیوبندی مدارس کے حرکت المجاہدین نیٹ ورک کو غزوۂ ہند آپریشن کے لیے موزوں خیال کیا گیا۔ پاکستانی آئی ایس آئی نے تقریباً ایک ہی وقت میں وسط ایشیائی علاقوں اور مقبوضہ کشمیر میں محاذ کھولے اور بہت سی نو تنظیم شدہ کشمیری اسلامی جہادی جماعتوں بشمول حرکت الجہاد الاسلامی اور حزب المجاہدین نے ہندوستانی سکیورٹی فورسز کا مقابلہ کیا۔ حرکت الجہاد الاسلامی نے انڈیا میں بھی وہی حکمت عملی اپنائی جو وہ پہلے وسط ایشیا میں اپنا چکی تھی۔ انڈیا میں نیٹ ورک پھیلانا نسبتاً کہیں زیادہ آسان تھا۔ ابتدائی طور پر قادری صوفی مشرب کو آئی ایس آئی کی سرگرمیوں کے کور کے طور پر استعمال کیا گیا۔ پاکستان کے ایک سرکردہ صوفی مبارک علی شاہ گیلانی نے اس محاذ پر آئی ایس آئی سے تعاون کیا اور جلد ہی صوفیوں کی مدد سے انڈیا، خاص طور پر حیدر آباد دکن میں، آئی ایس آئی کا خفیہ نیٹ ورک قائم ہو گیا۔ جب کشمیری جنگجو اپنی وارداتیں پھیلا رہے تھے تو انڈیا میں خفیہ نیٹ ورکوں کو خاموش رہنے کی ہدایت کی گئی۔ اس نیٹ ورک کو صرف بھرتی کے شعبے میں اپنی سرگرمی دکھانا تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں غزوۂ ہند پروجیکٹ اترپردیش تک پہنچ گیا جہاں پر سیکولر سکولوں میں زیرِ تعلیم نوجوان نسل اس کا خاص ہدف تھی۔

۱۹۹۰ تک علی گڑھ یونیورسٹی خفیہ اسلامی جنگجوؤں کی سازشوں کی آماجگاہ بن چکی تھی، لیکن انڈیا میں اصل جہادی سرگرمیوں کا آغاز کرنے کا ابھی کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اس دوران حرکت الجہاد الاسلامی نے دیوبندی مدارس کے ذریعے بنگلہ دیش میں اپنے پاؤں جما لیے۔ تاہم ملک کے سماجی اور سیاسی نظام سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جب انڈیا میں غزوۂ ہند آپریشن شروع ہو تو بنگلہ دیش سے اسلامی جنگجوؤں کی مسلسل رسد ملتی رہے۔ مناسب وقت کا تانا بانا کشمیر میں علیحدگی پسند تحریکوں کے عروج سے جڑا تھا۔ جنرل ضیاالحق کی موت اور پیپلز پارٹی کی نئی حکومت کی تشکیل کے ساتھ ہی پاکستانی فوجی ہیڈ کوارٹروں سے اسلام پسند جرنیلوں مثلاً جنرل حمید گل کا دور ختم ہو گیا اور غزوۂ ہند جیسے آپریشن خالص جہادی نظریے کے بجائے Bleed India جیسے خالص پراکسی آپریشن میں بدل گئے۔ حرکت الجہاد الاسلامی ابھی تک پسندیدہ نیٹ ورک تھا لیکن ۱۹۹۰ کے آخر میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے اچانک غزوہ ہند آپریشن روک دیا۔ اس کی بجائے افغانستان سے بنگلہ دیش تک پھیلے ہوئے وسیع تر پاکستان کا خواب دیکھا گیا۔ ۱۹۹۰ کے آخر میں عسکری قیادت کا وسط ایشیائی منصوبہ اختتام پذیر ہو گیا۔

یہی وہ وقت تھا جب جہادی عناصر نے کسی اور طرف دیکھنا شروع کر دیا، اگرچہ وہ اب بھی پاکستانی فوجی قیادت سے تعاون کر رہے تھے۔ پاکستانی فوج کے تیار کردہ جہادیوں کے لیے افغانستان میں راسخ العقیدہ طالبان کی حکومت ایک اخلاقی عمل انگیز تھا۔ لیکن یہ جہادی نئی جنم لینے والی صورتحال پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ گیارہ ستمبر کے حملے نے دنیا کے ساتھ ساتھ جہادی زمین بھی تبدیل کر دی۔

فصل تیار ہے لیکن۔۔۔

۱۹۸۰ میں روس کے خلاف پاکستانی آئی ایس آئی کی اقدامی حکمت عملی علاقائی سطح پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے بالکل تیار تھی کہ گیارہ ستمبر کا وقوعہ ہو گیا۔ لیکن اس وقت تک کئی ایسے دوسرے واقعات جنم لے چکے تھے کہ اس تیار فصل کا فائدہ القاعدۃ ہی کو ہوا۔ اس سے قبل فرغانہ وادی کے ازبک، تاجک اور ترکش، چینی اور چیچن جہادیوں کے ساتھ طالبان حکومت کے ساتھ مل چکے تھے۔ ان وسط ایشیائی اور شمالی قفقازی باشندوں کو اپنے اپنے وطنوں میں علمِ بغاوت بلند کرنے کے لیے دولت، ہتھیار اور تربیت کی اشد ضرورت تھی۔ طالبان نے انہیں محفوظ ٹھکانے دیے لیکن ان کے پاس تو اپنی تحریک کو جاری رکھنے کے لیے بھی سرمایہ نہیں تھا وہ غیر علاقائی بغاوتوں کو سرمایہ کہاں سے دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درجنوں چیچن، ازبک اور چینی افغانستان چھوڑ کر ترکی میں جابسے۔ ترکی نے انہیں سرمایہ اور رہائش فراہم کی اور ان کی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کی مگر یہ سب کچھ ترک انٹیلی جنس کی کڑی نگرانی میں عطا ہوا۔ یہ صورتحال جمانمنگانی، طاہر یلدوشف اور حسن معصوم جیسے کمانڈروں کے لیے ناقابل قبول تھی۔ آہستہ آہستہ ان کمانڈروں کی اپنے لوگوں پر گرفت ڈھیلی پڑتی گئی لیکن ان کے پاس سرمائے کی فراہمی کا کوئی متبادل ذریعہ بھی نہیں تھا۔ القاعدۃ نے اس کا فائدہ اٹھایا اور ان گروپوں سے قریبی تعلقات قائم کر لیے۔ القاعدۃ نے انہیں سرمایہ اور تربیت فراہم کی۔ اگرچہ ان گروپوں کے القاعدۃ کے ساتھ تنظیمی الحاقات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا لیکن ان گروپوں پر القاعدۃ کی نظریاتی چھاپ اور مالی معاونت کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اس وقت پاکستانی آئی ایس آئی کی پرورش کردہ جہادی تنظیمیں انڈیا کے لیے بڑا خطرہ بن گئیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ سے ۲۰۰۰ کے درمیان میں تقریباً 6 لاکھ پاکستانی اور کشمیری جہادیوں نے مختلف معسکروں میں تربیت حاصل کی اور گیارہ ستمبر کے

وقت ایک لاکھ جہادی مقبوضہ کشمیر میں فعال تھے۔ ان عسکریت پسندوں نے نہ صرف ہندوستان کی ۸ لاکھ فوج کو مصیبت میں ڈال رکھا تھا بلکہ ۱۹۹۹ میں کارگل جیسی فوجی مہم کے لیے پاکستانی فوج کو بھی شیر کر دیا تھا۔ جنگجوؤں نے ہندوستانی طیارہ اغوا کیا، اسے قندھار لے گئے اور پھر مسافروں کے تبادلے میں ہندوستانی جیلوں میں قید اپنے ساتھی رہا کروا لیے۔ ان جہادیوں نے دسمبر ۲۰۰۰ میں لال قلعے پر حملہ کیا اور دسمبر ۲۰۰۱ میں ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملے کی منصوبہ بندی بھی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ بنگلہ دیش میں ہندوستان کے حامی عناصر کے خاتمے کے لیے حرکت الجہاد الاسلامی بھی قدم جماتے ہوئے آئی ایس آئی کے لیے راستہ صاف کر رہی تھی۔ حرکت الجہاد الاسلامی نے ۲۰۰۰ میں حسینہ واجد اور اس کے حامیوں کے خلاف کئی قاتلانہ حملے کیے۔ اس سے ہندوستان پر اتنا دباؤ پڑا کہ ۲۰۰۱ میں پاکستان سے اتحاد کی حامی جماعت انتخابات جیت گئی۔

۲۰۰۱ تک پاکستان وسط ایشیا تا بنگلہ دیش ایک اہم سٹریٹجک ملک بن چکا تھا۔ اب پاکستان انڈیا اور ایران کے ساتھ امریکا سے بھی بہتر سودے بازی کرنے کی اہلیت رکھتا تھا کہ گیارہ ستمبر کا دن آ گیا۔ دنیا بدل گئی اور پاکستان کے سٹریٹجک اہداف بھی۔

القاعدۃ جنگ پھیلاتی ہے

گیارہ ستمبر کے بعد پاکستان کی افغان پالیسی میں یوٹرن آ گیا اور ۲۰۰۱ کے آخر میں افغانستان پر زمینی اور فضائی حملے کرنے کے لیے امریکا کو زمینی اور فضائی معاونت اور سہولیات فراہم کی گئیں۔ افغانستان میں طالبان کا تعاقب کیا گیا اور شدید امریکی دباؤ میں آ کر افغانستان میں تربیت پانے والی اور روسیوں کے خلاف لڑنے والی پاکستانی جہادی تنظیموں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تاہم صدر مشرف نے اہم جہادی رہنماؤں سے میل ملاقات جاری رکھی اور انہیں یقین دہانی کرائی کہ افغانستان میں امریکی قیام پانچ سال سے زیادہ نہیں ہو گا اس لیے آپ

لوگ تحمل سے کام لیں اور جہادی سرگرمیوں کو منجمند کرنے والی پاکستانی یوٹرن پالیسی کو برداشت کریں۔ تقریباً خفیہ معاہدہ ہی تھا کہ جیسے ہی امریکا افغانستان سے نکلے گا، پاکستان دوبارہ اپنی جہادی پالیسیاں شروع کر دے گا۔ لیکن گیارہ ستمبر کے واقعے کے منصوبہ ساز امریکی سرزمین پر حملے کے بعد ہونے والے ہولناک واقعات کا بہت اچھا شعوراور ادارک رکھتے تھے۔ وہ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ پاکستان کی عسکری قیادت اور جہادیوں کے درمیان اختلافات اس حد تک بڑھ جائیں گے کہ پاکستان کو امریکہ کی حمایت کرتے ہی بنے گی۔

افغانستان میں صف آرا ہزاروں جہادی بھی یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ اب انہیں قتل و غارت، قید و بند اور صعوبت و تشدد کا سامنا ہو گا اس لیے انہوں نے القاعدۃ میں شامل ہونے کے لیے پاکستانی قبائلی علاقوں کی راہ لی۔ یوں آئی ایس آئی کے سارے جہادی اثاثے (جو ۲۰ سال کی محنت کے بعد تیار ہوئے تھے) القاعدۃ کی گود میں آ گرے۔ اس کے ساتھ ہی القاعدۃ اپنا میدان جنگ وسط ایشیا تا بنگلہ دیش وسیع کرنے کے قابل ہو گئی۔

حرکت الجہاد الاسلامی: آئی ایس آئی سے القاعدۃ تک

۲۰۰۵ میں دوسری بار آئی ایس آئی کی حراست سے رہا ہونے کے بعد حرکت الجہاد کے کمانڈر محمد الیاس کشمیری اس بات کے قائل ہو گئے کہ امریکی دباؤ نے پاکستان کو مستقل طور پر معذور کر دیا ہے اور اب پاکستانی آرمی علاقے کی برتر فوجی قوت کے طور پر قبل از گیارہ ستمبر والا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اس لیے آپ نے کشمیر میں جدوجہد ترک کرتے ہوئے افغانستان میں لڑنے کا فیصلہ کیا۔

الیاس کشمیری افغانستان سے واقف تھے کیونکہ کشمیر جانے سے پہلے آپ نے ۱۹۸۰ کی دہائی میں یہیں سے تربیت حاصل کی تھی اور جنگ بھی لڑی تھی۔ اس دفعہ آپ نے اپنے اہل خانہ کو بھی ساتھ لیا اور شمالی وزیرستان ہجرت کر گئے۔ ان کا ابتدائی مقصد طالبان کے

ساتھ مل کر نیٹو فوج کے خلاف لڑنا تھا۔ تاہم جوں جوں آپ اپنا وقت عالمی جہادی نیٹ ورک کے ساتھ گزارتے گئے توں توں آپ کے نظریات تبدیل ہوتے گئے۔ اب آپ نے چیزوں کو کشمیر کی آزادی کے محدود عدسے سے دیکھنا ترک کر دیا۔ کشمیر کی آزادی کے لیے ہندوستان سے جنگ آپ کا غالب جذبہ تو تھا ہی لیکن اس میں اتنی وسعت آگئی کہ عالمی اسلامی جنگ کی سوچ بھی اس میں سمٹ آئی۔ آپ نے شمالی وزیرستان کے ایک چھوٹے سے قصبے رزمک میں رہائش اختیار کی اور وہاں پر اپنا تربیتی مرکز کھولا۔ کشمیری ایک کرشماتی کمانڈر تھے جنہوں نے پورے ہندوستان میں ہندوستانی فورسز کے خلاف کئی عجوبے دکھائے۔ جہادی حلقوں سے آپ کا خاص تعلق تھا۔ آپ کی بدولت سیکڑوں کشمیری جہادی کشمیر کا میدان چھوڑ کر افغانستان چلے گئے۔ ان جنگجوؤں نے کشمیر میں اپنی جدوجہد ترک کر دی اور افغانستان میں نیٹو کے خلاف لڑنے کے لیے پوری تیاری سے شمالی وزیرستان پہنچ گئے۔

۲۰۰۶ کے وسط تک الیاس کشمیری معسکر ہر شخص کو متاثر کر چکے تھے۔ آپ کے معسکر میں پاکستانی فوج کے ریٹائرڈ افسر تھے، لشکر طیبہ جیسی جہادی تنظیم کے سابقہ کمانڈر تھے اور خونخوار لڑاکوں پر مشتمل اپنی ذاتی ۳۱۳ بریگیڈ تھی جس کی تربیت آئی ایس آئی کے انڈیا سیل کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ مصطفی ابویزید، ابو ولید انصاری اور شیخ عیسیٰ جیسے اہم القاعدۃ رہنما الیاس کشمیری کے قریب ہوئے اور ان کی سوچ، نظریات اور لائحہ عمل پر اثر انداز ہوئے۔ القاعدۃ رہنما اس سے قبل بہت سے جہادی کمانڈروں مثلاً فضل الرحمان خلیل، مسعود اظہر اور عبد اللہ شاہ مظہر سے مل چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ پاکستانی جہادی کمانڈر آئی ایس آئی کے تعمیر کردہ فولادی حصار سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان کے جائزے اور تجزیے کے مطابق پاکستانی جہادی کمانڈر ان نظریاتی بندشوں سے پرے سوچ بھی نہیں سکتے جو آئی ایس آئی نے ان کے ذہنوں پر نقش کر دی ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مقامی قبائلی کمانڈر قبائلی

اور روایتی فکری رویے میں محصور تھے۔ یہ کمانڈر افغان یا پشتون سرحدوں سے پرے سوچنے کے قابل نہیں تھے۔ مگر کشمیری کی بات ہی کچھ اور تھی۔ آپ وجدانی اختراعی ذہن کے مالک تھے۔ آپ نے کشمیر میں انڈیا کے خلاف پاکستان آرمی سے ربط و تعامل میں نظم و ضبط کی پابندی قائم رکھی اور اس تناظر میں سختی سے پاکستانی پالیسیوں پر کاربند رہے۔ تاہم آئندہ سٹریٹجک اہداف حاصل کرنے کے لیے پاکستان آرمی کی قابل قدر مدد کرنے کے ساتھ آپ نے اپنے ذاتی عملی طریقہ کار بھی وضع کر لیے تھے۔

کشمیری دراصل ایک مفکر تھے۔ آپ بوکھلایا ہوا ردعمل نہیں دکھاتے تھے۔ آپ کے تمام فیصلے گہری فکر کا حاصل ہوتے تھے۔ رزمک میں القاعدۃ سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں تو آپ کا تصور مزید نکھر گیا اور القاعدۃ نے دیکھ لیا کہ وہ اور کشمیری ایک ہی نظریے کے حامل ہیں۔ اس سے پہلے کوئی عجمی القاعدۃ کے اس قدر قریب نہیں آیا تھا۔ مہینوں کی بات ہے کہ ان کے خیالات نے القاعدۃ کو اتنا متاثر کیا کہ القاعدۃ نے بلا جھجک انہیں اپنے اندرونی حلقوں میں شامل کر لیا۔ ۲۰۰۷ تک آپ القاعدۃ شوریٰ کے رکن بن چکے تھے۔ ۲۰۰۷ کے اواخر میں کشمیری نے ایک جامع جنگی منصوبہ پیش کیا جس نے القاعدۃ کو بھی حیران کر دیا۔ اس منصوبے میں وقتِ آخر کی موعود لڑائیوں کے ممکنہ میدانِ کارزار کا خاکہ پیش کیا گیا تھا، جو القاعدۃ کے بہترین عسکری دماغوں کا بھی تخیل تھا لیکن ابھی تک وہ اس کا عملی طریقہ نہیں سوچ پائے تھے۔ کشمیری نے اس موضوع پر اپنا پورا مقالہ پیش کیا۔ جنوبی ایشیا میں طالبان اور القاعدۃ کے خلاف نیٹو پاکستان آرمی اور انڈین فورسز میں اتحاد یقینی تھا۔ کشمیری کا عسکری منصوبہ ان متحدہ قوتوں کی پیش قدمی روکنے سے متعلق تھا۔ بھارت اس منصوبے کا مرکزی جزو تھا۔ کشمیری نے بھارت میں جہادی نیٹ ورک کی تشکیل اور القاعدۃ کے نظریات و عسکریات سے اس کی ہم آہنگی کو اپنا مقصود بنایا۔ آئی ایس آئی کا وضع کردہ نیٹ ورک اب بھی

بھارت میں موجود تھا لیکن افغان جنگ میں حمایت اور شدید امریکی دباؤ کے باعث اس کی اہمیت گھٹ گئی تھی۔ کشمیری اس نیٹ ورک کو ہندوستانی نیوکلیائی اسلحے کی تباہی جیسے معاملات کی طرف لانا چاہتے تھے۔ کشمیری کا قیاس تھا کہ اس سے انڈیا اور پاکستان میں اس حد تک معاملات خراب ہو جائیں گے دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جائے گی۔ اس لائحہ عمل سے کشمیری نے تین معقول نتائج اخذ کیے:

ا۔ جنگجوؤں کے خلاف انڈیا، نیٹو اور پاکستان کا اتحاد ختم ہو جائے گا۔

۲۔ پاکستان اور انڈیا میں تنازع پیدا ہونے کی وجہ سے پاکستان قبائلی علاقوں سے فوج نکال کر مشرقی سرحد پر تعینات کر دے گا اور جنگجو نیٹو کے خلاف لڑنے کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔

۳۔ جنگ کی صورت میں انڈیا بحری راستوں کی ناکہ بندی کرے گا جس سے خشکی میں گھرے افغانستان تک نیٹو سپلائی کی ترسیل میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

کشمیری ہندوستان میں بھی اسی طرح کا مستقل میدان جنگ بنانا چاہتے تھے جس طرح ۱۹۹۰ میں پاکستان نے کشمیر میں بنا رکھا تھا۔ آپ دہشت ناک منصوبوں کے تسلسل سے انڈیا کو غیر مستحکم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ پھر آپ نے کچھ مہینے انڈیا میں موجود آئی ایس آئی کے نیٹ ورک کو مضبوط کرنے پر صرف کیے اور اس مشن کی تکمیل کے لیے دہری حکمت عملی اپنائی۔ ہندوستان اور بنگلہ دیش میں پرانی حرکت الجہاد الاسلامی کے لوگوں سے کشمیری کے رابطے تھے۔ یہ رابطے اپنی جگہ قائم تو تھے لیکن ان کی مضبوطی اور ان میں توسیع کے لیے القاعدۃ کی مدد اور وسائل کی ضرورت تھی۔ ماضی میں حرکت الجہاد جنوبی ہندوستان میں سرگرم رہی تھی۔ کشمیری نے پاکستان کے جہادی نیٹ ورک سے اپنے رابطوں کے ذریعے اس کے اندرونی خفیہ حلقے تک رسائی حاصل کی۔ ان تعلقات میں سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (سیمی) سے رابطہ زیادہ مفید رہا۔ ماضی میں یہ گروپ ہندوستان میں جماعت اسلامی

کی طلبہ تنظیم تھی لیکن اب اس کے تعلقات اپنی سرپرست جماعت سے ختم ہو گئے تھے۔ یہ گروپ اسامہ بن لادن کو حقیقی مجاہد تصور کرتا تھا۔ حالات و واقعات کی ان تبدیلیوں سے کشمیری باخبر تھے اس لیے انہوں نے اپنے تعلقات کے استعمال میں تیزی دکھائی اور اتر پردیش اور دہلی تک رسائی حاصل کر لی۔ ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ کو ہونے والے ممبئی حملے کشمیری منصوبے کا نتیجہ تھے۔ کشمیری نے یہ منصوبہ ریٹائرڈ پاکستانی فوجی افسروں پر مشتمل ٹیم کے سپرد کیا جنہوں نے بڑی ہوشیاری سے آئی ایس آئی کے فارورڈ سیکشن اور لشکر طیبہ کو استعمال کیا۔ انڈیا اور پاکستان کی محاذ آرائی کے حوالے سے یہ منصوبہ ہر طرح سے مکمل تھا لیکن واشنگٹن کو ہوش آیا اور امریکا کی بروقت مداخلت کی وجہ سے دونوں ملکوں میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

جنگ چھیڑنے کے لیے جب ممبئی منصوبہ ناکام ہو گیا تو اسی طرح کا ایک اور شدید حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جس میں بیک وقت نیشنل ڈیفنس کالج دہلی اور انڈیا کے ایٹمی اثاثوں کو ہدف بنایا جانا تھا۔ لیکن شکاگو میں ڈیوڈ ہیڈلے (پاکستانی شہری داؤد سید) اور پاکستان میں کشمیری کے انڈین سیل کی گرفتاریوں کی وجہ سے یہ جنگ ایک بار پھر ٹل گئی۔ غزوۂ ہند، جس کے لیے کشمیری نے پورے ہندوستان میں زمین تیار کی تھی، ابھی تک التوا میں تھا۔ چونکہ جنگ سے پہلے طبلِ جنگ بجایا جاتا ہے اس لیے کشمیری نے پہلی بار مجھے ای میل کی اور جنگ کا اعلان کیا۔ اس ای میل میں انڈیا اور پاکستان کے وزرائے خارجہ کی گفتگو دستاویزی شکل میں دی گئی تھی۔ کشمیری نے کہا:

> "ہم چاہتے ہیں کہ عالمی برادری کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کے حصول اور انڈیا کو کشمیر، خاص طور پر بانڈی پور میں بربریت، خواتین سے زیادتی اور مسلمان قیدیوں سے غیر انسانی سلوک روا رکھنے سے روکنے میں اپنا

کردار ادا کرے۔ ہم عالمی برادری کو خبردار کرتے ہیں کہ ہاکی کے عالمی کپ ۲۰۱۰ اور آئی پی ایل اور کامن ویلتھ گیمز میں شرکت کے لیے اپنے لوگ مت بھیجیں۔ نہ ہی ان کے لوگ انڈیا میں آئیں، اگر ایسا ہوا تو نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔ ہم ۳۱۳ بریگیڈ کے مجاہدین، پورے ہندوستان میں حملے جاری رکھنے کا عہد کرتے ہیں۔ جب تک کہ انڈین فورسز کشمیر چھوڑ نہیں دیتیں اور کشمیریوں کو ان کا حقِ خود ارادیت نہیں مل جاتا۔ ہم برصغیر کے مسلمانوں کو یقین دہانی کراتے ہیں کہ ہم گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام اور بابری مسجد کی شہادت کبھی نہیں بھولیں گے۔ پوری مسلم امت جسدِ واحد کی طرح ہے اور ہم ساری زیادتیوں اور غنڈہ گردیوں کا انتقام لے کر رہیں گے۔ ہم ایک بار پھر ہندوستانی سرکار کو خبردار کرتے ہیں کہ ساری ناانصافیوں کا ازالہ کرے یا ہماری اگلی ضرب کا انتظار کرے۔"

(منجانب: ۳۱۳ بریگیڈ، ایشیا ٹائمز آن لائن ۱۳ فروری ۲۰۱۰)

کشمیری نے کبھی بھی میڈیا سے تعامل نہیں کیا تھا۔ انہوں نے پہلی دفعہ ۹، اکتوبر ۲۰۰۹ میں مجھ سے رابطہ کیا اور انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ سی آئی اے کے ڈرون حملے میں مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں اور ان کی موت کی رپورٹیں غلط ہیں۔ ۱۳ فروری ۲۰۱۰ کی ای میل میڈیا سے ان کا پہلا رابطہ تھا۔ یہ ای میل اس وقت کی گئی جب کشمیری نے غزوۂ ہند پروجیکٹ کو حتمی شکل دے لی تھی۔

کشمیری کے جنگی منصوبے کا اگلا مرحلہ ایشیائی ریاستوں میں بغاوت کو ہوا دینا تھا۔ یہ ریاستیں افغانستان رسد کے لیے نیٹو کا متبادل راستہ تھیں جہاں سے تقریباً ۱۵ فیصد رسد شمالی افغانستان پہنچتی تھی۔ یہ نسبتاً آسان کام تھا۔ سارے وسط ایشیائی پیدائشی لڑاکا ہوتے ہیں؛

پاکستانی قبائلیوں اور پشتونوں سے بھی زیادہ جنگجو۔ لیکن ان (وسط ایشیائیوں) کی معلومات کم تھیں اور وہ جدید گوریلا جنگ کے طریقوں سے ناواقف تھے۔ گوریلا جنگوں کا بنیادی سبق دشمن کے عزائم اور ارادوں سے خبردار رہنا ہے۔ کشمیری پہلے شخص تھے جنہوں نے وسط ایشیائی اور چیچن جنگجوؤں کو سکیورٹی وردیوں اور دوسرے طریقوں سے دشمن کی صفوں میں گھسنے کے طریقے بتائے۔ ماسکو اور داغستان میں ہونے والے چیچن گوریلوں کے حملے کشمیری ہی کی تربیت کا ثمرہ تھے۔ کشمیری نے چیچن، ازبک، ایغور، تاجک اور ترک جنگجوؤں کی ضروری تربیت کا ذمہ لیا۔ تربیت کے پہلے حصے میں انہیں نقل و حرکت کے طریقے، ردعمل اور جدید عسکری نظریات پڑھائے گئے۔ دوسرے حصے میں انہیں جدید گوریلا جنگ کی تربیت دی گئی۔ یہ وہی حربے تھے جنہیں کشمیری پہلے کشمیر اور افغانستان میں برت چکے تھے۔

دشمن کا ذہن پڑھنے اور دشمن کی کمزوریوں کی طرف اپنے گوریلوں کی رہنمائی کرنے کے فن میں کشمیری ایک مانے ہوئے ماہر تھے۔ تاہم آپ ہمیشہ پہلے دہشت ناک چالوں کا آزمائشی تجربہ کرتے تاکہ سکیورٹی فورسز کی جوابی نقل و حرکت کے طریقوں اور جوابی دورانیے کا اندازہ ہو جائے۔ پھر اس طرز پر لڑنے کا اصل منصوبہ بناتے۔ مکمل تربیت دینے کے بعد کشمیری نے اپنے چیچن اور ازبک ساتھیوں کو براستہ ترکی وطن واپس چلے جانے کی ہدایت کی۔

کشمیری کے عسکری منصوبے میں بھی مرکزی میدان جنگ افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقے تھے جبکہ وسط ایشیا اور ہندوستانی باغی اپنے اپنے تناظر میں میدان گرمائے ہوئے تھے۔ کشمیری کا خیال تھا کہ اگر ان علاقوں میں بغاوتوں نے اپنا آہنگ بنا لیا تو ہندوکش کے درے وسط ایشیا تک جانے کے لیے قدرتی راہیں فراہم کریں گے؛ بحیرہ عرب سے دراندازی اور پاکستان اور بنگلہ دیش کی زمینی سرحدوں پر کارروائیاں میدان جنگ کو انڈیا تک وسعت

دینے میں مدد دیں گی۔ ایمن الظواہری الیاس کشمیری کے منصوبے کی تفصیلات سن کر حیران اور پرجوش ہو گئے۔ القاعدۃ نے زمانہ آخر کی لڑائی کے لیے درجنوں دفعہ جنگی منصوبے بنائے تھے لیکن اس چیستاں کی کَڑیاں جوڑنے میں ناکام رہی تھی۔ نظریاتی منہج کی منصوبہ بندی کشمیری کو سونپی گئی اور اس ذمہ داری کو بہ آسانی سر انجام دینے کے لیے کشمیری کے پاس ہندوستان میں وسائل فراہم تھے۔ چنانچہ القاعدۃ نے کشمیری کو عسکری کمیٹی کا سربراہ بنا دیا تا کہ پہلے آپ غزوۂ ہند پراجیکٹ کو حتمی شکل دیں اور پھر وسط ایشیائی بغاوتوں میں ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے پر کام کریں۔

۲۰۱۰ میں پونے بم دھماکہ القاعدۃ کی ۳۱۳ بریگیڈ نے کیا تھا۔ الظواہری ایک ویڈیو تقریر میں پونے بم دھماکے کی ذمہ داری قبول کرنے کا اعلان کرنے والے تھے لیکن عین موقع پر فیصلہ ہوا کہ چونکہ پونے دھماکے سے کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں ہوا اس لیے القاعدۃ کو خاموش رہنا چاہیے۔ لہٰذا دمِ تحریر ایک نامعلوم تنظیم لشکر طیبہ العالمی نے ذمہ داری قبول کی۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ آئندہ ہونے والے تمام حملوں کی ذمہ داری القاعدۃ قبول کرے گی تا کہ مقبوضہ کشمیر، پاکستان اور افغانستان میں ہونے والے حملوں کی طرز پر ہندوستان میں جہادی گروپوں کو فعال کیا جائے۔ تیس سال قبل وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک میدان جنگ بنانے کا یہ منصوبہ آئی ایس آئی نے افغانستان میں روس کو شکست دینے اور کشمیر میں حقِ خود ارادیت حاصل کرنے کے لیے حرکت الجہاد الاسلامی، جماعت اسلامی، اخوان المسلمون، اسلامی مدارس اور صوفی گروہوں کی مدد سے بنایا تھا۔ تیس سال بعد القاعدۃ نے اسی منصوبے کو از سرِ نو نظریاتی سرحدوں کے اندر ترتیب دیا تا کہ سیاہ جھنڈے تھامے جب اس کی فوجیں مغرب کے خلاف حتمی جنگ کے لیے مشرق وسطیٰ میں داخل ہوں تو خراسان اور غزوۂ ہند کے میدانِ جنگ پہلے سے ہی سج چکے ہوں۔

خاتمہ

۲۷ اکتوبر ۲۰۰۹ کو امریکن فیڈرل اداروں نے ڈیوڈ ہیڈلے (حقیقی نام داؤد سید) اور تہور رانا پر فرد جرم عائد کی کہ وہ دونوں کوپن ہیگن کے ایک اخبار کے ملازمین پر حملے کی سازش کر رہے تھے۔ ہیڈلے پر الزام تھا کہ اس نے Jyllands-Posten اخبار کے دفاتر اور نواحی کنیساؤں پر دہشت گردوں کے حملے کے لیے معلومات فراہم کرنے کے لیے ڈنمارک سفر کیا تھا۔ ۸ دسمبر ۲۰۰۹ کو ایف بی آئی نے مزید الزام دھرا کہ ہیڈلے ممبئی کے بم دھماکوں میں بھی ملوث تھا اور لشکر طیبہ کو مدد فراہم کرنے اور امریکی شہریوں کے قتل میں معاون مجرم تھا۔ ہیڈلے نے ۱۸ مارچ ۲۰۱۰ کو تمام الزامات قبول کر لیے۔ ہیڈلے اب قید میں ہے اور اسے تین ملین امریکی ڈالر جرمانہ کیا گیا ہے۔ ہیڈلے اور رانا کی گرفتاری سے ۲۰۰۸ کے ممبئی حملوں کی کہانی پیچیدہ ہو گئی۔ امریکی انٹیلی جنس کا خیال ہے کہ یہ کارروائی لشکر طیبہ نے القاعدۃ کی مدد سے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہیڈلے لشکر طیبہ میں القاعدۃ کا نقب زن تھا جس کے ذریعے القاعدۃ نے آئی ایس آئی کا منصوبہ چرایا اور اپنا علاقائی ایجنڈا وسیع کیا۔ تاہم جیسے جیسے ہیڈلے کے بیان شائع ہوئے، کہانی پیچیدہ تر ہوتی گئی۔ ہیڈلے نے اپنے تفتیشیوں کو بتایا کہ آئی ایس آئی نے ممبئی آپریشن کرنے کے لیے پچیس لاکھ روپے اور تمام لاجسٹک مدد فراہم کی تھی جبکہ واحد زندہ بچنے والا حملہ آور اجمل قصاب پہلے ہی اعتراف کر چکا تھا کہ اسے آئی ایس آئی نے تیار کیا ہے۔

میں نے ۲ دسمبر ۲۰۰۸ کو یہ تمام حقائق ایشیا ٹائمز آن لائن میں رپورٹ کیے تھے کہ کس طرح القاعدۃ نے کشمیری تحریکِ آزادی کو ابھارنے کے لیے لشکر طیبہ اور آئی ایس آئی کا منصوبہ اغوا کر لیا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ حملے کے پیچھے آئی ایس آئی کا فارورڈ سیکشن تھا لیکن انہوں نے تو صرف معمولی سا آپریشن کرنا تھا جو انڈیا اور پاکستان ایک دوسرے کے

خلاف کرتے رہتے ہیں۔ لیکن القاعدۃ نے اپنے نیٹ ورک کے ذریعے اسے دہشت گردی کی ایک ایسی عالمی کارروائی میں تبدیل کر دیا جس سے انڈیا اور پاکستان جنگ کے دہانے پر آ کھڑے ہوئے۔ یہ القاعدۃ کا مخصوص طرز کا آپریشن تھا، اس طرح کے آپریشن افغانستان، عراق اور پاکستان میں دیکھنے میں آئے، لیکن لوگ اس کے پس پردہ محرکات سمجھنے میں غلطی کر گئے۔ ڈیوڈ ہیڈلے اور تہور رانا دونوں کے کشمیری، میجر ہارون اور میجر عبد الرحمان کو انڈیا حملوں کے ذمہ دار ٹھہرانے کے باوجود انڈین قیادت اور امریکی انسدادِ دہشت گردی کے ادارے پاکستان آرمی اور لشکر طیبہ کو ہی مشکوک قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے تو یہاں تک بھی سوچا کہ کہیں انڈیا کے خلاف مشترکہ کارروائی کرنے کے لیے القاعدۃ اور پاکستان آرمی میں گٹھ جوڑ تو نہیں ہو گیا۔

۲۰۱۰ میں جب میں ماضی کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے پورا یقین ہو جاتا ہے کہ گیارہ ستمبر کی اختراع کرنے والے نے عربی کلاسیک الف لیلۃ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہو گا۔ اس نے بھی گیارہ ستمبر کے بعد ایک جامع جدلیاتی عمل، امریکی حملے اور القاعدۃ کی تباہی کے بارے میں تصور کیا ہو گا۔ گیارہ ستمبر کے بعد القاعدۃ کے کارکنوں نے بڑے پیمانے پر قبائلی علاقوں میں ہجرت کی۔ یہاں سے واقعات کا ایک نیا تسلسل شروع ہوا، جس کا آغاز گیارہ ستمبر سے ہوا تھا، جس نے ایسی لازوال کہانیوں کو جنم دیا جو وسط ایشیا سے انڈیا اور بنگلہ دیش تک چلتی ہیں؛ بالکل اسی طرح جیسے کوئی الف لیلۃ کی ورق گردانی کر رہا ہو۔

القاعدۃ کی الف لیلہ داستانوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی ہر کہانی گیارہ ستمبر کے بعد جنوب ایشیائی میدان جنگ میں نئے کرداروں کی ایک کھیپ متعارف کرواتی ہے۔ یہ اس وقت پیش کی گئی جب مغرب کے خلاف القاعدۃ کی جنگ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی ہی تھی۔ جب ۲۰۰۲ میں امریکا مکمل طور پر اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ القاعدۃ ختم ہو گئی ہے،

تو اس وقت جنگجوؤں کی ایک نئی نسل جنم لے رہی تھی۔ یہ نسل القاعدۃ کے ایجنڈے کی زبردست حامی تھی۔ القاعدۃ نے اپنا مقصد گیارہ ستمبر کے حملے کے ذریعے حاصل کیا۔ یہ مغرب اور مغرب نواز مسلمان حکمرانوں کے خلاف مسلمانوں کی ایک زبردست جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ امریکی برتری کی علامتوں، نیویارک کے جڑواں ٹاوروں اور واشنگٹن میں پینٹاگان پر حملہ کر کے القاعدۃ نے امریکی کاؤبوائے ذہنیت کو چیلنج کیا اور غرور و تکبر کے نشے میں غراتے ہوئے امریکا کو افغانستان کی دلدل میں لا پھنسانے میں کامیاب رہی۔ افغانستان میں امریکی داخلہ مفت تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ القاعدۃ کو پہلے ہی تباہ کر چکا ہے اور اپنے اس دعوے میں وہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ درجنوں سر کردہ طالبان پاکستان فرار ہو گئے تھے۔ اس کی درمیانے درجے کی قیادت گرفتار یا شہید ہو چکی تھی۔ طالبان کے عام سپاہی افغان معاشرے کے تانے بانے میں رچ بس گئے تھے۔ ۲۰۰۲ تک پوری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ امریکا نے فتح کا اعلان کر دیا اور بون کانفرنس کے ذریعے افغانستان میں جمہوری اداروں کی بحالی تک نیٹو اور امریکی موجودگی کی ضرورت تسلیم کر لی گئی۔

امریکا کے لیے یہ افغانستان میں کھیل کا اختتام تھا لیکن القاعدۃ کے لیے تو کہانی ابھی شروع ہوئی تھی۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے افغانستان میں طویل قیام کا مطلب تھا کہ وہ افغانستان میں پھنس چکے ہیں اور القاعدۃ اپنے بچھائے جال کے ذریعے ان کی موت کا پورا پورا بندوبست کر چکی ہے۔ اگلے مرحلے کی کارروائیاں ایمن الظواہری نے ترتیب دیں۔ اس میں القاعدۃ میں نئی بھرتیاں، نئی حکمت عملی اور پاکستان میں نئے اڈے بنانا شامل تھا۔ الظواہری کوئی عام شخص نہیں تھے۔ آپ اسلامی جہاد کے آخری امیر تھے۔ آپ نے انور سادات کی حکومت کے خلاف بغاوت شروع کرنے کے لیے مصری شہریوں اور فوجی افسروں کی بھرتی کا طویل سلسلہ اختیار کیا۔ مصری حکومت کو خبر ہو گئی اور کامیاب آپریشن میں

درجنوں لوگ دھر لیے گئے۔ لیکن الظواہری نے اس تنظیم کے مختلف گروپوں کو مختلف متبادل منصوبے دیے تھے کہ اسلامی جہاد ہر طوفان کا سامنا کر سکے۔ اس طرح ایک طرف تو مصری حکومت نے بڑی کامیابی سے بغاوت کا راستہ روکنے کے لیے تنظیم کی ناکہ بندی کی لیکن دوسری طرف یہ تنظیم مصری فوجی افسر خالد اسلامبولی کے ہاتھوں انور سادات کو قتل کروانے میں کامیاب رہی۔

ہوشیار الظواہری نے افغانستان پر امریکی حملے اور القاعدۃ پر اس کے اثرات کی حقیقی تصویر کا خاکہ بنایا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ گیارہ ستمبر کے بعد ایمن الظواہری نے اسی جنگی چال کو اپنایا جو وہ مصر میں اپنا چکے تھے۔ القاعدۃ پاکستان کی مسلح افواج میں شامل ہوئی اور الگ الگ کمانڈ پر مشتمل مختلف گروپ بنائے گئے کہ اگر ایک گروپ سکیورٹی فورسز کی نظروں میں آجائے تو فوری طور پر دوسرا گروپ فعال ہو جائے۔ افغانستان سے پاکستان میں آنے کے بعد القاعدۃ نے طے شدہ متبادلات کے اس سلسلے کو شامل ہونے والے قبائلیوں کے ذریعے جاری رکھا۔ تاہم الظواہری افغانستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے سینکڑوں القاعدۃ ارکان کا اس کے سوا کوئی براہِ راست کردار نہیں دیکھتے تھے کہ یہ لوگ القاعدۃ نظریات اور وژن والی ایک نئی نسل تیار کریں۔ یہ اس لائحہ عمل کا جوہر تھا جس سے مغرب کے خلاف بے ہنگم مزاحمت ایک منظم اور معروف عالمی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ اور یہی القاعدۃ کا رَجز ہے۔

اہم بات یہ تھی کہ القاعدۃ یہ جنگ کیسے لڑے گی۔ اگر القاعدۃ باقاعدۃ فوج کی طرح مرتکز نظمِ امارت کا طریقہ اپناتی اور معیاری روایتی اسلحہ استعمال کرتی تو ۲۰۰۲ کے وسط میں ہی جنگ ہار جاتی؛ افغانستان پر امریکی حملے کے بعد پیش آنے والے حالات میں اس بات کا ثبوت مل گیا تھا جب القاعدۃ تنہا ہوگئی تھی۔ اس وقت امریکا کو یقین ہو گیا تھا کہ القاعدۃ کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ تاہم اس تنظیم کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی تھی اور بانیانِ تنظیم کے

عزمِ صمیم سے اس کی عمارت بھی مضبوط تھی۔ الظواہری جیسے القاعدۃ رہنماؤں نے مصر میں کئی سال تک مصری اخوان المسلمون کے ساتھ کام کیا تھا اور کئی خفیہ تنظیموں کی تشکیل میں اس کی معاونت کی تھی۔ اس طرح کے لوگ ریاست کے ساتھ کشمکش کے جدلیاتی عمل کی نوعیت اور اس کے نتائج سے خوب واقف تھے۔ الظواہری جانتے تھے کہ نامساعد حالات میں کس طرح کام کیا جائے اور نئی جنگ لڑنے کے لیے وسائل کس طرح سے اکٹھے کیے جائیں۔ القاعدۃ نے اپنی حکمت عملی اس انداز سے ترتیب دی کہ ۲۰۰۱ میں افغانستان پر امریکی حملے کے وقت اس کی جماعت، کردار اور قیادت پس منظر میں چلے گئے اور القاعدۃ نظریات رکھنے والے لوگوں کی ایک نئی جماعت سامنے آگئی۔ یہ سلسلہ ۲۰۰۳ تک چلا لیکن اس کے علاوہ بھی کئی عسکری جہات تھیں۔

الظواہری جیسے تجربہ کار القاعدۃ رہنما دشمن کی جہتِ فکر کا اندازہ لگانے اور کثیر الجہتی تدبیر شکن تدبیریں کرنے کے قابل تھے۔ امریکا کے خلاف جنگ میں واپسی کے لیے القاعدۃ نے رہنماؤں اور پیروکاروں کی صفیں ترتیب دیں؛ پہلے دشمن کی ذہنیت کا اندازہ لگایا، پھر دشمن کے وسائل کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور تیسرے درجے پر دشمن کے وسائل کھپانے کے لیے جنوب ایشیائی خطے میں جنگ پھیلائی۔ ان سارے عوامل کا مقصد امریکی طاقت کو ایک آسان شکار بنانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے القاعدۃ تین شاخوں میں منقسم ہوئی:

۱۔ اسامہ بن لادن علامتی اور کرشماتی روحانی شخصیت تھے، دنیا بھر سے انہیں مالی امداد پہنچتی اور نوجوان مسلمان امریکہ کے خلاف جنگ کے لیے امڈے چلے آتے۔

۲۔ الظواہری نے القاعدۃ نظریات متعین کرکے تمام جہادی گروپوں کو ایک نظریاتی چھتری تلے جمع کر دیا۔ بطور مرکزی ماہر حربیات آپ نے جنگی خدوخال متعین کیے۔

۳۔ اس کے علاوہ کئی آپریشنل چیف بنائے گئے جنہوں نے مسلم دنیا میں مغربی قبضے کے خلاف جنگی مشن پر القاعدۃ کی پیروی کی اور حالات و ضروریات کے مطابق عملی طریقے وضع کرتے رہے۔

عوامی سطح پر اسامہ بن لادن رہنما تھے لیکن اصل ہدایات الظواہری کی طرف سے ہوتی تھیں۔ الظواہری کے نظریات منتخب لوگوں کے ایک گروپ کے ذہنوں میں پختہ کر دیے گئے تھے۔ یہ لوگ جنوب ایشیائی میدانِ کارزار کی جنگی بھٹی سے نکلا ہوا کندن تھے۔ ان لوگوں کو کئی گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر گروپ کا ایک اپنا آپریشنل کمانڈر ہوتا تھا۔ اگر ایک مر جاتا یا گرفتار ہو جاتا تو اس کی جگہ لینے کے لیے دوسرا تیار ہوتا۔ نئے حالات میں القاعدۃ کے لیے حکمت عملی پر بحث و تمحیص کرنے کے لیے اور تازہ بہ تازہ احکامات جاری کرنے کے لیے وقت اور جگہ کافی نہیں تھے۔ ہر گروپ خود حالات و واقعات کی روشنی میں لائحہ عمل تیار کرتا اور القاعدۃ کی عالمی جنگ کے لائحہ عمل سے انحراف نہ کرتا۔ اس ہدف کے حصول کے لیے اختیار کیے گئے طریقہ کار کی کئی پرتیں تھیں۔ ان منصوبوں سے زندہ اور متحرک الف لیلہ دیکھنے کو ملی جس کی ایک کہانی کے کردار آتے ہیں اور پس منظر میں چلے جاتے ہیں لیکن کہانی چلتی رہتی ہے۔ اس طرح کثیر السطحی اور کثیر الدرجاتی حملہ روک تھوں اور پرتوں سے نقصان کی شرح بہت کم رہی اور کرداروں کی لمبی قطار اپنے نئے کردار ادا کرنے کے لیے چلتی رہی۔ دوسرے لفظوں میں جہاں ایک منصوبہ ناکام ہو جاتا تو دوسری ٹیم اسی منصوبے کو فوراً مکمل کرنے کے لیے متحرک ہو جاتی۔ یہ الف لیلوی ڈرامہ آج بھی اصلی سکرپٹ کے ساتھ جاری ہے خواہ یہ دشمن کے عمل کے خلاف القاعدۃ کا ردِ عمل ہو یا القاعدۃ کے عمل کے خلاف دشمن کا ردِ عمل ہو۔

جس شخص نے اسامہ بن لادن اور الظواہری کو گیارہ ستمبر کے حملوں کی راہ دکھائی وہ کویت میں پلنے والے امریکی تعلیم یافتہ بلوچی خالد شیخ محمد تھے۔ آپ کو راولپنڈی سے ۲۰۰۳ میں گرفتار کیا گیا۔ یہ خالد شیخ ہی تھے جنہوں نے ایک ایسی صورتحال کے بارے میں سوچا جس میں امریکا آسان فتح کے بارے میں پر یقین ہوتے ہوئے افغانستان میں طویل قیام کی منصوبہ بندی کرتا۔ خالد شیخ محمد کا خیال تھا کہ گیارہ ستمبر کا ایک ہی ہلہ امریکا کو افغان جال میں گھسیٹ لائے گا اور پھر بے آب و گیاہ افغان خطہ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر امریکی وسائل کو اس طرح کھا جائے گا کہ دوبارہ سر اٹھانے کی ہمت نہیں رہے گی۔ یہ مؤقف بھی پایا جاتا تھا کہ اگرچہ امریکا بڑی بے رحمی سے القاعدۃ کے انسانی وسائل کو تہہ تیغ کرے گا لیکن القاعدۃ اپنے نظریات اور روحانی قوت کے بل بوتے پر غربت زدہ مسلمانوں کی ایک نئی نسل تیار کر سکے گی جو پھر سے جنگ لڑنے کے لیے تیار ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی جنگ کے لیے القاعدۃ نے پاکستان اور افغانستان کے پسماندہ قبائلی علاقوں کا چناؤ کیا۔ مزید برآں، اس وقت پاکستان پر ایک اسلامی فوجی آمر حکمران تھا جو پہلے ہی ترقی پذیر ملکوں کی معاشرتی ترقی کے نمونے سے دور ہٹ رہا تھا۔

۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کی دہائی میں پاکستانی عسکری قیادت نے مقبوضہ کشمیر میں تحریک حریت کو بھڑکانے کے لیے پاکستان کے دیہی علاقوں میں جہادی طبقے کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی۔ یہی اثر وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک پھیلا اور عسکریت پسندوں کی ایک نئی نسل کھڑی کر دی۔ افغانستان میں طالبان حکومت نے ان میں ولولہ پیدا کیا اور پاکستان میں پھیلے مدارس نے ان کی تعداد میں نہایت سریع اضافہ کیا۔ القاعدۃ پر یقین تھی کہ کامیابی سے ان اثاثوں کو استعمال کرے گی اور میدانِ جنگ وسط ایشیا سے بنگلہ دیش تک پھیلانے میں اس نیٹ ورک کو اپنے ہاتھوں میں لے لے گی۔

یہی بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ ایک عقیدہ موجود تھا کہ امریکا القاعدۃ کو بار بار شکست دے سکتا ہے اور اس کی ایک پوری نسل تباہ کر سکتا ہے لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ایک دوسری نسل ظاہر ہو جائے گی اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ امریکی جنگی مشین کا ایندھن ختم ہو جائے گا۔ اس دوران القاعدۃ قوت حاصل کرتی جائے گی یہاں تک کہ آخری لڑائی کے لیے مہدی موعود علیہ السلام ظہور کریں گے۔ پھر اسلامی لشکر مل جائیں گے اور جنوبی ایشیا سے مشرق وسطیٰ کی طرف پیش قدمی کریں گے اور عالمی خلافت قائم کرنے کے لیے اسرائیل کو شکست خاص دیں گے۔ اس مخصوص تناظر سے القاعدۃ کو اپنی کارروائیوں کا دائرہ، اسلحہ اور وسائل پھیلانے میں بہت مدد ملی۔ یہ نظریہ تھا ایسی جنگ کے لیے جو اس خطے میں پہلے کبھی نہ لڑی گئی۔

اگلے چند سالوں میں جنگجوؤں کی ایک نئی نسل پیدا کی گئی جو اگرچہ مقامی تھی اور اس کی پہلی وفاداری طالبان کے ساتھ تھی، لیکن بہرحال القاعدۃ کے زیر کمان تھی۔ یہ ابنائے وطن طالبان کہلاتے ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ باقاعدۃ طور پر القاعدۃ کی تنظیم کا حصہ نہیں ہیں اس لیے میں انہیں نیو طالبان یا القاعدۃ کے حقیقی بھائی کہوں گا۔ روایتی افغان طالبان کے برعکس، جو زیادہ تر جنوب مغربی افغانستان اور جنوب مغربی پاکستان میں رہتے ہیں اور پشتون روایات پر عمل کرتے ہیں، یہ نئے طالبان فاٹا کے رہنے والے ہیں اور ریاستی اداروں کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔ یہ نئے طالبان اب جنوبی ایشیا کے کئی حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے مقامی قبائلی سرداروں کو قتل کر دیا یا مار کر بھگا دیا۔ انہوں نے کئی روایتی ملاؤں کو قتل کیا۔ یہ طالبان پاک افغان سرحد کے دونوں جانب رہتے ہیں، عالمی اتحاد اسلامی پر یقین رکھتے ہیں اور سختی سے انقلابی اسلام پر عمل پیرا ہیں۔ روایتی اور نیو طالبان دونوں ہی افغانستان میں نیٹو کے خلاف لڑتے ہیں۔ لیکن روایتی طالبان کی جنگ افغانستان سے شروع ہو کر وہیں ختم

ہو جاتی ہے جبکہ نیو طالبان کی جنگ وسطی اور جنوبی ایشیا سے شروع ہو کر عالمی خلافت کے قیام تک پھیلتی ہے۔ نیو طالبان افغانستان پر امریکی حملے، امریکی بمباری اور پاکستانی حکومت کے ریاستی جبر کے کٹھن حالات میں پیدا ہوئے اور جنوب مشرقی افغانستان سے کراچی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی تو تھے جنہوں نے افغانستان میں جنگ لڑنے کے لیے القاعدۃ کو پاکستانی قبائلی علاقوں میں اڈے قائم کرنے میں مدد دی۔ انہوں نے افغان طالبان کو افغانستان کے ۳۷ فیصد علاقے پر قبضہ کرنے کے قابل بنایا، جنگ کو پاکستان اور انڈیا میں پھیلانے میں مدد دی اور القاعدۃ کو یمن اور صومالیہ کے نئے محاذ کھولنے کے لیے فرصت دی۔

گیارہ ستمبر کے بعد کا کھیل مکمل طور پر القاعدۃ کے منصوبے کے مطابق چل رہا تھا۔ افغانستان میں خیالی فتح کے زعم میں مبتلا امریکا نے ۲۰۰۳ میں عراق پر حملہ کر دیا۔ تاہم عراق پر امریکی حملہ القاعدۃ کے لیے ایک بونس تھا۔ اس نے تو افغانستان کے ایک پھندے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن امریکا آپ ہی آپ دو مختلف پھندوں میں پھنس گیا۔ شیعہ مخالف گروپ کے سابق رہنما ابو مصعب الزرقاوی پہلے سے ہی عراق میں موجود تھے۔ الظواہری نے انہیں عراق میں القاعدۃ کا رکن بنایا اور فرقہ ورانہ فسادات کو اس حد تک بڑھانے کی ہدایت کی کہ عراقی میدان جنگ امریکا کا مقتل بن جائے۔ پھر تشدد کی جو لہر اٹھی تو عراق پر حکومت کرنا ناممکن ہو گیا۔ تاہم یہ صرف توجہ ہٹانے کا ایک طریقہ تھا۔ اصل جنگ اب بھی افغانستان میں لڑی جا رہی تھی کیونکہ عراقی مزاحمت پر القاعدۃ کی گرفت کمزور تھی۔ القاعدۃ نے عراقی مزاحمت کاروں کو امارت اسلامیہ عراق کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تجربہ ناکام رہا۔ وجہ یہ تھی کہ عراق میں دو درجن سے زائد مزاحمتی گروپ سرگرم تھے اور ان میں سے اکثریت اخوان المسلمون سے وابستہ تھی۔ ان گروپوں کو مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کی اخوان کونسل سے ہدایات ملتی تھیں۔ عراق میں اخوان کی شاخ حزب الاسلامی العراقی

پارلیمنٹ میں ہے اور عراقی نائب صدر سمیت کئی اہم عہدوں کی حامل ہے۔ یہ گروپ امریکا سے بات چیت کرتے ہیں۔ امریکا ان گروپوں سے ترکی میں بھی مذاکرات کرتا رہتا ہے۔ ان گروپوں کے ساتھ معاملات کرنا امریکا کے لیے چنداں مشکل نہیں لیکن القاعدۃ جنگجوؤں کو عراق میں برداشت نہیں کیا جاتا۔ مقامی عراقی مزاحمتی گروپ القاعدۃ سے شدید اختلاف رکھتے ہیں خاص طور پر القاعدۃ کی فرقہ واریت کے ذریعے بحران پیدا کرنے کی حکمت عملی سے۔ اس لیے القاعدۃ امریکا کو افغان دلدل میں پھنسانے پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔

عراقی مزاحمت کار عراق سے امریکی فوجوں کا انخلا اور عراق کی آزادی چاہتے ہیں ۔ اس اختلافی نقطۂ نظر کی وجہ سے القاعدۃ عراق میں تنہا رہی اور ۸-۲۰۰۷ میں افغانستان پلٹ آئی اور مزاحمت کی جنگ کو مقامی مزاحمت کاروں کے لیے چھوڑ دیا۔ پاکستان اور افغانستان میں القاعدۃ نے خاص قابلیت اور مہارت حاصل کی۔ اس کی نظر پاکستان کے قبائلی علاقوں پر رہی اور مختلف گروپوں کو اپنے ساتھ ملا کر تنظیم نو کا عمل جاری رہا۔ ۲۰۰۶ کے جنگی منصوبے کا مقصد طالبان کے روحانی وطن جنوب مشرقی افغانستان میں امریکی اور نیٹو فوجوں کی شکست دینا تھا۔ میں نومبر ۲۰۰۶ میں ہلمند گیا اور تمام اہم اضلاع کا دورہ کیا۔ یہاں پر طالبان کا مکمل کنٹرول تھا اور نیٹو فوجیں بمشکل کابل میں ہی نظر آتی تھیں۔ لشکر گاہ اور چند ایک دوسری جگہوں پر نیٹو کے برطانوی دستے اپنے قلعوں میں قید تھے۔ طالبان کی کامیاب واپسی نے امریکا کو اپنی سیاسی اور عسکری پالیسی بدلنے پر مجبور کر دیا۔ پھر واشنگٹن نے طالبان کے ساتھ مذاکرات اور القاعدۃ کے خاتمے کے لیے پاکستان کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس گٹھ جوڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰۰۷ میں القاعدۃ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد اور خیبر پختونخوا کی سوات وادی تک جا پہنچی۔ قبائلی علاقوں سے پاکستان کے شہری علاقوں تک جنگ کے پھیلاؤ کا مقصد پاکستان کی طالبان کے ساتھ امن کی کوششوں کو ناکام بنانا تھا۔ عراق میں القاعدۃ کو

اس قسم کی حکمت عملی کا موقع نہیں ملا۔ لہٰذا القاعدہ عراق کے عربی النسل ہونے کے باوجود مغرب کے خلاف جنگ افغانستان میں ہی لڑنے پر مجبور تھی۔ تاہم جنوبی ایشیا میں میدان جنگ تیار کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ القاعدۃ کے چند سو عربوں کو، جو مقامی رسم ورواج سے بالکل ناواقف تھے، اپنے انقلابی نظریات مقامی قبائلیوں میں منتقل کرنا تھے۔

اگرچہ مصطفی ابویزید اور ابو ولید انصاری جیسے اہم نظریاتی مفکر ڈرون حملوں میں شہید ہو چکے تھے لیکن الظواہری جیسے تجربہ کار مدبر اب بھی موجود تھے۔ ہر ایک رہنما طویل عرصے تک اخوان المسلمون سے وابستہ رہا تھا اور افغان جہاد میں کئی سالہ تجربہ رکھتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان علاقوں میں انہیں اپنا نیٹ ورک کس طرح بنانا ہے۔ انہوں نے مقامی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کی لیکن القاعدۃ کیمپوں میں تربیت پانے والے اور افغان جہاد میں ان سے تعامل کرنے والے نوجوانوں کی مسلسل اور مستقل ذہن سازی کرتے رہے۔ المیہ یہ رہا کہ مغرب نے القاعدۃ اور اس کی کشمکش کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انہوں نے القاعدۃ کے واقعات کو زیادہ تر الگ الگ شکل میں یا غلط تناظر سے دیکھا جیسا کہ ممبئی حملوں کے واقعات میں ہوا۔

افغانستان اور عراق میں جاری امریکی جنگ ٹیکس دہندگان کے کھربوں ڈالر ضائع کر رہی ہے اور لحہ بہ لحہ غیر مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر سال امریکی فکر گاہیں القاعدۃ کی نئی حکمت عملیاں دریافت کر رہی ہیں اور جس وقت تک امریکا ان کا توڑ نکالتا ہے، القاعدۃ مغربی اتحاد کے خلاف جنگ میں رخ بدل چکی ہوتی ہے۔ القاعدۃ کے خلاف جنگ شروع کرنے سے پہلے امریکی انٹیلی جنس اپنا ہوم ورک مکمل کر چکی تھی۔ اس نے کئی دہائیوں کی اسلامی مزاحمتی تحریکوں پر تحقیق کی اور الجیریا پر فرانسیسی فوجوں کے قبضے اور ۱۸۳۰ میں عبدالقادر کی مسلح تحریک کا بغور مطالعہ کیا۔ الجیریا مزاحمت نے فرانسیسی فوجوں کو مشکلات سے دوچار کیا، یہاں

تک کہ الجیریا کے ایک تہائی علاقے پر قبضہ کر لیا اور ملکی دارالحکومت کے دروازوں تک جا پہنچے۔ مصر میں برطانوی قبضے، قفقاز میں روسی قبضے اور ہندوستان میں برطانوی قبضے کا بھی تقریباً یہی حشر ہوا۔ ہر قبضے کے نتیجے میں انقلاب کے بنیادی تصور سے جنم لینے والی اصلاحی اور آزادی کی تحریکوں کی صورت میں خوفناک مزاحمت ہوئی۔ افغانستان پر اور پھر عراق پر امریکی حملہ انھیں گذشتہ اسلامی مزاحمتی تحریکوں کی تفہیم کے مطابق کیا گیا تھا۔ لہٰذا افغانستان میں طالبان اور عراق میں صدام حسین کی فوری شکست کے بعد اقتدار مقامی سیاستدانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ افغانستان میں ۶۰ تا ۱۰۰ فوجیوں پر مشتمل صوبائی بحالی ٹیمیں دکھاوے کے طور پر شہری علاقوں میں متعین کی گئیں لیکن مقامی منصوبوں کو پھر بھی محدود تحفظ ملا۔ اس کے برعکس عراق میں بغداد اور دوسرے جنگ زدہ علاقوں میں امریکی فوج نہ ہونے کے برابر اور زیادہ تر اپنے محفوظ کیمپوں میں ہی محصور رہی۔

امریکا نے مقامی آبادی کو یہ تاثر دینا چاہا کہ وہ غیر ملکی قابض فوجوں کے نہیں بلکہ اپنی آزاد مقتدر حکومت کے زیر سایہ ہیں۔ افغانستان میں ساڑھے تین سال اور عراق میں صرف ایک سال بعد ہی یہ امریکی چال ناکام ہوگئی اور ان دونوں ملکوں میں غیر ملکی قابضین کے خلاف مسلح مزاحمت شروع ہوگئی۔ امریکا، برطانیہ ، پاکستان، ترکی ، ایران، روس اور سعودی عرب اور ہندوستان سمیت عالمی برادری نے القاعدۃ کے خلاف جنگ کو ایک منفرد تنازع کے طور پر دیکھا جس میں تاریخ میں پہلی بار جنگجو گروپ قومی ریاستوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ یہ محض مختلف بین الاقوامی گروپو ں کا اتحاد نہیں ہے بلکہ درحقیقت مشرقِ وسطیٰ میں سوویت یونین کے خاف ۲۰ سال کی طویل خفیہ جدوجہد کے بعد جنگ کے گرم و سرد چشیدہ لوگوں کے گروپ کا نودریافت شدہ جدلیاتی عمل ہے۔ افغانستان بہت سے عالمی ڈراموں کا سٹیج ہے جن میں گیارہ ستمبر کا واقعہ بھی

شامل ہے۔ تاہم مرکزی ڈرامہ وہ جدلیاتی عمل ہی ہے جس کی بدولت القاعدۃ ایک عام بغاوتی تحریک سے ایک عالمی مزاحمتی تحریک بنی اور جس عمل کے ذریعے مسلمان آبادی میں مخالفانہ جذبات پیدا کر کے ریاستی مشینری کو انہدام کے دہانے پر لا کر مسلم اکثریتی ریاستوں کے وسائل اور اسلحے کو استعمال کرنے کا طریقہ وضع کیا گیا۔

۲۰۰۹ کے آغاز میں پاکستانی جنگجوؤں نے خیبر پختونخوا کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تھا۔ سول انتظامیہ کی ساری پولیس فورس شکست کھا گئی اور آرمی کے نوجوان بھی منحرف ہونے لگے۔ یہ وہ وقت تھا جب القاعدۃ کا خیال تھا کہ اگر پاکستان آرمی کے اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا جائے تو پاکستان اور افغانستان میں جنگ فیصلہ کن طور پر جنگجوؤں کے ہاتھ میں ہو گی۔ تاہم فوج کے نئے چیف اشفاق پرویز کیانی نے اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے جنگجوؤں کے خلاف پوری طاقت صرف کر کے انہیں منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔ بلاشبہ یہ ایک عارضی منصوبہ بندی تھی کیونکہ پاکستان، امریکا اور سعودی عرب القاعدۃ کو محض ایک معمولی فتنہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے سیاسی، معاشی یا عسکری طور پر جو بھی اقدامات کیے وہ اسی مخصوص تناظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے کیے اور انسدادِ دہشت گردی کی معمولی لڑائیاں لڑی گئیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ القاعدۃ کو صرف اس کی الف لیلوی داستانوں اور ان میں ابھرنے والے فنکاروں، گہرائی، نظریات، اساطیر اور حقیقتوں کے مطالعے سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

آج اسامہ بن لادن پس منظر میں ہے۔ ڈاکٹر ایمن الظواہری پوشیدہ ہیں۔ مصطفی ابویزید اور ابوولید جیسے بہت سے القاعدۃ رہنما ڈرون حملوں میں مارے جا چکے ہیں۔ خالد شیخ محمد اور ابوزبیدہ کئی دوسرے منصوبہ سازوں کے ساتھ حراست میں ہیں۔ لیکن القاعدۃ الف لیلہ کی رزمیہ داستانیں نئی حکمت عملیوں اور نئے کرداروں کے ساتھ جاری ہیں۔ القاعدۃ کے لیے تو یہ صرف مغرب کو در در بھٹکانے کی چالیں ہیں جس میں بالآخر وہ تھک ہار جائے گا اور

القاعدۃ افغانستان میں اپنی فتح کا اعلان کر دے گی۔ القاعدۃ کا اگلا منصوبہ خراسان کی متذکرہ سرزمین پر قبضہ کرنے کا ہے جس کی سرحدیں وسط ایشیا سے خیبر پختونخوا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر اس میدان جنگ کو بھارت تک پھیلایا جائے گا۔

پھر مہدی مسیح الموعود مشرق وسطیٰ میں ظہور کریں گے اور القاعدۃ اپنے لشکر کو خراسان سے نکالے گی اور فلسطین آزاد کرائے گی۔ یہاں ہونے والی آخری جنگ کے بعد عالمی اسلامی خلافت قائم ہو جائے گی۔

نوٹس

پیش لفظ

1۔ کمانڈر الیاس کشمیری حرکت الجہاد اسلامی کے کمانڈر تھے۔ بعد میں اپنی 313 بریگیڈ کے ساتھ القاعدہ میں شامل ہوئے اور القاعدہ کی مرکزی شوریٰ کے رکن بنے۔ بھارت اور پاکستان میں کئی حملے (بشمول ممبئی حملے) ان کی منصوبہ بندی سے ہوئے۔ اسامہ بن لادن کی طرف سے انہیں امریکی صدر براک اوبامہ کو ہدف بنانے کے خصوصی احکامات ملے۔ 3 جون 2011 کو جنوبی وزیرستان میں ایک ڈرون حملے میں جاں بحق ہوئے۔

2۔ سراج الدین حقانی افغانستان کے خطرناک ترین جہادی کمانڈر سمجھے جاتے ہیں ، آپ روس کے خلاف افغان جہاد کے معروف کمانڈر اور عالم جلال الدین حقانی کے بیٹے ہیں۔ اس وقت آپ طالبان کے امیر ملا اختر منصور کے نائب اور مشرقی صوبوں میں طالبان کے عسکری کمانڈر ہیں۔ آپ القاعدہ کی مرکزی شوریٰ کے بھی رکن ہیں۔

3۔ کمانڈر ضیاء الرحمٰن مشرقی صوبوں کنڑ اور نورستان کے مشہور طالبان اور القائدہ کے مشترکہ کمانڈر سمجھے جاتے ہیں۔

4۔ تورابورہ افغانستان کے مشرقی صوبے " ننگرہار" کا پہاڑی سلسلہ ہے، یہاں افغانستان پر امریکی حملے کے بعد اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری سمیت القاعدہ کی مرکزی قیادت کچھ عرصہ موجود رہی ، شدید لڑائی اور بمباری کے باوجود القاعدہ قیادت بچ نکلنے میں کامیاب ہوئی۔

دیباچہ

1۔ ڈیوڈ ہیڈلے جس کا حقیقی نام سید داؤد گیلانی ہے۔ یہ پاکستانی نژاد امریکی ہے جو شکاگو میں رہائش پذیر رہا۔ پاکستانی افواج کے ریٹائرڈ آفیسرز اور جہادی تنظیموں بشمول الیاس

کشمیری کے ساتھ مل کر ممبئی حملوں میں ملوث تھا۔اس نے اپنی اسلامی شناخت چھپانے کے لیے اپنا نام داؤد سید سے ڈیوڈ ہیڈلے میں تبدیل کر دیا تاکہ بھارت میں سفر کرنا آسان ہو سکے۔ حضرت محمد ﷺ کے گستاخانہ خاکے بنانے والے "ڈینش" اخبار جیلینڈز پوسٹ کے کوپن ہیگن میں موجود دفتر کو القاعدہ کمانڈر الیاس کشمیری کی ہدایات پر نشانہ بنانے کی تیاریوں کے دوران اکتوبر 2009 میں انہیں شکاگو میں "او ہیر" ائیر پورٹ پر گرفتار کیا گیا۔ ممبئی حملوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے 24 جنوری 2013 کو امریکی فیڈرل کورٹ نے اسے 35 سال کی قید کی سزا سنائی۔

2۔عبداللہ یوسف عزام فلسطین میں 1941 میں پیدا ہوئے۔ آپ اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں پروفیسر تھے۔ آپ ایک مشہور عالم اور جہادی مبلغ تھے جنہوں نے لاکھوں عربوں کو روس کے خلاف افغان جہاد کی طرف متوجہ کرنے کے لیے طویل دورے و تقاریر کیں اور درجنوں کتابیں اور رسالے بھی لکھے۔ آپ کی کوششوں سے ہزاروں عرب نوجوانوں نے افغان جہاد میں شرکت کی۔ آپ عرب جہادیوں کو سہولیات اور رہنمائی فراہم کرنے کے لیے "مکتب الخدمات" نامی ادارہ چلاتے تھے۔ آپ کو اسامہ بن لادن کا استاد اور فکری رہنما سمجھا جاتا ہے۔24 نومبر 1989 کو آپ کو اپنے بیٹوں سمیت پاکستانی شہر پشاور میں ایک بم دھماکے میں قتل کر دیا گیا۔ آپ قتل کا ذمہ دار بیرونی انٹیلی جینس ایجنسیوں سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین اسامہ بن لادن بنے۔

3۔شمالی اتحاد مشہور سابقہ جہادی کمانڈر "احمد شاہ مسعود" کی زیر سربراہی افغانستان کے مختلف جنگجو گروہوں کا طالبان مخالف عسکری گروہ تھا جسے بھارت کی سرپرستی حاصل تھی۔

4۔ افغانستان کے ہزارہ جات ریجن میں بامیان وادی میں موجود چھٹی صدی کے دو بدھا مجسمے جن کو 2001 میں طالبان (امارت اسلامیہ افغانستان) کے امیر ملا محمد عمر کے حکم پر گولہ بارود کی مدد سے اڑادیا گیا۔